

خواتین اور شہزادوں کیلئے ایکسپریس سٹی کا منفرد ماہنامہ

رداءِ دانش

AUGUST
2017

جشن آزادی ساگر نمبر

ماڈل: نساء جبین
سیکاپ ہر روزیٹی پارلر
ڈوٹو گرائی: ہسبوی رضا



چیف ایڈیٹر

صالحہ محمود

ایڈیٹرز

سکریٹری: محمّد جعفری، بلال جعفری

نائبہ امیر، فرار جعفری

E-Mail: frazjatri@aol.com

نائبہ UAE، عمیر علی جعفری

E-Mail: saqrulh@emirates.net.ae

نائبہ لندن، شکار آصف خانی

آرٹس: جنید انصار

رداء الجسٹ

خطوات کا پتہ

رداء الجسٹ

۱۶۶-۱۶۷-۱۶۸

۱۶۹-۱۷۰-۱۷۱-۱۷۲

۱۷۳-۱۷۴

سالگرہ نمبر



سلسلے وار ناول

افسانے

- ۷۲ میرے خواب میری خوشی شہلا گل سحر
۸۲ جویریہ بانو حور اکین
۹۳ تہینہ چوہدری بلا عنوان
۱۱۶ ایقان علی یا قادر
۱۲۲ ماریہ خان محبت یقین کامل
۱۳۲ مریم فاطمہ خالی ہاتھ
۱۶۲ عروج فاطمہ ۳۴ عشق سید ہے
۱۶۸ فضا الرحمن دلوں کے ملن
۱۷۶ سعدیہ عابد ایک تھا حظلہ
۱۸۱ مریم احمد ماں

- ۱۰ صحراؤں کی گلیوں میں قمروش
۱۸۶ زندگی، پھول، محبت، خوشبو شازیہ مصطفیٰ
۹۶ عشق کی داستاں جدا ریحانہ آفتاب
۱۴۲ ستارے ایقان علی

مکمل ناول

گلشن ہے معطر ہوائے نبیلہ نازش

ناولٹ

مکافات عمل تہینہ بانو ۵۸

اگست 2017ء

جلد نمبر 21 شمارہ نمبر 8

قیمت 60 روپے

www.facebook.com/rida.digest

زید گالانہ بڈ لیکچر رجسٹری

720 روپے



34535726

پبلشر وائیڈ ریٹر صالحہ محمود نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔
مقام اشاعت: ۱۲۹/ ڈی بلاک 2 - پی - ای - سی - ایچ - سوسائٹی، کراچی

انتباہ:-

ماہنامہ ”روداد“ ذرا بحث میں شائع ہونے والی تحریر کے حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل یا ڈرامہ، ڈرامائی تشکیل اور سلسلے وار کسی بھی ناول کی اشاعت پر ادارہ چوری کی ایف آئی آر درج کرا دے گا اس لئے پبلشر سے اجازت لینا ضروری ہے ادارہ ”روداد پبلیکیشن“۔

مستقل سلسلے

۲۲۲	ثریا اقبال	۷	پن	۲۰۱	صالحہ محمود	ردائے جنت
۲۲۵	شہلا مشاق	۲۰۱	سنگھار	۲۱۲	صدف سعد	ردا کی ڈائری
۲۰۳	نورین ملک	۲۰۸	اشعار	۲۰۵	شہلا مشاق	ذرا پھر سے کہنا
۲۱۶	صالحہ محمود	۲۰۸	سندیے	۲۰۵	نورین ملک	خوشبو
۲۱۹	ادارہ	۲۰۵	دوستوں کے نام پیغام		نورین ملک	اس ماہ میں





جشن بہاراں کی نوید ہو کہ اگست آن پہنچا۔ بادلوں نے بھی اپنے پر کھول دیئے یوں شہر شہر گلی گلی رسم جسم سادوں بھادوں کی رت ملک کے گوشے گوشے میں 14 اگست کی آمد کی گونج وہیں آہ و بکا فریاد بھی جاری ہے۔ گلی، شہر، سب اہل رہے ہیں، گندگی کے ڈھیر، غریبوں کی زندگی دو بھر ہو گئی، کوئی پرسان حال شہر نہیں، کوئی ہے کہ شہر حاکم کو خبر کرے مگر کہاں وہ تو نیرو کی طرح بیٹھے بانسری بجا رہے۔

حاکم وقت اپنے تخت دتاج کی تنگ دود میں بھاگ رہے ہیں۔ خلق خدا چیخ رہی ہے کہ میاں جی استغفی دو۔ میاں جی کہتے ہیں تو چل میں آیا۔

گلہری اور کوئے کی طرح تو چل میں آیا کہہ رہے ہیں۔ بارش سر پر کھڑی ہے۔ خلق خدا کی آہ و بکا کون سنے۔ لے پئے انسان سپریم کورٹ کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ خدا را در دکی دوا کرے کوئی، بھلا شریف زادوں کو کون پکڑ سکتا ہے۔ یہ گمان ہے میاں جی کو لیکن اللہ کی لامٹی بے آواز ہے۔ پھر کسی دن رعد کی طرح کڑکتی ہوئی بجلی کا ایک کوڑا جب گنجنے سر پر گرے گا پھر کوئی نہ فح کے گاہبہت ہو گئی کرسی چھوڑ دیتے۔

14 اگست یاد دلار ہی ہے قربانیوں کا دن۔ بھوک سے پیاسے نڈھال شیر خوار بچے سنت رسولؐ پر لبیک کہہ رہے تھے۔ گھریلٹ گئے لیکن مسلمانوں کے لیے ہجرت ضروری تھی سو ہو کر رہی۔ جانوں کی قربانیاں دیں گھریلٹا دیئے۔ بانیان پاکستان میں سے وزیر اعظم لیاقت علی خان کے تن پر پوند لگا کپڑا تھا۔ اور یہاں شریف زادے وطن کے حکمران بنے۔ ”منزل انہیں ملی جو شریک سفر تھے“

پہلے کر بانٹ لیا تھا آدھا پاکستان اب قرض کے انبار لگے۔ خلق خدا چیخ رہی ہے۔ اللہ سے ڈریے اور رحم کیجیے۔ قارئین! اور ہمارے رائٹرز لاہور میں ہونے والے سیمینار میں آپ یہ پیغام دیں کہ اس دور میں کتاب کی اہمیت قائم رہے۔ آن لائن پڑھ کر آپ کتاب کی اہمیت کو ختم کر رہے ہیں۔ کتابی شکل میں کوئی بھی لکشن ہو یا ادب وہ ہماری قوم کا ورثہ ہوتا ہے ورنہ آج کوئی قصہ چہار درویش نہ پڑھ سکتا۔

میں اپنے پڑھنے والوں چاہنے والوں اور رائٹرز سے اپیل کرتی ہوں کہ پاکستانی کلچر کو کتابی شکل میں قائم رکھیے، ریڈنگ کی عادت ڈالے، خود آپ کو اس میں زندہ رہنا ہے آپ تہذیب کا حصہ ہیں۔ میٹ پر آپ کی تہذیب محفوظ نہیں ہو سکتی۔ آج ہیں آپ وہاں مگر کل نہیں ہوں گی۔ یہ میرا بہت اہم پیغام ہے آپ کے لیے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم تجربے سے ایک سینئر مصنفہ کو دعوت دے رہے ہیں آپ بہت جلد انہیں پڑھ سکیں گے۔ کیا آپ جانتی ہیں کہ وہ ہیں؟ روا کی سب سے سینئر مصنفہ؟ سند یہ ضرور لکھیے یہ ہمنما کی کا ذریعہ ہے۔

آپی



اٹھا کر نہ لے جائے۔ (ابوداؤد)

(وضاحت: یہ حکم بھوک اور لا چاری کی صورت میں ہے ورنہ کسی مسلمان کے مال کو اس کی اجازت کے بغیر حاصل کرنا درست نہیں۔)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے غزوہ حنین کے دن چند زرہیں (جنگی لباس) عاریتاً (ادھار) حاصل کیں۔ میں نے پوچھا: ”اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ اپنے قبضے میں رکھنے کے لیے لے رہے ہیں؟“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: ”نہیں عاریتاً یہ قائل واپس ہوں گی۔“ (ترمذی ابوداؤد)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”عاریتاً لی ہوئی چیز کو واپس کیا جائے اور (دودھ کے لیے) حاصل کیا جانے والا (واپس کیا جائے اور قرض ادا کیا جائے اور سرپرست قرض ادا کرنے کا مدار ہے۔“ (ترمذی)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”مزدور کو اس کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کرو۔“ (ابن ماجہ)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: دو لعنتیوں سے بچتے رہو صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہؐ وہ دو لعنتی کون کون ہیں؟ فرمایا ایک وہ ہے جو لوگوں کی گزر گاہ میں رفع حاجت کرتا ہو دوسرا وہ جو لوگوں کی سایہ دار آرام گاہ میں غلاظت ڈالتا ہو۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ میں نے آنحضرتؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ایمان اور کفر و

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس آدمی نے ایسی بے آباد زمین کو آباد کیا جو کسی کی ملکیت نہ ہو وہ اسی کی ملکیت ہے۔ کسی کو دوسرے کی زمین میں کسی چیز کی کاشت کرنے کا حق نہیں ہے۔“ (ترمذی)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”شورو غل کرنا، گھوڑ دوڑ میں دوسرا گھوڑا ساتھ لے جانا، ادلا بدلا کی شادی کرنا اسلام میں جائز نہیں ہے۔ مال لوٹنے والا وہ ہم میں سے نہیں۔“ (ترمذی)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم میں سے کوئی آدمی اپنے بھائی کی لاشیٰ کو نہ لے۔ نہ مذاقا اور نہ حقیقت میں، پس جو آدمی اپنے بھائی کی لاشیٰ لیتا ہے اسے چاہیے کہ وہ اسے واپس کرے۔“ (ترمذی)

(وضاحت: کوئی معمولی شے بھی نہ مذاقا اور نہ سچ مچ لینی چاہیے اور کبھی غلطی سے بھی کوئی چیز لے لیں تو وہ چیز واپس کر دیں۔)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کسی ہاتھ نے جو مال ظلماً پکڑا اس کو اس نے واپس کرنا ہے (چاہے اسے دنیا میں دے دے چاہے آخرت میں)۔“ (ترمذی)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب تم میں سے کوئی آدمی جانوروں کے پاس جائے اگر ان کا مالک موجود ہو تو اس سے اجازت طلب کرے۔ اگر موجود نہ ہو تو 3 بار آواز دے اگر جواب آئے تو اس سے اجازت حاصل کرے اور اگر جواب نہ آئے تو جانوروں کا دودھ پی لے لیکن

کیا اگر میرے انکار کرنے پر وہ مجھے قتل کر ڈالے، فرمایا تب تو شیخ کا مرتبہ پائے گا۔ عرض کیا اگر میں اس کی بدعتی پر اسے قتل کر ڈالوں، فرمایا وہ دوزخ میں جائے گا۔

حضرت سلمانؓ فرماتے ہیں ان سے دریافت کیا گیا کہ آپ کے نبیؐ نے تو آپ کو ہر شے کے طور طریقے حتیٰ کہ بیت الخلا کے آداب تک سکھا دیے ہیں۔

آپ نے فرمایا۔ بے شک آنحضرتؐ نے رفع حاجت کے وقت قبلہ رخ بیٹھنے دائیں ہاتھ سے استنجا کرنے۔ تین ڈھیلوں سے ہم استنجا کرنے اور ہڈی اور گوبر سے استنجا کرنے سے منع فرمایا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس نے میری کسی ایسی سنت کو زندہ یا جو میرے بعد مت چلی تھی تو اس کو ان لوگوں کے ثواب کے برابر اجر ملے گا جنہوں نے اس پر عمل کیا اور ان کے ثواب میں بھی کچھ کمی نہیں ہوگی اور جس نے کوئی بدعت کا کام ایجاد کیا جسے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ پسند نہیں فرماتے تو اس کو ان لوگوں کے گناہوں کے برابر گناہ ملے گا۔ جنہوں نے اس پر عمل کیا اور ان کے گناہوں میں کچھ کمی نہیں ہوگی۔“ (ترمذی)

حضرت عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تم غیر عورتوں کے گھروں میں آمد و رفت سے اجتناب رکھو۔ ایک انصاری نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ دیور کے متعلق کیا فرماتے ہیں، فرمایا دیور تو موت ہے۔

امام مسلمؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن سعدؓ کا بیان ہے کہ دیور کا لفظ شوہر کے حقیقی بھائی نیز اس کے چچا زاد، تایا زاد وغیرہ سب پر بولا جاتا ہے۔

☆.....

شرک کے درمیان دانستہ ترک نماز حد فاصل ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا بیان ہے کہ میں نے آنحضرتؐ سے سوال کیا کہ کون سا عمل بہتر ہے؟ فرمایا، نماز کو اس کے وقت پر ادا کرنا۔ میں نے عرض کیا اس کے بعد کون سا عمل بہتر ہے؟ فرمایا، والدین سے بہتر سلوک کرنا۔ میں نے پھر عرض کیا اس کے بعد کون سا عمل بہتر ہے؟ فرمایا، راہ خدا میں جہاد کرنا۔

حضرت عمرو بن شریکؓ سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہؓ نے آنحضرتؐ سے سوال کیا کہ خدا کے نزدیک کون سا گناہ بہت بڑا ہے؟ فرمایا یہ کہ تو کسی کو خدا کا شریک قرار دے۔ حالانکہ خدا ہی نے تجھے پیدا کیا ہے۔ بے شک یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ پھر اس کے بعد کون سا گناہ بڑا ہے؟ فرمایا یہ کہ تو اس خوف سے اپنی اولاد کو ہلاک کر ڈالے کہ وہ تیرے رزق میں حصہ دار ہوگی۔ میں نے پھر عرض کیا اس کے بعد کون سا گناہ بڑا ہے؟ فرمایا یہ کہ تو اپنے بڑی کی بیوی سے زنا کرے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ جس نے ہم سے دھوکہ لیا وہ ہم میں سے نہیں۔

حضرت ابوامانہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا جس نے اپنے کسی مسلمان بھائی کا حق غصب کیا اللہ اس کے لیے دوزخ لازم اور اس پر جنت حرام کر دے گا۔ اس پر ایک صحابیؓ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ اگرچہ کوئی معمولی چیز ہی غصب کی ہو؟ فرمایا اگرچہ پیلو کے درخت کی ایک شاخ ہی کیوں نہ ہو۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ اگر کوئی شخص مجھ سے میرا مال چھیننا چاہے تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟ فرمایا اسے اپنا مال نہ دو۔ عرض

قمر و شہک

صبر الیقین کی ایک نئی داستان

”اماں دو ماہ گزر گئے گھر کا سارا راشن ختم ہو گیا ہے، شہیر بھایا نے جو ایک ماہ کا راشن ڈلوایا تھا جیسے تیسے میں نے دو ماہ چلا لیا گھر میں رکھے سارے پیسے بھی ختم ہو گئے ہیں، اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں جاب کروں گی۔“ اجیارہ کنگلی چاولوں کو چپتی ہوئی بولی تھی۔



”نہیں میں تمہیں جاب کرنے کی اجازت تو بالکل بھی نہیں دوں گی۔“ بلقیس آراء نے مٹین چھوڑ دی تھی، جس پر وہ سلائی کے کپڑے سی رہی تھیں۔

”تو پھر آپ ہی بتائیے کون ہماری کفالت کرے گا ہماری گئی چنی ضروریات کون پوری کرے گا، گھر کا خرچہ کچن کا راشن، بجلی، پانی اور گیس کے بل، آپ ہی بتائیے کون ہمارا وسیلہ بنے گا، شہر بھایا جا کے صرف ایک بار آئے ہیں مگر وہ بارہ واپس پلٹ کر خبر تک نہیں لی وہ یکسر بھول چکے ہیں کہ ان کی ایک ماں اور ایک سگی بہن بھی ہے وہ اپنی خوشیوں میں اس قدر مگن ہو گئے کہ انہیں ہم یاد تک نہیں آتے۔“ شاید آج اجیارہ کے صبر کا یہ نذر لبریز ہو گیا تھا جو زبان پر شکوہ آ گیا تھا۔

”میں سلائی تو کرتی ہوں، تم بھی ٹیوشن دیتی ہو ہمارا گزارا ہو رہا ہے اللہ کا شکر ہے اس مالک کا احسان ہے

قسط نمبر 11



رحم ہے ہم پر کہ کسی کے دروازے پر خدا نخواستہ ہاتھ تو نہیں پھیلائے جا رہے۔“

”اللہ نہ کرے اماں جو ایسا وقت ہم پر آئے، میں شاکر ہوں اپنے پروردگار کی نعمتوں پر جو اس نے ہم کو نوازی میں ناشکری نہیں ہو مگر اماں ہم اس حقیقت سے بھی نظر نہیں چراستے کہ کاروبار زندگی کسی کے لیے نہیں رکتی، وقت بہت ظالم ہے اماں اس کو اگر تھام کر چلیں گے تو یہ ہمیں زمین پر پٹختا ہوا آگے نکل جائے گا۔“ وہ بلیقہ آراء کو اپنی جاب کے لیے ہر صورت راضی کرنا چاہتی تھی۔

”تم چاہتی کیا ہو؟“

”فائزہ ایک بہت اچھی شہینی میں جاب کر رہی ہے وہاں ایک سیٹ خالی ہے میں چاہتی ہوں وہ سیٹ مجھے مل جائے۔“

”اور معاشرہ، محلے والے مجھے طعنے تشنہ نہیں دیں گے کہ ایک بیٹے کے ہوتے بلیقہ آراء نے بیٹی کو کمانے کے لیے نکال دیا۔“ بلیقہ آراء نے سمجھنا چاہا۔

اجیارہ نے محسوس کیا وہ نیم رضا مند تو ہیں مگر لوگوں کی باتوں کا ڈران کی چبھتی نظریں ان کو ڈرا رہی ہیں۔

”اماں..... اماں۔“ اجیارہ نے چاولوں کی ٹرے سائیڈ میں رکھی اور اٹھ کر بلیقہ آراء کے پاس آکر بیٹھ گئی

ان کا ہاتھ نرمی سے تھام کر ان کو پیار سے دیکھنے لگی تھی۔

”ہم پریشان ہیں ہمارے گھر راشن ختم ہو گیا، ہمارا بجلی کا بل تین ہزار آیا ہے، گیس کا ایک ہزار، تو کیا یہ محلے والے یہ معاشرہ آرہا ہے ہماری پریشانی کم کرنے ہمارا دکھ بانٹنے نہیں نا، تو میری بھولی اماں یہ لوگ صرف باتیں بناتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو درد کھڑے ہو کر تماشا دیکھتے ہیں اور مزہ لیتے ہیں چہ میگوئیاں کرتے ہیں، ہم اگر ان سے ڈریں گے ان کی فضول باتوں میں آئیں گے تو یہ ہماری بے وقوفی ہے۔“

بلیقہ آراء سوچوں کے گھیرے میں پھنس گئی تھیں۔

”کیا ہوا کیا سوچ رہی ہیں؟“

”آں..... ہاں..... نہیں کچھ نہیں۔“ وہ چونک کر رہ گئیں اور اپنی معصوم سی بچی کو دیکھنے لگی تھیں۔

”تمہارا اچھا سارشتہ آجائے میں تمہاری شادی کر دوں، تمہارے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں تو چین سے مر جاؤں۔“

”اماں پھر مرنے کی باتیں.... کیا میری شادی بہت ضروری ہے۔“

”ہاں بہت ضروری ہے۔“

”تو پھر جب وقت آئے گا تو وہ بھی ہو جائے گی مگر ابھی تو فی الحال جاب کی اجازت دے دیں۔“ اجیارہ شادی کا موضوع چھیڑنا نہیں چاہتی تھی جانتی تھی یہ بہت لمبی بحث ہے۔

”اچھا ابھی مجھے سلائی کرنے دو، تم جلدی سے چاول چڑھا دو مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“

”اس کا مطلب ہے آپ راضی ہیں۔“

”اجیارہ!“ اماں نے جان چھڑانی چاہی تھی۔

”ٹھیک ہے آپ کو بھوک لگی ہے مجھے بھی بہت زوروں کی بھوک لگی ہے میں چاول چڑھا دیتی ہوں کل کی دال رکھی ہے آپ یوں کریں دس روپے کا اچار لے آئیں۔“ اجیارہ کھڑی ہوئی بھی اور جلدی جلدی چاول صاف کرنے لگی تھی۔

بلقیس آراء نے مشین میں جھانکا جہاں صرف وہی اکلوتے دس روپے پڑے تھے۔
اجیارہ کی باتوں کو سوچتی ہوئی وہ باہر نکل گئیں، آخری سوچ یہی تھی کہ اجیارہ کچھ غلط نہیں کہہ رہی۔

☆.....☆

”ابراش!“ رشنا نے ابراش عسکری کا بیڈروم کا دروازہ کھولا۔ دوپہر کے دو بجے بھی اس نے اپنے بیڈروم میں اندھیرا کیا ہوا تھا۔ رشنا اندر داخل ہوئیں کمرے میں قبر سے زیادہ گہرا اندھیرا اس سے زیادہ سناٹا خاموشی تھی۔ رشنا کا دل دہل گیا دل کے ہزاروں ٹکڑے ہوئے تھے، انہوں نے سوچ پورڈ پر ہاتھ مارا سارے مٹن کھول دیئے فانوس کے بلب، تیز روشنی کے مرکز کی بلب نے ہر شے پر اجالا بکسیر دیا تھا۔

”مام پلیز بند کر دیجئے ساری لائٹس!“ ابراش عسکری نے اس تیز روشنی سے بچنے کے لیے اپنا ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ دیا تھا، رشنا نے بیڈ کی جانب دیکھا تھا۔ جہاں ابراش عسکری بیک کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھا تھا اور اپنے چہرے کو چھپا لیا تھا، رشنا سیدھا اس کے پاس آئی تھیں اور اس کے پاس بیٹھ گئیں۔

”میرے بچے، میرے شہزادے یہ کیا حالت بنائی ہے اپنی... کیوں اس طرح کر کے مجھے سزا دے رہے ہو۔“ ابراش عسکری کی بھری اجڑی حالت دیکھ کر رشنا کا دل خون کے آسوروتا تھا۔ انہیں یاد نہیں پڑتا کہ کبھی انہوں نے ابراش عسکری کو ایسی حالت میں دیکھا ہوگا۔ دن میں دو تین بار کپڑے چنچ کر تا تھا، کبھی کبھارے بال نہیں رہتے تھے، ہمیشہ کلین شیو بک سک ساتار رہنے والا ابراش عسکری آج اس حالت میں تھا! ان کا دل کڑھتا، تڑپتا رہتا تھا، جانے کس کی نظر لگ گئی ابراش عسکری کو۔

آج دو ماہ گزر گئے تھے اور ان دو ماہ میں ابراش عسکری نے کمرے سے قدم باہر نہیں نکالا۔

اس کے سارے دوستوں نے اس سے ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا سوائے سبکیگین حیدر ترمذی کے۔ وہ ہر روز آتا جا ہے آدھے ایک گھنٹے کے لئے مگر وہ سارا وقت ابراش عسکری کے ساتھ گزارتا اس کو سمجھاتا اس سے باتیں کرتا مگر اس کے جواب میں وہ صرف ”ہوں“ ہی کہتا بات تک کرنا چھوڑ دی تھی اس نے، یہاں تک کہ طلسم ناز نے جب اسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد ابراش عسکری کو دیکھا تو ایک بھی لہو لگا ئے بغیر فوراً سے بیشتر ہاتھ میں پہنائی ابراش عسکری کی انگوٹھی اتار کے اس کے پاس رکھ گئی تھی، اس نے سنگنی توڑ دی تھی، ہر رشتہ توڑ لیا تھا۔

صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا۔ ”ہمارا رشتہ تو کیا میں ہمارا دوستی کا رشتہ تک آگے نہیں بڑھا سکتی۔“

اس دن ابراش عسکری صبح معنوں میں ٹوٹ گیا تھا، اس کا دل ٹوٹ گیا تھا اور باہر سے ہر رشتہ ہی ختم کر لیا تھا صرف اپنے بیڈروم میں گپ اندھیرا کیے بیٹھا رہتا، چوہدری قیصر عسکری، رشنا، زہیرہ آجاتے بہت سمجھاتے کہ کمرے سے ہی باہر نکل کر وہ صاف انکار کر دیتا کھانا بھی بہت کم ہو گیا تھا اس کا۔

”ابراش!“ رشنا نے اس کے چہرے سے ہاتھ ہٹایا تھا۔

اس زہریلے ایڈ سے اس کا چہرہ اس قدر جھٹک گیا تھا کہ جو بھی اس کو دیکھتا وہ ڈر جاتا مگر وہ ماں تھی۔ اس کی آغوش اپنے بچے کے لیے بہت وسیع تھی۔

”مام پلیز لائٹس آف کر دیجئے نفرت ہوگئی، مجھے روشنی سے۔“

”میری جان آپ اس طرح تو نہیں تھے اندھیرے سے چڑنے والے سناٹے اور خاموشی سے گھبرانے والے، پھر کیوں گپ اندھیرے اور گھمبیر خاموشی کے باسی بن گئے۔“

”کیونکہ اب یہی میرا مقدر ہے مام یہی اندھیرا یہی خاموشی سناٹا میری زندگی ہے اور اب ویسے بھی جینا کون

چاہتا ہے نفرت ہو گئی ہے مجھے اپنی اس زندگی سے، پتہ نہیں میں کیوں بچ گیا، مرکبوں نہیں گیا روز روز مرنے سے بہتر ہے ایک ہی بار مر جانا جان چھوٹ جاتی میری اپنی اس ناکارہ فضول زندگی سے، اللہ نے میرے ساتھ بہت نا انصافی کی ہے، زیادتی کی ہے میرے ساتھ، عرش سے فرش پر لا چنچا ہے مجھے، یہ سانس بھی کیوں دی ہیں چھین کیوں نہیں لی مجھ سے میری سانسیں..... میرا دل دھڑکنا بند کیوں نہیں کر دیا۔ کیوں مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا..... کیوں.... مگر اب مجھے کسی کی کوئی پرواہ نہیں ہے، جب اللہ نے میری پرواہ میری فکر نہیں کی تو مجھے بھی کسی کی کوئی فکر کوئی پرواہ نہیں ہے، جائیں آپ کسی کو کوئی ضرورت نہیں ہے میرے کمرے میں آ کر میرے پاس بیٹھنے کی، آپ کو ڈر نہیں لگتا میرے چہرے سے جو ہر ایک یا آدھے گھنٹے بعد میرے پاس آ جاتی ہیں۔“ آج ابراش عسکری بولا تھا اندر شاید بہت غبار جمع ہو گیا تھا آج اس نے اس غبار کو نکلنے کا راستہ دے دیا تھا۔

”میں ایک ماں ہوں میری جان! اور ایک ماں کے لیے وہ بچہ بھی بہت عزیز اور پیارا ہوتا ہے جو اب بچ ہوتا ہے جو چل نہیں سکتا جو بول نہیں سکتا تو کوئی دیکھ نہیں سکتا، وہ اپنی اولاد کے لئے سب کچھ کرتی ہے اس سے پیار کرتی ہے اس کے نخرے اٹھاتی ہے اس کی دیکھ بھال کرتی ہے، اسے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتی ہے صاف سترا کرتی ہے کپڑے بدلواتی ہے اور آپ ایک ماں سے یہ سوال کر رہے ہو کہ مجھے آپ کے چہرے سے ڈر نہیں لگتا..... آج بہت دل دکھایا آپ نے میرا.....“ رشار رودی تھیں ان کا کلیجہ پھٹنے لگا تھا، وہ اپنے تحت جگر کو ہارتا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھیں۔

ابراش عسکری نے رشتا کو بغور دیکھا اس کا دل مزید بے چین بے سکون ہو گیا تھا، اس کی چاہنے والی ماں رو رہی تھیں ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

”مام مت روئیں آپ جانتی ہیں میں آپ کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔“ اس نے رشتا کے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔

”نہیں جھوٹ... آپ کو میرا دل دکھانا مجھے رلانا بہت اچھا لگتا ہے، میں تڑپتی ہوں سکتی ہوں آپ کو مزہ آتا ہے۔“

”ایسا نہیں ہے مام.... اور میں کس کو کیا رلاؤں گا مجھے کیا مزہ آئے گا میری زندگی نے تو خود میرے ساتھ مذاق کیا ہے اور اب دور کھڑی مجھ پر ہنس کر مزہ لے رہی ہے، میری زندگی مجھ پر قہقہہ لگا رہی ہے نہیں چاہیے مجھے ایسی بے مصرف زندگی.... جس نے مجھ سے میری چاہت میری محبت چھین لی نفرت ہے مجھے ایسی زندگی سے۔“ وہ بے بس سا ہو کر رشتا سے رخ نہی پھیر گیا تھا، آنکھوں میں نمی بھر نے لگی تھی ایک جہاں کی خوبصورتی کسٹی ہوئی تھی ابراش عسکری میں مگر آج اس سے زیادہ کوئی بد صورت نہیں تھا کہ اس کے دوست خوفزدہ ہو کر ڈر کر اس کو چھوڑ گئے تھے اور تو اور طلسم ناز اس کا پیارا اس کی چاہت نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا اس سے منہ پھیر لیا تھا۔

اور جو لفظ اس نے کہے تھے وہ آج بھی اسے یاد تھے، سو ہر طرف سے وہ آواز گونجتی تھی اور جتنا وہ گہرائی میں سوچتا اس سے کہیں زیادہ اسے خود سے نفرت ہونے لگتی، کراہیت آتی گھن آتی خود سے دل تو شدت سے چاہتا کہ خود کشی کر لے اور وہ کر بھی لیتا اپنا وجود اس ہستی کا نجات سے منام بھی دیتا اگر اس کا سب سے عزیز اس کا غم خوار دوست سبکتین حیدر ترمذی نے اس کو سنبھالا نہیں ہوتا۔

”ابراش مایوسی کفر ہے گناہ ہے مت ادا اس ہو۔ ڈاکٹر زائر نے کہا ہے کہ تمہارا چہرہ تمہیں واپس مل جائے گا علاج ہوگا ہم باہر جائیں گے۔ پلاسٹک سرجری سے تم کو تمہارا وہی چہرہ وہی خوبصورتی واپس مل جائے گی۔“

”نہیں کرانا مجھے علاج نہ ہی مجھے کہیں باہر جانا ہے میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔“ وہ زور سے چیخ کے بولا تھا، اس کے لب و لہجے میں اس کے انداز میں ضد تھی۔

”ام! ام! آگے کچھ نہیں چاہیے میں سونا چاہتا ہوں۔“ ابراش عسکری نے رشنا کی بات ہی کاٹ دی تھی اور پھر بغیر ان کی طرف دیکھے بغیر پھر کچھ بولے لیٹ گیا تھا اور ہاتھ اپنے ماتھے پر دھر دیا تھا، رشنا کچھ دیر اس کو دیکھتی کھڑی ہو گئیں۔

”جاتے ہوئے ساری لائش آف کر کے جائیے گا۔“ بازو آنکھوں سے پٹائے بغیر کہا تھا۔ رشنا کا دل جیسے پسلیوں سے باہر ہی تو آ گیا تھا۔ وہ اپنا دوپٹہ اپنے چہرے پر رکھتی ہوئی اپنی سسکیاں روکتی باہر نکل گئی تھیں۔ صوفے پر آکر بیٹھی اور رونے لگی تھیں۔ زنیہ نے انہیں ابراش عسکری کے بیڈروم سے باہر نکلتے دیکھ لیا تھا، رشنا کا روناس کا دل دکھا گیا تھا، وہ وہیں رشنا کے پاس آکر بیٹھ گئی تھی۔

”ام!“

”پتہ نہیں ابراش کب سنبھلے گا۔“

”اس کا دل ٹوٹا ہے ام، وہ ابھی دکھی ہے، غم میں ہے۔ اس نے اپنا چہرہ کھویا ہے ام۔“

”تو اس کا علاج ناممکن نہیں ہے، ڈاکٹر زائر نے بات کی ہے امریکہ اور لندن کے ڈاکٹر زے، ہر طرف سے مثبت جواب آیا ہے۔ ابراش مان جائے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ رشنا نے روتی آنکھوں سے زنیہ کو دیکھا تھا۔

”ام! ابراش یہ بات جانتا ہے کہ علاج سے وہ ٹھیک ہو جائے گا مگر جو دکھ، جو درد تکلیف اور جو دھوکا اسے اس کے دوستوں اور اس کی منگیت طلسم ناز سے ملا ہے اس نے ابراش کو اندر تک توڑ دیا ہے۔ طلسم کی محبت کا پتہ تو اب چلا ہے صحیح معنوں میں کہ وہ ابراش سے کتنی محبت کرتی تھی اور ام میں تو کہتی ہوں ایک طرح سے اس میں بھی اللہ کی کوئی نہ کوئی تو مصلحت تھی، ابراش کے ساتھ یہ حادثہ ہونا اور طلسم ناز کی محبت کا امتحان سب سامنے آ گیا اور ابراش کے وہ بے ڈھنگے بے ہودہ دوست جو صرف اس کے پیسوں پر پیش کرتے تھے اتنی مہنگی مہنگی شاپنگ کرانا تھا وہ ان سب کو اور جب ہم نے سمجھنا چاہا تو جواب ملتا کہ دوستوں میں سب چلتا ہے، ہونہر اب کہاں گئے وہ سب واہیات دوست۔“ اس کے لہجے میں نفرت بول رہی تھی۔

”ام! سبکدوشی سے زیادہ سچا، مخلص اور اچھا بہترین دوست اور کوئی نہیں۔ سبکدوشی بھی تو ماڈلنگ کے شعبے میں آگئے اور آپ جانتی ہیں کہ شو بیز کی زندگی کس قدر نفرت اور مصروف زندگی ہے مگر وہ پھر بھی ہر روز ابراش کے پاس آتے ہیں، اسے وقت دیتے ہیں، سمجھاتے ہیں۔ ام! ابراش کا بھرم ٹوٹا ہے، دل ٹوٹا ہے، محبت کے نام پر دھوکا ملا ہے۔ کچھ ناٹم لگے گا اس کو پھٹنے میں۔ آپ فکر مت کریں، انشاء اللہ اللہ بہتر کرے گا۔ ہماری ہمدردی، ہماری افسردگی اور ہماری مایوسی ہی ہے جو اس کو کمزور کر رہی ہے اور یہی وجہ ہے جو وہ چڑچڑا، بد مزاج ہو رہا ہے ورنہ آپ جانتی ہیں کہ ابراش کس قدر زندہ دل، ہنس مکھ، چلبلا تھا۔“ زنیہ بہت سمجھ داری سے رشنا کو سمجھا رہی تھی۔

”مگر زنیہ مجھے اپنا ویسا ہی پرانا والا ابراش چاہیے۔ ایسی حالت میں دیکھتی ہوں ابراش کو تو کلیجہ منہ کو آتا ہے، دل پھٹنے لگتا ہے میرا۔ آپ ہی دونوں تو میری زندگی، میری کل کائنات ہو، میرا سب کچھ... نہیں دیکھ سکتی

میں آپ دونوں کو کسی بھی تکلیف میں۔“ دو پٹہ منہ پر رکھے وہ پھر سبک اٹھی تھیں۔
 ”ملے گا مام! ہمیں اپنا پرانا والا ابراش ملے گا۔ میں بھی تو بہت دھمی ہوں مام! مجھے بھی درد ہوتا ہے، تکلیف ہوتی ہے جب میں ابراش کو اس حالت میں دیکھتی ہوں تو وہ میرا بڑواں بھائی ہے، مجھ سے زیادہ اور اسے کون جانے گا، سمجھے گا مگر آپ اس طرح روئیں گی، ہمت ہار دیں گی تو ابراش سمجھے گا ہم اس سے ہمدردی کر رہے ہیں اور جو حوصلہ ہمت اسے عینکین دیتے ہیں کہیں وہ ہمارے رویے سے پست نہ پڑ جائیں اور ابراش کوئی غلط قدم یا انتہائی قدم نہ اٹھا لے۔ تو پلیز نام! تھوڑا تو آپ کو بھی برداشت اور حوصلے سے کام لینا ہوگا۔ دو ماہ ہو گئے ہیں وہ اپنے کمرے میں گھپ اندھیرا کیے پڑا رہتا ہے مگر انشاء اللہ بہت جلد وہ باہر آئے گا، ہماری بات مانے گا اور ٹھیک بھی ہو جائے گا۔“

زنیرہ کی آنکھیں بھی نم تھیں، اس کا بھی دل دکھا ہوا تھا۔ وہ بھی ابراش عسکری کو لے کر فکر مند اور پریشان تھی لیکن اگر وہ بھی ابراش عسکری سے ہمدردی افسوس کرے گی تو وہ اسے کشتکول میں پڑے سکوں کی طرح بھیک سمجھے گا جو کہ وہ نہیں چاہتی تھی۔

”آپ سے زیادہ سمجھ دار اور عقل مند تو ہماری بیٹی نکلی۔“
 چوہدری قیصر عسکری کی بھاری اور گھمبیر آواز پر دونوں نے پلٹ کر دیکھا جو نہ جانے کب سے ان کے پیچھے آکر کھڑے ہوئے تھے۔

”ڈیڈ۔“
 ”خوش رہیے ہمیشہ۔“ چوہدری قیصر عسکری نے زنیرہ کے سر پر دست شفقت رکھا تھا اور وہیں آکر بیٹھ گئے تھے۔

”آج آپ جلدی آ گئے۔“
 رشنا نے اپنا بھیگا چہرہ اور سمندر سے بھری آنکھیں دوپٹے سے خشک کیں۔
 ”اول.... رشنا...“ انہوں نے دھیرے سے پکارا تھا۔
 ”جی۔“

”زنیرہ نے جو کہا وہ بالکل ٹھیک ہے۔ بے شک یہی دونوں ہمارے بچے ہماری کل کائنات، ہماری خوشی، ہماری زندگی کے چراغ ہیں مگر جس موڑ پر زندگی ہم سے ہمارا اور ابراش کا امتحان لے رہی ہے اس آزمائش پر ہمیں پورا اترنا ہے۔ آپ کو بہت ہمت اور صبر و حوصلے سے کام لینا ہوگا۔ میں جانتا ہوں آپ ایک ماں ہیں، آپ کا دل ہم سے زیادہ نرم اور کمزور ہے مگر آپ کو اپنے دل کو بہت مضبوط بنانا ہوگا۔“
 ”جی۔“

”مام۔“ زنیرہ نے رشنا کے گلے میں ہاتھ ڈالا اور ان کو خود سے لگا کر پیار کیا۔
 ”انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا، پہلے جیسا ہو جائے گا۔“
 ”انشاء اللہ۔“ رشنا نے بھی دل سے دعا کی تھی۔
 ”اچھا آپ دونوں بیٹھیے۔ میں آپ دونوں کے لئے گرم گرم چائے اور کٹلس بنا کے لاتی ہوں اور اس کھڑوس کو بھی دوں گی۔“ وہ مسکرائی ہوئی کھڑی ہو گئی۔
 چوہدری قیصر عسکری نے نرم و ملائم نظروں سے اپنی لخت جگر بیٹی کو دیکھا تھا۔

”آپ آج جلدی آگئے۔“

”ہوں۔ آج ایک ڈیلی گیشن آ رہا ہے اور ضرور ف سنگھانیا کے ساتھ میٹنگ بھی ہے تو سوچا ہوٹل میں ہی ایک ساتھ رکھ لوں اس لئے گھر آیا ہوں، فریش ہو کر پھر نکلتا ہوں۔“

”اچھا۔ پھر میں آپ کا دوسرا سوٹ نکال دوں؟“

”ابھی آپ بیٹھے، مجھے اتنی جلدی نہیں جانا، زہیرہ چائے اور کٹلس لارہی ہے۔“ رشنا اٹھ رہی تھیں کہ چوہدری قصیر عسکری نے انہیں ٹوک دیا تھا۔

پھر دونوں ادھر ادھر کی باتوں میں لگ گئے، اپنے میں زہیرہ بھی چائے اور کٹلس رکھ کے اپنا اور ایراش کالے کر ایراش عسکری کے بیڈروم میں چلی گئی تھی۔

☆.....☆

آج کوئی ایک ماہ گزر گیا تھا۔ جگہ جگہ کی خاک چھانٹتے ہوئے، کہیں بھی اس کو اس کے مزاج کی نوکری نہیں مل رہی تھی اگر مزاج اور اس کے وقار و طبیعت کے مطابق تھی تو سیلری اچھی نہیں تھی اور اگر سیلری اچھی تھی تو جواب اچھی نہیں تھی۔ باس اپنی پریٹل سیکرٹری بنا کر اپنے پرنٹل کام کروانا چاہتے تھے تو کوئی اس کی خوبصورتی کو کیش کرانا چاہتا تھا۔ وہ تھکنے لگی تھی ایک اکیلی عورت کا باہر نوکری کرنے کے لئے نکلنا اتنا مشکل ہے، یہ اجیارہ نے اب جانا اور سمجھا تھا۔ ایک بھالی ہوتے ہوئے بھی بہن نوکری ڈھونڈنے کے لئے در در کی ٹھوکیں کھا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

”یا میرے مالک کیا کروں؟“ اجیارہ تھک ہار کے پارک میں آگئی تھی اور ایک سنگ مرمر کی بیچ رہ بیٹھ گئی تھی۔ گھر میں جمع سارے پیسے ختم ہو گئے تھے، راشن والے نے بھی اب ادھار دینے سے منع کر دیا تھا، بجلی کا بل پانچ ہزار ہو گیا تھا، دو دن ہو گئے تھے اگر صبح کا ناشتہ کرتے تو دو پہر کا کھانا نہیں کھاتے اور اگر دو پہر کا کھانا کھا لیتے تو رات کے لئے کچھ کھانے کو نہیں بچتا۔ گھر میں اب فاقے پڑنے لگے تھے۔

پارک کے بالکل سامنے ایک شاندار آفس کی بلڈنگ کھڑی تھی۔ پہلے سوچا وہاں جائے مگر پھر ذہن میں آیا کہ وہاں کے باس کی بھی وہی ڈیمانڈ نہ ہو جو آفس کے باس کی وہ سن چکی ہے اور سب سے بڑی بات وہاں سے کچھ ایمپلائز آ جا رہے تھے۔ ان کی اعلیٰ و عمدہ اور خوبصورت سی ڈریسنگ وہاں کے آفس ورکرز کو دیکھنے کے بعد اس نے خود کو دیکھا، پھر پیس بلیو اینڈ گرین امتزاج کا جارجٹ کا سوٹ جو اس نے پچھلے سال ہی بنوایا تھا، ہینڈ بیگ بھی سستا سا ہی تھا۔ اسے خود پر احساس کتری سی ہونے لگی تھی۔

”ایک یار اگر ٹرائی کر لوں؟“ ڈرتے ڈرتے سوچتی ہوئی اجیارہ کھڑی ہوئی تھی۔ اجیارہ اس آفس کے اندر داخل ہوئی تھی۔ اس کا کمپلیکس مزید بڑھنے لگا تھا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اس آفس میں ماسی کی جاب کے لئے آئی ہو۔

”جی فرمائیے! آپ کو کس سے ملنا ہے؟“ تھری پیس، ٹائی لگائے اس شخص نے بڑے مہذب انداز میں

پوچھا تھا۔

”جی وہ....“ اجیارہ گھبرا کر رہ گئی۔ اس کی رہی سہی ہمت بھی جیسے جواب دینے لگی تھی۔ حالات اس موڑ پر بھی لے آئیں گے، سوچا نہیں تھا۔

”آر یو آل رائٹ۔“ اس شخص نے اجیارہ کی گھبراہٹ نوٹس کر لی تھی۔

”جی! اور اصل میں یہاں جاب کے لئے آئی ہوں۔“ بہت سی ہمت مجتمع کرتے ہوئے اس نے کہا تھا۔
 ”جاب کے لئے؟“ وہ حیران نظروں سے بغور دیکھنے لگا تھا۔
 ”جی۔“

”مگر محترمہ اس آفس میں جاب کی تو کوئی دیکھنی نہیں نکلی ہے اور دوسرا یہ کہ سب سے پہلے تو آپ مجھے یہ بتائیے آپ نے چوہدری قیصر سے اپائنٹمنٹ لی تھی۔“
 ”نہیں۔“ اجیارہ کے چہرے کی اب ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اسے دھکے دے کر اس آفس سے باہر نکال دیں۔

”مگر وہ تو بغیر اپائنٹمنٹ کے کسی سے نہیں ملتے۔ بہر حال آپ گھبرائیے نہیں۔ میں سر سے آپ کے لئے بات کرتا ہوں۔“ منیجر کو شاید اجیارہ کی حالت پر ترس آ گیا تھا۔
 اجیارہ وہیں کھڑی رہی اور اس شخص کے واپس آنے کا انتظار کرنے لگی تھی، پانچ منٹ بعد وہ شخص واپس آ گیا تھا۔

”آپ کو سر بلار ہے ہیں اندر، آپ جا سکتی ہیں۔“ منیجر نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔
 اجیارہ نے اثبات میں گردن ہلائی اور منیجر کے بتائے ہوئے راستے پر چل دی۔ شیشے کے دروازے پر دھیرے سے دستک دی تھی۔

”کم ان۔“ بھاری اور گھمبیر آواز میں حکم ملا تھا۔ لرزتی کانپتی ٹانگوں سے وہ اندر داخل ہوئی، چہرے پر جہاں بھر کی گھبراہٹ تھی اور جتنا حسین اور خوبصورت یہ آفس تھا اس سے کہیں زیادہ خوبصورت اور اعلیٰ وعملہ یہ آفس کا روم لگ رہا تھا۔ احساس محرومی اور احساس کمتری مزید اس کے اندر بڑھنے لگی تھی۔ دل میں سوچیں اور وسوسے بڑھنے لگے تھے۔ کیا اس نے صحیح کیا تھا یہاں آ کر۔ کاش وہ نہیں آتی یہاں.... بھاگ جائے.... وغیرہ وغیرہ۔
 چوہدری قیصر عسکری نے بغور اجیارہ کو اوپر سے نیچے تک دیکھا تھا۔

”اچھا تو آپ یہاں جاب کرنا چاہتی ہیں؟“
 ”جی سر!“ نظریں جھکائے کانپتے ہونٹ جیسے وہ اپنے کسی جرم کا اقبال جرم کر رہی ہو۔
 چوہدری قیصر عسکری بہت زیرک نگاہ، بہت شارپ ذہن رکھتے تھے۔ سامنے والے کے انداز سے اس کے بولنے چلنے سے اس کا خاندان اس کے حالات بتا سکتے تھے۔
 ”اوکے، مجھے لگتا ہے جاب کی آپ کو اشد ضرورت ہے۔“

”جی سر!“
 ”تو پھر آپ کو میرا ایک پرسنل کام کرنا ہو گا یا یوں سمجھئے کہ یہ آپ کی جاب ہی ہے۔“
 ”پرسنل جاب؟“ اجیارہ کے ذہن میں وہی خیالات، وہی بات آگئی جو اس کے کان دو ماہ سے سن رہے تھے۔ اس نے نظریں اٹھا کے چوہدری قیصر عسکری کو دیکھا تھا۔

”آئی ایم سوری سر! جس طرح کی آپ مجھے سمجھ رہے ہیں میں اس ٹائپ کی لڑکی نہیں ہوں۔“
 ان بڑے بڑے خوبصورت آفس کے باس کے دل کس قدر گھٹیا اور کراہت زدہ ہوتے ہیں، کتنی کمینہ نظریں ہوتی ہیں ان کی۔
 ”کیا مطلب؟ میں کس طرح کی لڑکی سمجھ رہا ہوں آپ کو اور آپ کس ٹائپ کی لڑکی نہیں ہیں؟“ چوہدری قیصر

عسکری اس کی الجھی بات واقعی نہیں سمجھتے تھے۔
 ”آپ کی ”پرسنل جاب“ جو رات کی تاریکی سے شروع ہو کر صبح کے اجالے پر آخر ختم ہوتی ہے۔“ وہ بانسا لب و لہجہ مگر انداز میں اعتماد تھا۔

”سٹ اپ، جسٹ سٹ اپ.... یونانس گرل۔“ چوہدری قیصر عسکری بہت بری طرح غصے سے دباڑے تھے۔ ان کا جلال غیض و غضب دیکھ کر اجیارہ بری طرح سہم کر رہ گئی تھی۔ وہ خوفزدہ ہو کر نظریں جھکا گئی تھی۔ چوہدری قیصر عسکری غصے کے مارے اپنی سیٹ سے کھڑے ہو گئے تھے اور اجیارہ کے کپکپاتے وجود اور سہتے ہوئے چہرے کو گھورنے لگے تھے۔

”تمہاری ہمت بھی کیسے ہوئی اس قدر گھٹیا اور بے ہودہ بات میرے سامنے کرنے کی۔“
 اجیارہ بل بھر میں سمجھ گئی کہ اب تک جن پاس کو ذہ دیمچتی اور سستی ہوئی آئی ہے چوہدری قیصر عسکری ان سے بالکل الگ اور مختلف ہیں۔ وہ ویسے بالکل بھی نہیں ہیں۔ اس کو شدت سے اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا۔
 ”سوری سر! مگر دو ماہ ہو گئے ہیں مجھے جاب ڈھونڈتے ہوئے اور ہر کمپنی کے آؤرنے تو کبھی منیجر نے مجھ سے ایسی ہی گفتگو کی ہے۔“ اجیارہ کی آنکھوں میں نمی سی بھرنے لگی تھی۔

چوہدری قیصر عسکری نے بہت غور سے اس کا ندامت زدہ چہرہ دیکھا تھا۔

”آپ اپنے گھر سے جاب کے لئے پہلی بار نکلی ہیں؟“

اجیارہ نے نظریں اٹھا کے دیکھا تھا، وہ بہت حیران ہوئی تھی۔

”ان کو کیسے پتہ چلا؟“ وہ صرف سوچ کر ہی رہ گئی تھی۔

”بہر حال تم کو نوکری چاہئے، وہ تمہیں یہاں مل جائے گی۔ میں تمہیں پورے بیس ہزار دوں گا۔“

”بیس ہزار.....“ یکدم سے اس کے منہ سے نکلا تھا۔

”ہاں بیس ہزار۔“

”مگر سر مجھے کرنا کیا ہوگا؟“

ایسا کیا کام کروائیں گے چوہدری قیصر عسکری جو اتنے پیسے دیں گے۔ اس کے دل و دماغ میں ایک بار پھر سے دسو سے گھر کرنے لگے تھے۔

”میرے گھر جا کر میرے نواسے کو پڑھانا ہوگا جو چار سال کا ہے۔“

”جی!“

چوہدری قیصر عسکری کی الجھی باتوں نے اجیارہ کو صحیح معنوں میں الجھا دیا تھا۔ چار سال کے بچے کی اتنی ٹیوشن فیس۔ چلو مان لیا وہ پڑھائی میں کمزور ہے تو زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار ہو جائے گی.... بیس ہزار.... اس کے پلے کچھ نہیں پڑ رہا تھا۔

”کیا سوچنے لگیں؟“ چوہدری قیصر عسکری نے اس کا الجھن زدہ اور سوالوں سے بھرا چہرہ پڑھ لیا تھا۔

”سر! معاف کیجئے گا، یہ بہت زیادہ نہیں ہیں؟“

”بالکل زیادہ ہیں مگر تمہاری اصل جاب یہ نہیں ہے۔“ وہ سنجیدگی سے کہتے ہوئے واپس اپنی سیٹ پر براہمان ہو گئے اور بیک سیٹ سے ٹیک لگا کر اجیارہ کو دیکھنے لگے تھے۔

”پھر....؟“

”اماں..... اماں کہاں ہیں؟“ خوشی سے کھنکھاتی ہوئی آواز اجیارہ کی آمد پر اندر سے بلیقیں آراء تیزی سے کمرے سے باہر آئی تھیں۔

”اجیارہ تم آگئیں..... جانتی ہو میں کتنی فکر مند ہو گئی تھی، کس قدر پریشان ہو گئی تھی۔ آج اتنی دیر کر دی تم نے آنے میں۔ کوئی ضرورت نہیں ہے تمہیں باہر نکل کر نوکری ڈھونڈنے کی۔ نہیں چاہیے مجھے تمہاری نوکری۔“

بلیقیں آراء کی فکر سے چور آواز، پریشان سا چہرہ، ہنسی ہاری سی بلیقیں آراء پر اجیارہ کو ڈھیر سا پیار آیا تھا۔

”میری پیاری اور بھولی سی اماں! آپ کو اب پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ مجھے نوکری مل گئی ہے۔“ اجیارہ نے ہاتھ میں پکڑے سارے شاہروہیں پلنگ پر رکھ دیئے تھے اور بلیقیں آراء کے گلے سے لگی تھیں۔

”سچ، کہاں؟“ خوشی تو بلیقیں آراء کو کبھی بہت ہوئی تھی مگر چہرے پر فکر کے آثار پھر سے منڈلانے لگے تھے۔

”مگر پہلے یہ بتاؤ نوکری کیسی ہے اور کیا کرنا ہوگا تمہیں؟“

”نوکری بہت اچھی ہے اماں، ایک چار سال کے بچے کو پڑھانا ہوگا بنگلے میں جا کر۔“

”بنگلے میں جا کر..... تم بنگلے میں جاؤ گی، بیٹا پڑھانا بری بات نہیں ہے، بہت اچھا شعبہ ہے اگر پڑھانا ہی ہے تو کسی اسکول میں پڑھالو۔“

”اسکول میں بھی لگی تھی میں مگر وہاں کی اتنی اچھی تنخواہ نہیں تھی جتنی مجھے یہاں سے مل رہی ہے۔“

”اور یہاں کتنی مل رہی ہے؟“ خدشات و واہمات دل و دماغ میں کنڈلی مارنے لگے تھے۔

”بیس ہزار اماں۔“ اجیارہ نے دھیرے سے ہنستے ہوئے کہا۔

”بیس ہزار.....! وہ جو تک کر بولیں۔“

”اجیارہ! چار سال کے بچے کو پڑھانے کی فیس بیس ہزار.....! نہیں اجیارہ فوراً منع کر دو۔ مجھے تو یہ نوکری ٹھیک نہیں لگ رہی۔“ بلیقیں آراء کے وسوسے زبان پر آ گئے تھے۔

”ارے اماں خالی بچے کو ہی نہیں پڑھانا بلکہ جس بچے کو پڑھانا ہے اس بچے کے نانا کے آفس میں جاب بھی کرنی ہو گئی۔“ اجیارہ کو جلدی سے بس ایک یہی بہانہ سوچا تھا۔

”اچھا!“ بلیقیں آراء کی جان میں جان آئی۔

”میں تو کچھ اور ہی سمجھتی تھی۔“

”آپ کی فکر اور پریشانی بھی بجا ہے اماں، بہر حال یہ سب چھوڑیے دیکھئے میں کیا لانی ہوں، راشن والے کو سارا ادھار بھی چکا آئی ہوں۔“ اجیارہ نے باتوں کا رخ موڑ دیا تھا جس میں کامیاب بھی ہو گئی تھی۔

”تم نے میری بہت بڑی کمینشن دور کر دی میرے بچے۔ آج تک میں نے کسی سے ادھار نہیں لیا مگر نوبت یہاں تک آجائے گی تصور میں بھی نہیں سوچا تھا میری بیٹی باہر کمانے کے لیے نکلے گی اس کا بھی گمان نہیں تھا۔ حالات اور مجبوری کیا کیا کر لیتے انسان سے۔“ بلیقیں آراء کے چہرے پر شرمندگی ندامت کیا کچھ نہیں تھا۔

”اماں اب آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں یہ تو میرا فرض ہے، ورنہ ایسے حالات ہوں گے مجھے بھی کہاں علم تھا۔“

”خوش رہو میری بیٹی اللہ تمہیں ہمیشہ خوش اور آباد رکھے ہر بری نظر ہر بلا سے بچا کر رکھے۔“ بلیقیں آراء کی آنکھوں میں نمی دوڑنے لگی تھی۔ انہوں نے اجیارہ کا گلابی چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں بھرا اور اس کی روشن

”ابراش عسکری میرا کلوتا بیٹا.... تمہیں اس گھر میں سنی کے ذریعے میرے بیٹے کے سامنے جانا ہوگا اور کسی بھی طرح اس کو اس کا کھویا ہوا اعتماد، یقین، بھروسہ دینا ہوگا۔ اس کو باہر کی دنیا کے اجالے میں لانا ہوگا۔ آج وہ اندھیروں کا باسی ہے۔“

”مگر سر! یہ کام تو آپ بھی کر سکتے ہیں، آپ کی وائف....“

”اگر کر سکتے تو اتنی کثیر رقم دے کر تمہیں کیوں آفر کرتا۔“ چوہدری قیصر عسکری کے چہرے پر ناگواریت کے رنگ پھیلنے لگے تھے۔ انہوں نے تیزی سے بات کاٹی بھی اجیارہ لی۔

”اوکے سر! میں تیار ہوں۔“

ایسے پیسوں کی ضرورت تھی، گھر کے حالات بگڑتے جا رہے تھے، ایسے میں بیس ہزار کی یہ جاب کچھ بری بھی نہیں تھی۔

”مگر اس سے پہلے میں بہت کچھ تمہیں آگاہ بھی کرنا چاہوں گا۔“

”جی سر!“

”یقیناً یہ جاب تمہیں بہت ایزی لگ رہی ہوگی مگر اس جاب کو کرنے کے لئے تمہیں اپنی ساری ہمتیں، برداشت اور حوصلہ جمع کرنا ہوگا کیونکہ ابراش عسکری کو لڑکیوں سے شدید ترین نفرت ہے۔ وہ ان کا وجود اپنے پاس تو کیا اپنے گھر میں بھی برداشت نہیں کرے گا۔“

”تو سر پھر میں ان کے سامنے کیسے جاؤں گی۔ اگر غصے میں انہوں نے مجھے دے کر باہر نکال دیا تو؟“

”میں نے آپ سے کیا کہا کہ آپ کو اپنی ساری ہمتیں، حوصلے اور برداشت لے کر اس گھر میں جانا ہوگا اور ایک بات اور میں آپ پر واضح کر دوں مس اجیارہ حسن کہ ابراش عسکری میرے یا تمہاری طرح مکمل نہیں ہے۔ ایک حادثے نے اس کا چہرہ اس سے چھین لیا ہے۔“

”لو ایک یہی کسر رہی تھی۔“ اجیارہ صرف سوچ کر ہی رہ گئی۔

”یہ لو یہ رکھو تمہاری ایڈوائس فیس۔ کل تمہیں پوری مل جائے گی۔“ چوہدری قیصر عسکری نے دس ہزار کا لفافہ اس کے آگے ٹیبل پر رکھا تھا۔

”بہت کچھ ایسا بھی ہے جو میں تمہیں سمجھا نہیں سکتا، ابراش عسکری کا بے انتہا غصہ، اس کا بد مزاج رویہ اور سب سے بڑھ کر اس کی شدید ترین نفرت، وہ سب تمہیں اس گھر میں جا کر سمجھنا ہوگا۔“

اجیارہ کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ بہت بڑی آواز میں پڑنے والی ہے۔ اس کا ہر بڑھتا قدم ایک نئے امتحان سے متعارف کرائے گا۔

”مس اجیارہ حسن!“

”جی..... جی سر....“ وہ چونک کر رہ گئی۔

”آپ اس جاب کے لئے تیار ہیں؟“

”ییس سر!“

”تو پھر یہ لفافہ اٹھائیے اور کل ٹھیک دس بجے آفس آجائیے گا۔ باقی باتیں کل ہی ہوں گی۔“

”جی بہتر۔“ اجیارہ نے ہنسنے کی بجائے ٹیبل پر رکھا وہ لفافہ اٹھا لیا تھا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ چوہدری قیصر عسکری نے پر سوچ نظروں سے دروازے کی طرف دیکھا تھا۔

پیشانی پر شفقت بھرا بوسہ لیا تھا۔

”بس اماں آپ کی دعائیں ہی چاہیں یہی میرا کل سرمایہ ہے۔“ اجیارہ نے بھیگی آنکھوں سے بلقیس آراء کے ہاتھوں کو چوم لیے تھے۔

”اچھا خیر چھوڑیں، یہ سارا سامان ہم بعد میں کچن میں رکھیں گے میں ساتھ بریانی بھی لائی ہوں آپ بیٹھے میں پلیٹ لاتی ہوں۔ پھر مل کر ہم ماں بیٹی بریانی کھائیں گے۔“ اجیارہ نے شاپر سے بریانی کا پیکٹ نکالا اور کچن میں چلی آئی۔

”مجھے معاف کر دیجیے گا اماں میں آپ کو سچ نہیں بتا سکتی میں نے آپ سے جھوٹ بولا ہے اگر میں آپ کو سچ بتا دیتی تو مجھے یقین ہے آپ مجھے یہ جاب قلمی نہیں کرنے دیتیں۔“

اجیارہ نے اپنے دل میں سوچتے ہوئے فرخ سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی اور پلیٹ، گلاس لے کر باہر آئی تھی۔

☆.....☆

”ماما کیا بنایا ہے آج ڈنر میں؟“ سبکدین حیدر ترمذی کھانے کی ٹیبل پر آیا تھا اور غنوی کی برابر والی چیر پر بیٹھ گیا، غنوی پہلو بدل کر رہ گئی سخت ناگوار لگتا تھا اس کو سبکدین حیدر ترمذی کا اس کے برابر میں بیٹھنا۔

”آج غنوی نے بھنا ہوا قیمہ اور پلاؤ بنایا ہے ساتھ میں خوبانی کا میٹھا بھی ہے۔“ امبرین نے قیے کی ڈش سبکدین حیدر ترمذی کے طرف بڑھائی جو اس نے تمام لی تھی۔

”اوگھ! اس کا مطلب ہے آج میں نے آپ لوگوں کے ساتھ ڈنر کرنے کا فیصلہ ٹھیک کیا ہے۔“ سبکدین حیدر ترمذی نے قیمہ اپنی پلیٹ میں ڈالا تھا۔

”میں بھی حیران ہوں بر خوردار آج ہمارے ساتھ کھانے کی ٹیبل پر کیسے۔ آپ تو اس قدر فیس ماڈل ہو گئے ہیں آپ نے آج ہم لوگوں کے لئے کیسے نام نکال لیا۔“ عفان ترمذی نے پلاؤ کا ایک چمچ اپنے منہ میں ڈالا تھا۔

”پاپا آپ میری تعریف کر رہے ہیں یا بھگو بھگو کے طنز کے تیر چلا رہے ہیں۔“ سبکدین حیدر ترمذی نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

”میں تمہارے پہلے والے جملے سے قطعی اتفاق نہیں کرتا۔“

”اس کا مطلب آج یہ گردن چھری کے نیچے آنے والی ہے۔“

”غنوی بیٹا! عفان ترمذی نے سر کو جھکائے پلیٹ میں چمچ چلاتی غنوی کو پکارا تھا۔

”جی پاپا! غنوی نے چونک کر عفان ترمذی کو دیکھا۔

”بیٹا میرا پورا پورا مورل سپورٹ آپ کی طرف ہے آپ اس گدھے کا کان سمجھ سکتی ہیں اور چاہیں تو اچھی طرح کلاس بھی لے سکتی ہیں۔ اس کی مجال نہیں ہوگی آپ کے آگے چوں بھی کرنے کی۔“

”پاپا ازناٹ فیئر جیسے میں ایک فرمانبردار بیٹا ہوں اسی طرح ایک فرمانبردار شوہر بھی ہوں میں غنوی کے آگے چوں نہیں کرتا، چاہے تو پوچھ لیں غنوی سے.... کیوں غنوی؟“ سبکدین حیدر ترمذی نے رخ موڑ کر خاموشی غنوی کو دیکھا تھا۔

غنوی کا دل وجان سے خون جل کر رہ گیا دل تو شدت سے چاہا کہ ہاتھ میں پکڑا کاغذ اس کے خوبصورت اور مسکراتے ہوئے منہ پر مار کے زخمی کر دے۔

”دیکھ لیں آپ کی بہو صاحبہ مجھے کیسے غصے سے گھور رہی ہے۔“ سبکدھن حیدر ترندی اس کی حالت سے مزہ لینے لگا تھا۔

”ابنی ویز!“ غنوی کے غصے سے گھورنے پر سبکدھن حیدر ترندی نے بہت زور سے قہقہہ لگایا تھا۔
 ”میں نے کھا لیا اب میں سونے جا رہا ہوں شدید تھک گیا ہوں۔ رجاہ کی بچی نے اچھے کام پر لگایا ہے مجھے۔“

اسی اثناء میں اس کا فون بج اٹھا تھا، سبکدھن حیدر ترندی نے اپنا موبائل فون دیکھا اسکرین پر رجاہ کی تصویر جھللا رہی تھی۔

”یہ دیکھیں اس لڑکی کو ذرا سکون نہیں ہے۔“
 غنوی نے تو منہ پھیر لیا بلکہ ”ایسکیوز می۔“ کرتی ہوئی کھڑی ہو گئی اس کو سبکدھن حیدر ترندی سے اس کے کام سے کوئی سروکار نہیں تھا۔

امبرین نے غنوی کا موڈ خراب ہوتے نوٹ کر لیا تھا، انہوں نے جاتی ہوئی غنوی کو دیکھنے کے بعد عفاان ترندی کو دیکھا۔

”ہاں رجاہ بولو!“ سبکدھن حیدر ترندی نے فون ریسیو کر لیا تھا۔

”کیا کر رہے ہو۔“

”ڈنر کر رہا تھا اب سونے جا رہا ہوں۔“

”کوئی ضرورت نہیں ہے ابھی سونے کی، مندریم بلوچ سے میری میٹنگ ہے ٹھیک گیارہ بجے میں تمہیں بھی آنا ہے۔“

”واٹ!“ وہ تو جیسے چیخ سے ہی اچھل کر رہ گیا تھا۔

”یار تھوڑا سا رحم کر لو میں شدید تھک چکا ہوں ابھی تو میں بالکل نہیں آ رہا سونے جا رہا ہوں۔“

”اوکے، اوکے آرام کرو، ابھی ساڑھے آٹھ بجے ہیں، گیارہ بجے کی میٹنگ ہے۔“

”آنا ضروری ہے کیا؟“

”بالکل..... کیونکہ آفر شیڈنگ کا جو کرشل ہے وہ تم دونوں کو ہی کرنا ہے۔“

”رجاء..... ماڈلنگ کافی تو ہے۔ اب تم کرشل بھی کروانا چاہتی ہو؟“ اس کا قطعی موڈ نہیں تھا۔

”یار فیڈ بیک ریکوسٹ بھی تو کتنی مل رہی ہیں۔“

”تو تھینا کل تم مجھے ڈرامے اور فلز کی آفر بھی دے رہی ہوگی۔“

”کچھ کہہ نہیں سکتے۔“

”رجاء میں تمہارا سر توڑ دوں گا، ایک برنس ٹائیکون کو اچھے دھندے پر لگایا ہے۔“ وہاں سے زبردست قہقہہ ابھرا تھا۔

”اوکے ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا ہوں ابھی سونے جا رہا ہوں انھوں گا تو سوچتا ہوں کہ کیا کرنا ہے۔“

”ہا ہا ہا ہا۔“ وہاں سے رجاہ صدیقی نے جانے کیا کہا کہ وہ زور سے ہنسا تھا۔

”غنوی اس ٹائپ کی نہیں ہے۔“ مسکراتے ہوئے سبکدھن حیدر ترندی نے فون رکھ دیا تھا۔

”I.T.V انڈسٹری کی فلیڈ میں بہت زیادہ انوالوئیں ہوتے ہیں ماڈلنگ کا شعبہ برائے نہیں ہے مگر فلیلی اور برنس

کو بھی نام دو۔“ عفان ترمذی جو کہنا چاہا رہے تھے وہ سمجھ گیا تھا۔
 ”یابا بس یہ آخری شوکرلوں تو بزنس کو بھی نام دوں گا۔“
 ”صوف سگھانیا سے میری میٹنگ ہوئی تھی کل۔“

”اچھا کیا آفر دی ہے۔“
 ”ابھی تو فی الحال کچھ کپڑوں کی مشینری پر ہی بات چیت چل رہی ہے صوف سگھانیا نے باہر ممالک کے
 کپڑوں کا آرڈر دیا ہے وہ کچھ ایمر ایڈری سوٹ کے سہیل کل بھجوائے گا۔“
 ”کتنے بجے؟“

”صبح بارہ بجے کے قریب۔“
 ”امبرین پلیز ایک کپ چائے مل جائے گی؟“ عفان ترمذی نے ساتھ بیٹھی امبرین سے درخواست کی تھی۔
 ”جی بہتر۔“ وہ سبکٹین حیدر ترمذی پر ایک نظر ڈالتی کھڑی ہو گئیں۔
 ”اوکے میں انشاء اللہ پیچ جاؤں گا۔“ اس کے انداز سے سگھن ظاہر ہو رہی تھی۔
 ”چلو ٹھیک ہے ابھی تم آرام کرو کل آفس میں ملاقات ہوتی ہے۔“ سبکٹین حیدر ترمذی دھیرے سے مسکرا دیا
 اور ٹیبل سے اپنا فون اٹھایا اور اپنے بیڈروم کی جانب چل دیا تھا، عفان ترمذی بھی کھانے کی ٹیبل سے کھڑے
 ہو گئے تھے۔

”لیجئے چائے۔“ امبرین چائے کے دھگ لے کر ٹی وی لارنچ میں آ گئیں۔
 ”تھینکس۔“ عفان ترمذی نے گرم چائے کا گ اٹھالیا تھا، امبرین نے بھی اپنا گ اٹھالیا اور وہیں قریبی
 صوف پر بیٹھ گئیں۔
 ”آپ نے سبکٹین کو سمجھایا کیوں نہیں۔“

”کیونکہ ابھی سبکٹین بہت تھکا ہوا تھا، کل آفس آئے گا تو سمجھاؤں گا۔“ انہوں نے ایک گرم سپ لیا اور ٹیبل
 سے ٹی وی ریموٹ اٹھالیا۔ ٹی وی آن کر کے نیوز اپ ڈیٹ لگائی۔
 ”ہوں۔“ امبرین نے گردن اثبات میں ہلائی اور چائے پینے لگی تھیں۔

”کیا... اچھا! بہت زبردست نیوز دی ہے تم نے تو۔“ غنوی خوشی کے مارے تقریباً زور سے چیختی تھی۔ اس کی
 آواز اتنی بلند تھی کہ صوف پر سوتا سبکٹین حیدر ترمذی جو کہ بغیر فریش ہوئے ہی صوف پر لیٹ گیا تھا، تھکا ہوا اس
 قدر تھا کہ لیٹتے ساتھ ہی گہری نیند میں چلا گیا مگر غنوی کی زور کی آواز نے اس کی نیند میں خلل ڈالا تھا۔ اس کی
 نیند ٹوٹی تھی۔ اس نے گردن موڑ کے پیچھے دیکھا، بیڈ پر غنوی فون کان سے لگائے کسی سے بات کر رہی تھی۔ وہ
 جانتا تھا کہ غنوی کو زور زور سے بولنا پسند نہیں تھا اسی لئے اس کی آواز نہایت ہی مدہم تھی تو پھر اتنی چیخ کر بات
 کرنے کا مقصد۔

سبکٹین حیدر ترمذی نے چہرے پر کھن رکھ لیا۔
 ”ہاں... ہاں... میں تمہاری منگنی میں ضرور آؤں گی۔“
 ”غنوی! کیا ہو گیا ہے تمہیں، اتنی زور زور سے کیوں بات کر رہی ہو؟“ عازرہ کوٹو کناہی پڑا۔
 ”اور سنو، منگنی کی دہن میں ہی تمہیں بناؤں گی۔ بیوی پارلر سے تیار ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ غنوی تھوڑا
 آگے کھسک کے اور زور سے چیخ کے بولی تھی۔

سبکتگین حیدر ترمذی نے ذرا سا کٹن چہرے سے ہٹایا، نظر سامنے رکھے ٹی وی پر پڑی۔ ایل سی ڈی کی نفل اسکرین پر غنوی کا عکس صاف نظر آ رہا تھا، وہ جس طرح چیخ کے بات کر رہی تھی۔ بھلے ہی وہ اپنی دوست سے بات کر رہی تھی مگر اس کا رخ سبکتگین حیدر ترمذی کی جانب تھا۔

سبکتگین حیدر ترمذی کو یہ سمجھنے میں ذرا دیر نہیں لگی کہ غنوی کی پوری کوشش سبکتگین حیدر ترمذی کی نیند خراب کرنا تھی۔ اس کے عنائی گداز لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ رینگ گئی تھی۔

”اوکے.... اوکے.... تم ہی بنانا مجھے دہن.... مگر اس وقت تو لگ رہا تھا جیسے تم مجھے آج بہرہ کر کے ہی چھوڑو گی۔“ عازہ نے اپنا سیل فون اپنے کان سے دور ہٹایا تھا۔

”بکواس کرنے کی زیادہ ضرورت نہیں ہے، آئی سمجھ۔“

بالآخر سبکتگین حیدر ترمذی کھڑا ہو گیا۔ غنوی نے دیکھا تو اس کے دل کو ڈھیروں سکون ملا تھا۔ اس کی روح جیسے معطر معطر ہو گئی تھی۔ سبکتگین حیدر ترمذی کی نیند خراب کر کے اسے بہت خوشی ملی تھی مگر یہ کیا وہ اس کی طرف کیوں آ رہا تھا۔ ہاں شاید اب وہ غنوی کے ہاتھ سے موبائل چھینے کا غصہ کرے گا اس پر، زور زور سے چیخے گا اور پھر غنوی بدلے میں اس کو خوب کھری کھری سنائے گی۔ اس کو آئینہ دکھائے گی، طعنے نشے دے کر اس کو شرمندہ کرے گی۔

سبکتگین حیدر ترمذی کو اپنی طرف آتا دیکھ کر غنوی نے نفرت سے منہ ہی پھیر لیا تھا تو دوسری طرف فون پر عازہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھی جو غنوی کے قطعی اس وقت سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ سبکتگین حیدر ترمذی دھیرے دھیرے چلتا ہوا غنوی کے بالکل برابر میں بیٹھ گیا کہ انچ بھر کا فاصلہ بھی نہ رہا تھا۔ اس کا مضبوط اپنی بازو غنوی کے شانے سے بچ ہوا تھا۔ اس کے اس لمبے پر غنوی ہڑ ہڑا کر رہ گئی اور اس ہڑ ہڑاہٹ میں اس کا سیل فون نیچے کارپٹ پر گر گیا تھا، لائن ڈسکنکٹ ہو گئی تھی۔ غنوی تیزی سے اس کے برابر سے کھڑی ہوئی تھی۔

”یہ کیا بے ہودگی ہے، آپ کی ہمت بھی کیسے ہوئی میرے برابر میں بیٹھنے کی۔ ہزار دفعہ کہا ہے خبردار جو میرے برابر میں بیٹھے یا مجھ سے بچ ہونے کی کوشش بھی کی تو.... آپ کی سمجھ میں نہیں آتا۔“ غنوی غصے سے لال بھبھوکا ہو گئی تھی، غصہ تو جیسے اس کی شریانوں میں دوڑ رہا تھا۔ بس نہیں چل رہا تھا اس کا سنات، اس سر زمین سے سامنے بیٹھے اس شخص کی ہستی منادے، اس کی دھجیاں بکھیر دے۔ اس کا ریشہ ریشہ الگ کر دے۔ اتنی شدید نفرت کرتی تھی وہ سبکتگین حیدر ترمذی سے۔

اس وقت بھی اس کا اس طرح سے بچ ہونا اس کو شدید برا لگا تھا۔ وہ انگشت شہادت اٹھا کے اس کو اور ننگ دے رہی تھی مگر سبکتگین حیدر ترمذی کا تو انداز ہی الگ تھا۔ وہ جو اس قدر تھکا ہوا آیا تھا اس کے ایک ایک عضو سے تھکاوٹ جھلک رہی تھی۔ آنکھوں میں نیند کا غبار تھا مگر اس وقت تو اس کے تھکاوٹ زدہ چہرے پر خوب بشارت تھی، ذہین آنکھوں میں ایک عجیب ہی چمک تھی، عجیب ہی چھب تھی اور غنوی کو تو یہ سب الٹا ہی نظر آ رہا تھا۔ اس نے کیا سوچا تھا اور کیا ہوا تھا، سبکتگین حیدر ترمذی اتنا پرسکون اور مطمئن کیسے ہو سکتا ہے، سبکتگین حیدر ترمذی نے غنوی کی نازک سی انگلی پکڑ لی اور اپنی سمت کھینچی تھی۔ وہ بھلا نازک سی کیسے اس پہاڑ جیسے اسٹون مین کی طاقت کا وارہتی۔ اس کی طرف کھینچی چلی آئی اور اس کی آغوش میں آگری۔ سبکتگین حیدر ترمذی نے اس کی نازک سی کمر کے گرد اپنی محبت کا مضبوط حصار بچھ لیا کہ وہ ٹپ کے رہ گئی۔

”اچھا الگ.... بلکہ بہت اچھا کہ تمہاری آواز تو میرے بیدار میں گونجی، چاہے کسی بہانے سے... سچ ترس گیا

تھا اس سے ملی آواز کو سننے کے لئے، کوئی بات ہی نہیں کرتی ہو مجھ سے۔“
 ”سبکدوش چھوڑنے مجھے، ورنہ میں آپ کو جان سے مار دوں گی۔“ وہ اس کی مضبوط گرفت سے نکلنے کے لئے
 بھرپور کوشش کر رہی تھی، ہاتھ پیر چلا رہی تھی اور اسی ہاتھ پیر چلانے میں اس نے اپنا لمبا نوکیلا ناخن اس کے
 چہرے پر مار دیا تھا۔

”آہ!“ واراں قدر زوردار تھا کہ سبکدوش حیدر ترمذی نے گرفت ڈھیلی کی اور موقع سے فائدہ اٹھا کے غنویٰ اس
 سے دور جا کھڑی ہوئی۔ سبکدوش حیدر ترمذی نے اپنے گال پر ہاتھ رکھا، وہاں ایک گہری سی کھر وچ آگئی تھی، جلن
 محسوس ہو رہی تھی۔

”یارت تم تو بڑی ظالم بیوی ہو۔“ سبکدوش حیدر ترمذی کھڑا ہو گیا تھا۔
 ”مجھ سے دور رہ کر بات کیا کریں اور ابھی تو معمولی سی کھر وچ ہے صرف، میں آپ کا یہ پورا چہرہ بگاڑ دوں
 گی۔“ معصوم سے چہرے پر غم و شدت کے مارے سرخی آگئی تھی۔

وہ دلکشی سے مسکراتا ہوا اس کی جانب بڑھا اور ایک ہاتھ بڑھا کہ اس کی نازک سی کلائی جو کھینچی تو وہ کسی نازک
 سی شاخ کی طرح اس کے پہاڑ جیسے وجود کا حصہ بنی تھی۔ سبکدوش حیدر ترمذی نے ایک بار پھر سے اس کی نازک
 کمر کے گرد اپنی گرفت کا گھیراؤ تنگ کیا تھا۔

”کب تک مجھے خود سے دور رکھو گی۔ تین ماہ کا عرصہ گزر گیا ہے، تمہیں میرے صبر، میری برداشت پر ترس نہیں
 آتا۔ میں تمہیں دیوانوں کی طرح چاہتا ہوں، والہانہ پیار کر کے اپنی محبت و چاہت کا یقین دلانا چاہتا ہوں۔“ وہ
 ان مغرور آنکھوں میں تادیر تک اپنا انگلیں دیکھتا رہا تھا۔ وہ ان مغرور آنکھوں میں اپنا ایک جہاں آباد کرنا چاہتا تھا،
 سینے بسا ناچا ہوتا تھا، اپنے پیار کے دیپ جلاتا چاہتا تھا۔

”کیسے... کیسے معاف کرو گی غنویٰ؟“
 ”قیامت تک نہیں۔“ غنویٰ نے پوری جان و طاقت سے اس کے عریض سینے پر اپنی دونوں تھیلیاں رکھیں
 اور جھٹکے سے سبکدوش حیدر ترمذی کو خود سے الگ کیا تھا۔

”میرے دل میں آپ کے لئے کوئی جگہ نہیں، کسی قسم کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔ میرے دل میں نہ ہی تو آپ
 کے لئے کوئی احساسات ہیں اور نہ ہی کسی کوئی جذبات پیئیں گے۔ اس دل میں آپ کے لئے نفرت، شدید ترین
 نفرت کے علاوہ کچھ نہیں۔“ غنویٰ کی مغرور آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں نکلنے لگی تھیں کہ مقابل کو جیسے جلا کے
 خاکستر ہی تو کر دیں گی۔

مگر سامنے بھی سبکدوش حیدر ترمذی کھڑا تھا، صبر و استقامت، ہمت و تحمل سے کام لینے والا، ٹھنڈے دل و دماغ
 سے سونے والا۔ غنویٰ کا بے انتہا غصہ، شدید ترین نفرت کو وہ ایک میٹھے ٹھونٹ کی طرح بلی گیا تھا۔

سبکدوش حیدر ترمذی نے ایک پرسکون ٹھنڈا سانس لیا اور شوخ نظروں سے اس کے غصے سے لال ہوتے
 چہرے کو بغور نکٹا تھا۔

”آل رائٹ مسز غنویٰ سبکدوش... تم مجھ سے نفرت، شدید ترین نفرت کئے جاؤ مگر میرے دل میں تمہارے
 لئے محبت، جنون، عشق میں اضافہ ہی ہوتا رہے گا جس میں تم بھی کی نہیں پاؤ گی۔“

”ہونہہ۔“ اس نے بے رحمی اور بے حسی سے منہ ہی پھیر لیا تھا۔
 ”اینی ویز... اب میری نیند تو تم خراب کر رہی چکی ہو، ابھی کچھ ہی دیر میں رجا صدیقی سے ملنے جانا ہے، چلو تم

بھی چلو، تھوڑا انجوائے ہی ہو جائے گا۔“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، آپ کے ساتھ ایک قدم بھی چلتی ہوں تو میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ اس چھت کے نیچے آپ کے ساتھ رہنا میری مجبوری ہے مگر یہ مجبوری تادیر نہیں رہے گی۔ آپ کے ساتھ انجوائے کرنے سے بہتر ہے میں پھانسی پر لٹک جاؤں، اس رشتے کو نبھانا فی الحال ضروری ہے مگر آپ یہ مت سمجھئے گا آپ میری ضرورت ہیں آپ میرے کچھ بھی نہیں۔“

سبکدستی حیدر ترمذی ہولے سے ہٹا اور گردن کوئی میں ادھر ادھر ہلاتا چلا گیا، سبکدستی حیدر ترمذی کی ہنسی نے غنویٰ کا مزید دل جلایا تھا، وہ سرتاپا سلگ کے رہ گئی تھی۔ بالآخر خود ہی پیر بختی وہاں سے چلی گئی تھی۔

”ایک وقت آئے گا غنویٰ کہ میں ہی تمہارا سب کچھ ہوں گا۔ ایک وقت آئے گا اور مجھے اس وقت کا شدت سے انتظار ہے۔“

ان ذہن آنکھوں میں غنویٰ کے لئے ڈھیروں پیارا اور چاہت روشن تھی۔ اس کے عنانی گداز ہونٹوں پر زندگی سے بھرپور مسکراہٹ رہتی تھی۔ اس نے اپنے دل کو سمجھا لیا تھا کہ یہ ایک کڑی آزمائش مشکل امتحان ہے مگر ناممکن کچھ بھی نہیں۔



اجیارہ اور بلیقے آراء کھانا کھا کے کچھ دیر لیٹ گئی تھیں، راشن سوچا تھوڑی دیر میں رکھ لیں گی۔ دروازے پر دستک ہوئی، اجیارہ نے دوپٹہ صبح سے ٹھیک کیا اور دروازے کے پاس آئی تھی، سامنے ہی شہیر اور دعا کھڑے تھے۔

”السلام علیکم.....! شہیر بھایا، دعا بھابی۔“

اس کے چہرے پر خوشی اٹھ اٹھی تھی۔

”وعلیکم السلام؟“ شہیر نے تو جواب دے دیا مگر دعا نے سلام کا جواب دینا بھی ضروری نہیں سمجھا۔

”اندر آئیے نا۔“ وہ دروازے کے پاس سے ہی تھی تو دونوں اندر داخل ہوئے۔

”کون آیا ہے اجیارہ بیٹی؟“ بلیقے آراء کی آواز آئی۔ شہیر اور دعا کمرے میں ہی آگئے جہاں بلیقے آراء بیٹھی تھیں۔

”السلام علیکم اماں! کیسی ہیں آپ؟“ شہیر وہیں پڑی چیئر پر بیٹھ گیا تو اندر سے اجیارہ بھاگ کے ایک اور کرسی لے آئی اور دعا کے سامنے رکھ دی۔ دعا تو ایسے شاہانہ انداز سے بھی جیسے کسی ڈیفنس یا بڑے بنگلے سے آئی ہو۔ مزاج، طور طریقے ہی بدل گئے تھے۔

”تین ماہ بعد خیال آیا ہے اماں کا کہ خیریت پتہ کرلو، خیر وعلیکم السلام۔ میں ٹھیک ہوں، اللہ کا شکر ہے۔“

بلیقے آراء جاہتی نہیں تھیں کہ طنز کریں مگر نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی زبان سے شکوہ پھسل گیا تھا۔ دعا تو پہلو ہی بدل کے رہ گئی۔

”ظاہر ہی بات ہے اماں، ان کے آفس میں نیا بزنس شروع ہوا ہے تو کام کا بزنس بھی بڑھ گیا ہے اور پر سے میری بھی ذمہ داری ہر ہفتے ڈاکٹر کے پاس چیک اپ کرانے جانا۔ اب اتنے فالتو بھی نہیں۔“ دعا خاموش نہیں رہی، ترخ کے بولی تھی۔

”ٹھیک کہتی ہو، شہیر پر بہت ذمہ داریاں ہیں سوائے ماں بہن کے۔“

”اماں چھوڑیں نا یہ شکوے گلے، شہیر بھایا اور دعا بھالی کتنے دنوں بعد آئے ہیں، شہیر بھایا آج رات کا کھانا ہمارے ساتھ ہی کھا لیجے گا۔“ اجیارہ کے دل میں کوئی شکوہ نگلے نہیں تھا۔ وہ ان کے گھر آنے پر بہت خوش تھی۔

”نہیں ہم کھانا کھا کے آئے ہیں۔“

”میرا تو خیال ہے آپ لوگوں نے کھانا کھا لیا ہے، بریانی کھائی ہے شاید اور مہینے بھر کا راشن بھی منگو لیا ہے۔“ دعا کے کہنے کا مقصد اجیارہ بھی نہیں تھی۔

”جی دعا بھالی! میں نے جاب ڈھونڈ لی ہے، آج ایڈوانس ملا تو میں نے کچن کا سارا راشن لے لیا اور بریانی بھی لے آئی۔“

”تم تو کڑی کرو گی اب؟“ شہیر بھایا نے تھوڑا ناگوار ہو کر کہا تھا اور دعا، شہیر کی ناگواریت کو بھانپ گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ اس کے پیسوں کا نقصان ہو تا وہ جلدی سے بولی تھی۔

”ہاں... تو اچھی بات ہے نا، گھر میں بیٹھے بیٹھے بور ہی ہوتی ہو گی اور پھر جب تعلیم حاصل کی ہے تو اس کو گھن کیوں لگتا۔“ اس نے بلیقے آراء اور اجیارہ کو دیکھنے کے بعد شہیر کو آنکھیں دکھائیں۔

”جی...!“ اجیارہ تو دعا کی شکل ہی دیکھتی رہ گئی، اس کا دل دکھا تھا، کیسا بھائی ہے اس کا، ایک بہن ایک ماں نہیں سنبھال سکتا۔

”شہیر چلیں، امی کی طرف بھی جانا ہے اور ماہ نور اس کے شوہر کو بھی تو دعوت دینی ہے۔“ دعا کھڑی ہو گئی، وہ نہیں چاہتی تھی کہ ماں بہن کی مظلوم صورت دیکھ کر وہ پکھل جائے۔

”دعا بھالی! ابھی تو آئے ہیں آپ لوگ، اپنی جلدی جارہے ہیں۔“

”ہاں تو کام بھی تو کتنے نمٹا ہے۔ خیر وہ تو ہو ہی جائیں گے، کوئی مشکل بھی نہیں ہے۔“

اس کی زبان سے جو پہلا جملہ جلد بازی میں نکل گیا تھا، کہیں ایسا نہ ہو کہ اجیارہ آنے کا بول دے کہ میں آ جاؤں گی، اس لئے جلدی سے دوسرا جملہ بول کے جان چھڑائی۔ اب اتنی مشکل ہے تو ان ماں بیٹی سے جان چھڑائی ہے پھر سے گلے میں طوق کی طرح نہیں لگانا چاہتی تھی، اپنی خوشگوار اور پرسکون زندگی میں ان دونوں کو شامل نہیں کرنا چاہتی تھی۔

دعا نے آرام سے بیٹھے شہیر کو کندھے سے بلایا، شہیر نے دعا کو دیکھا۔

”چلیں بھی۔“ اس نے ایک سر دسائے لیا اور کھڑا ہو گیا۔

”اچھا اماں! اب ہم چلتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے بیٹا جاؤ، اللہ تمہیں تمہاری خوشیوں میں خوش اور آباد رکھے۔“ بلیقے آراء کے لب و لہجے میں ایک کسک تھی، رد ہاں سنا نہیں تھا، آنکھوں میں ہلکی سی نمی تھی جو شہیر سے گایا نہیں دیکھ پا رہا تھا۔

دونوں جانے لگے کہ شہیر واپس پلٹا۔ ”ارے ہاں، میں تو بھول ہی گیا۔“

شہیر نے اپنی جینز کے پاکٹ سے ایک لفافہ نکالنا چاہا کہ دعا نے اس کا ہاتھ روک دیا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے سے منع کیا اور پلنگ پر رکھا ڈھیر سا رامیدہ بھر کا راشن کی طرف توجہ مبذول کرائی۔

”ہاں بولو، کس کام سے آئے تھے پندرہ منٹ کے لئے؟“ بالآخر بلیقے آراء نے پھر طنز کا تیر چلایا، شہیر کا جب میں ہاتھ ڈال کر کچھ نکالنا اور جلدی سے دعا کا اس کا ہاتھ پکڑنا، وہ اتنی سمجھ تو نہیں تھیں کہ سمجھ نہیں پاتیں۔

”نن... نہیں کچھ نہیں...“ شہیر نے ہاتھ واپس نکال لیا تھا۔ ”ہم پھر آئیں گے۔“ یہ کہہ کر دونوں گھر سے باہر

نکل گئے۔

جو چیز بلیقے آراء نے نوٹ کی تھی وہی اجیارہ نے نوٹ کر لی تھی، اس کا دل بھی بہت دکھتا تھا بلیقے آراء کی طرح مگر اپنا دکھ اور درد بلیقے آراء پر ظاہر کر کے انہیں مزید تکلیف نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو گرے اور دوپٹے میں جذب ہو گئے۔

”میں جلدی سے یہ راشن کچن میں رکھ آؤں۔“ اجیارہ نے پلنگ سے شاہزائے اور کچن کی جانب چل دی۔ بلیقے آراء کی آنکھوں سے گرم سیال گرے تھے۔ ایک ہی بیٹا تھا اس نے بھی ایسا رنگ بدلا کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔ ایسی ہی دکھ بھری سوچیں سوچتی ہوئی وہ عشاء کی نماز کے لئے اٹھ گئیں۔

”دعا یہ کیا حرکت تھی، تم نے مجھے لفافہ کیوں نہیں دیئے دیا، تین ماہ ہو گئے تھے مجھے اماں کو پیسے دیئے ہوئے، یہ پندرہ ہزار میں اماں کو دینے ہی تو آیا تھا۔“ شہیر کو جھنجھلاہٹ سی ہونے لگی تھی۔
”لامیں یہ پندرہ ہزار مجھے دیں۔“ اس نے شہیر کے آگے ہاتھ پھیلا دیا، شہیر نے ناسمجھی کیفیت میں اس کا خالی ہاتھ دیکھا۔

”ارے دیں نا۔۔۔!“ اس نے جیب سے نکال کے وہ پندرہ ہزار والا لفافہ اس کے خالی ہاتھ پر رکھ دیا تھا۔
”اتنی بھاری رقم دینے جا رہے تھے آپ انہیں، دیکھ نہیں رہے تھے کہ کیا کیا مڑے چل رہے ہیں اماں اور اجیارہ کے۔ برائی کھا لی جا رہی ہے، اینڈ ایم شیور فرج میں یقیناً کولڈ ڈرنک بھی رکھی ہوگی اور تو اور مہینہ بھر کا کتنا ڈھیر سارا راشن بھی رکھا ہوا تھا، وہ سب آپ نے نہیں دیکھا تھا۔“
”ہاں تو وہ بتا رہی تھی نا کہ آج ہی جاب ملی ہے، ایڈوائس ملا ہے۔“

”کیسے کہہ سکتے ہیں آپ، ہو سکتا ہے جھوٹ ہو۔“
”جو بھی ہے مگر مجھے اجیارہ کا باہر نکلنا، جاب کرنا سخت ناگوار گزرا ہے۔“ شہیر نے اپنے دل کی بات کی تھی۔
”آپ کا تو ہو گیا ہے دماغ خراب، کیوں ناگوار گزرا ہے بھلا، اچھا ہے نا اپنا جو خود اٹھائیں اور رہے یہ پیسے تو میں ان پیسوں سے اپنے بچے کے روم کے لئے بہت ساری چیزیں خرید سکتی ہوں۔ شہیر ہم اپنی فیملی شروع کرنے والے ہیں، اپنے ہونے والے بچے کے لئے ڈھیر ساری شاپنگ کرنی ہے۔ کھلونے، کپڑے بہت سی چیزیں یعنی ہیں اور اس کے اچھے مستقبل کے لئے بہت سی شاپنگ بھی تو کرنی ہے۔ میں تو کہہ دیتی ہوں ایک لاکھ کا فکس ڈپازٹ کرنا ہے آپ کو میرے بچے کے لئے۔“ اس نے فروٹھے پن سے کہا تھا۔

”ہاں ہاں، کیوں نہیں، ٹھیک کہتی ہوتی۔ میں سب سے پہلے کس ڈپازٹ کرواؤں گا۔“
دعا نے بڑی چالاکی و ہوشیاری سے شہیر کا رخ بلیقے آراء اور اجیارہ کی جانب سے ہٹا کے اپنے اور اپنے بچے کی جانب لگا دیا تھا۔

☆.....☆

دوسرے دن صبح ٹھیک دس بجے وہ آفس پہنچ گئی تھی۔
”اجیارہ آپ کو اندر سر ملارہے ہیں۔“ منیجر نے خوش اخلاقی سے کہا تھا۔
”جی!“ اجیارہ سر کے آفس میں اجازت لے کر اندر آ گئی تھی۔
”جی تو مس اجیارہ، آپ ریڈی ہیں؟“ چوہدری قیصر عسکری نے سامنے کھڑی اس نازک اندام سی لڑکی کو

دیکھا۔

”آل رائٹ، آپ کو صرف چار گھنٹے سنی میرے نواسے کو دینے ہوں گے۔ سنی اسکول سے ٹھیک ایک بجے آجاتے ہیں۔“

”مگر سر! اس وقت سے آپ کے گھر جانا مناسب رہے گا۔“ وہ کنفوز ہو گئی تھی۔

”آپ نے میری پوری بات نہیں سنی۔“ چوہدری قیصر عسکری کو کچھ ناگوار لگا تھا جو اجیارہ نے نوٹ بھی کر لیا تھا۔

”سوری سر!“ وہ شرمندگی سے سر کو جھکا گئی۔

”آپ یہاں اس آفس میں دس بجے سے ٹھیک ایک بجے تک جاب کریں گی، پھر میرا ڈرائیور آپ کو عسکری والا چھوڑ دے گا، وہاں سے آپ پانچ بجے تک اپنے گھر جاسکتی ہیں۔“

یہ جاب اسے بالکل ٹھیک لگی۔ اماں کے بہت سے سوالوں سے بچ جانے کی۔

”اپنی پراہلم؟“ چوہدری قیصر عسکری نے اس کو گہری سوچوں سے باہر نکالا۔

”جی...!“ وہ چونک کر دیکھنے لگی۔

”نوسر! کوئی پراہلم نہیں ہے۔“

”تو ٹھیک ہے ابھی تو آپ کو منیجر کام سمجھا دیں گے، وہ کیجیے، پھر ایک بجے تک ڈرائیور کے ساتھ نکل جائیے گا۔“

”اوکے سر!“

چوہدری قیصر عسکری نے منیجر کو فون کر کے اندر بلایا۔ اجیارہ منیجر کے ساتھ اپنے کیمین میں جانے لگی کہ چوہدری قیصر عسکری نے ایک بار پھر پکارا۔

”نیس سر!“ اجیارہ نے پلٹ کر دیکھا۔ ساتھ منیجر بھی رک گیا تھا۔

”یہ لیجیے، یہ دو لفافے ہیں، ایک میں ابراہن کی تصویر ہے اور دوسرے میں آپ کی بقیہیلری۔“ چوہدری قیصر عسکری نے دونوں لفافے اجیارہ کی جانب بڑھائے جو اجیارہ نے کچھ جھجکتے ہوئے ہاتھ بڑھا کے تھام لئے تھے۔

منیجر اجیارہ کو لے کر اس کے کیمین میں آگیا تھا، اس کو کچھ کام سمجھایا اور ایک فائل بھی دے دی کہ اس کو مکمل کرنا ہے۔ منیجر جا چکا تھا۔ اجیارہ نے فائل کھولی، کام زیادہ مشکل نہیں تھا، وہ کمپیوٹر پر جھک گئی تھی، ٹیبل پر رکھے دو لفافوں پر اس کی نظر پڑی، اس نے کی بورڈ چھوڑ کے دونوں لفافے اٹھالیے تھے۔ ایک میں بقیہیلری ہزار ہیلری تھی جو اس نے واپس ٹیبل پر رکھ دیا۔ دوسرے لفافے میں تصویر تھی۔ اجیارہ نے لفافہ کھولا اور ابراہن عسکری کی تصویر نکالی۔ جیسے ہی نظر ابراہن عسکری کے چہرے پر پڑی، تصویر اس کے ہاتھ سے خود بخود نیچے اس کی گود میں گر گئی۔ چہرہ اس قدر بھیانک اور ٹھسلا ہوا تھا، اجیارہ کا دل خوف سے سمٹ کر رہ گیا۔ آنکھیں دوہشت سے پھیل گئی تھیں۔ چہرہ پسینے سے شرابور ہو گیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے تو وہ پوری جان سے لرز کے رہ گئی تھی، جب تصویر میں دیکھنے سے یہ کیفیت ہے تو آئے سامنے دیکھے تو کیا ہوگا۔

”ادھ مائی گاڈ کہیں کسی مشکل میں تو نہیں پھنس گئی میں۔ ایک لمحے کے لئے تصویر میں نہیں دیکھ پائی تو چار گھنٹے کیسے اس کے سامنے رہ پاؤں گی۔“ اجیارہ کی سوچیں خوف کے مارے سکڑنے پھیلنے لگی تھیں۔

”تصویر دینے کا مقصد صرف یہ ہے کہ کسی کو جتنی بھی ٹیوٹر پڑھانے آئے وہ سب خوفزدہ ہو کر ڈر کر کچھ ابراہن

عسکری کے بے انتہا غصے جلال کو دیکھ کر لمحہ بھر کو نہیں رکی ہیں اور ان سب کا نتیجہ یہ نکلا کہ ابراش مزید اپنے خول میں بند ہوتا چلا گیا، باہر کی دنیا سے بالکل لائق ہو گیا۔“

چوہدری قیصر عسکری کی باتیں اس کے آس پاس گونجنے لگی تھیں۔

ابراش عسکری کی تصویر جو اجیارہ کی گود میں اتنی بڑی بھی ڈرتے ڈرتے اس نے وہ تصویر اٹھائی۔

”تم یہ تصویر دیکھ لو گی تو ابراش عسکری کو قیصر کرنے میں مشکل درکار نہیں ہوگی۔“

اجیارہ نے ابراش عسکری کی تصویر دیکھی، ایک پل کو تو دل سے آواز آئی کہ اجیارہ چھوڑ مت جا، جب یہ شخص تصویر میں ہی اس قدر بد شکل، بھیانک، ڈراؤنا لگ رہا ہے تو حقیقت میں دیکھنے میں کیسا ہوگا۔ کہیں میرا ہارٹ فیل ہی نہ ہو جائے۔۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ اگر یہ جاب بھی چھوڑ دی تو گھر کی پریشانیوں، مشکلات، مالی حالت۔۔۔۔۔ کون حل کرے گا۔ کل شہیر اور دو کا بھی وہ بی بیویر دیکھ چکی تھی، جس طرح مہمانوں کی طرح وہ لوگ آئے، انجان اجیبی لوگوں کی طرح بات چیت کی۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ وہ اپنا رگا بھائی، بیٹا ہے اور کیا اس نے دیکھا نہیں تھا کیسے دعائے شہیر بھائی کو پیسے دینے سے اشارے میں ہی منع کر دیا تھا۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ اسے کسی بھی طرح یہ نوکری کرنی ہے، ہر حالت، ہر صورت میں اس کو یہ نوکری کرنی ہے۔ وہ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلانے گی۔“

ایسی ہی لکٹی کڑوی زہریلی سوچوں میں وہ منہمک رہتی کہ چوہدری قیصر عسکری کا ڈرائیور چلا آیا تھا۔ ”میڈم چلیں، ایک بچ گئے ہیں!“

”ہاں۔۔۔۔۔ آں۔۔۔۔۔“ اجیارہ بری طرح چونک کر رہ گئی بلکہ یوں کہنا زیادہ آسان ہو گا وہ ڈر کر رہ گئی تھی۔

”میڈم! سر چوہدری کے گھر چلیں؟“ ڈرائیور شاید اس کا چونکا ڈرنا سمجھ چکا تھا اس لئے ایک بار پھر اس نے اپنا جملہ دہرایا۔

”جی۔۔۔۔۔ چلیں۔۔۔۔۔“ بے ترتیب دھڑکنوں کو قابو میں کرتی وہ دونوں لفافے فی بیک میں ڈالتی کھڑی ہو گئی، اس وقت اس کی ضرورت پیسہ بھی۔۔۔۔۔ جسے وہ اپنے ڈرونگف کی نذر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

کوئی پندرہ منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد وہ ”عسکری ولا“ پہنچی تھی۔ چونکدارنے دروازہ کھول دیا تھا۔

”میڈم!“ اجیارہ گاڑی سے نیچے اترنے لگی کہ ڈرائیور نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔

”جی!“ اجیارہ کے ہاتھ گاڑی کے دروازے پر رک گئے۔

”میں آپ کو پانچ بجے تک آپ کے گھر ڈراپ کر دوں گا۔“

”نہیں، آپ پلیز اس کی زحمت مت کیجئے، وہ میں خود ہی چلی جاؤں گی۔“ اجیارہ نے آرام سے کہا اور گاڑی سے نیچے اتر گئی۔

اجیارہ اندر داخل ہوئی، یہ بڑا ہرا بھرا لان، خوبصورت سے پودے، پھول اور کچھ شاید پھلوں کے درخت بھی تھے۔ اس چلیلاتی دھوپ میں وہاں مالی بیٹھا کھدائی کر رہا تھا۔ وہیں بڑا سا گیراج جہاں دو تین قسم کی چیمپانی لٹکائے مارنی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ایک دو تو زیر زمین مائل کی بائیک بھی کھڑی تھیں۔

”اللہ تعالیٰ بھی نابعض لوگوں کو کس قدر نوازتا ہے۔“ اسے اس پل شدت سے اپنی احساس محرومی کا احساس جاگا تھا۔ پھر اپنی سوچ کو جھٹکتی وہ آگے بڑھی، کوریڈر کے دروازے پر نیل دی، دروازہ کھول دیا، وہ دیر کے بعد کھل چکا تھا۔ دروازہ ایک پیاری سی لڑکی نے کھولا تھا۔

(جاری ہے)

گلشنِ بہارِ اربعہ

پھر عید کی گہما گہما، تہتے باتوں کی جلتے رنگ فضاؤں میں گونج رہی تھی۔ ماحول میں نور و سرور کی کیفیتیں اجاگر ہو گئی تھیں۔ ہر شخص کا چہرہ اور آنکھیں عید اور اس کے اہتمام کے تصور سے جگمگا رہی تھیں۔ انسان خواہ کتنے ہی صدمات اور مشکلات سے کیوں نہ گزرا ہو مگر ادھر رمضان المبارک کا چاند طلوع ہوا اور دل نے گواہی دی کہ اب وہ مالک و خالق اپنے کرم اور فیضان کے لمحے اور قبولیت کے دروازے کھولنے والا ہے اور



ہمارے اندر غم و خوشی کے جھکڑ ایک ساتھ چلنے لگتے ہیں۔ عجیب متضاد کیفیت ہوتی ہے۔ کبھی رونے کو جی چاہتا ہے کبھی ہنسنے کو۔ بھی دل کرتا ہے سبجے بجائے کمرے، ترتیب سے رکھی ہوئی چیزیں الٹ پلٹ کر دے، توڑ ڈالے، اٹھا کر باہر پھینک دے، اجاڑ دے، ہنس نہس کر ڈالے اور کبھی جی لپک کر چاہتا کہ یہ فرش پر بکھری ہوئی شیشے کی کرچیاں اپنی پلکوں سے چن لے اور اتنے خوب صورت فرش پر نفاست سے لگی چمکتی دمکتی نائلوں کا چہرہ اپنے سبک ریشمی آچل سے صاف کر کے ایک خوب صورت گلدستہ بنا کر میز پر سجادے۔

یہ کیا پاگل پن تھا۔ ہاں یہ پاگل پن ہی تو تھا۔ جب اندر اور باہر کے موسم متضاد ہوں تو شاید ایسا ہی ہوتا ہے۔ آویز بھی انہی متضاد اور بدلتے حالات کا شکار تھی کہ چار سال سے اس پر اسی قسم کی وارداتیں گزر رہی تھیں۔ جب بھی اسے ابسام کی لا پرواہیاں، اپنی قربانیاں، خدشتیں اور محبتیں یاد آتیں وہ چیخ پڑتی۔

مکمل ناول



”نہیں، نہیں ابسام! میں آپ کو سزا دینا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے تو کبھی ایسا نہیں سوچا تھا۔“ وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر چکیاں لینے لگتی۔ بہن اسے گلے سے لگا کر سمجھانے لگتی۔

”چپ ہو جاؤ میری بہن ہر رات کے بعد دن ضرور آتا ہے۔ خواہ وہ رات کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو۔ ابسام ضرور آئے گا وہ تم سے ناراض نہیں شرمندہ ہے۔“ مگر آج چار سال ہونے کو آئے اس نے اپنی شکل دکھائی نہ کوئی سند یہ آیا۔ جانے کتنے موسم آئے۔ کتنے گئے غم و خوشی کی ہوائیں جلیں۔ کتنی عیدیں، کتنے دن، ہستے روتے گزر گئے مگر ابسام نہیں آیا البتہ اس کے دو تین فون ضرور وقفے وقفے سے آئے جو بہت دیر بعد آئے تھے۔ اس میں اس نے اپنی نیک تمناؤں اور محبتوں کا اظہار کیا تھا لیکن اس نے اپنا کوئی اتانا نہیں بتایا تھا۔ اپنے آنے کے متعلق بھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ سخت کشش میں مبتلا تھی۔

نہ آتے ہیں، نہ ناراض ہیں، نہ ملنے کی بیہ تالی، نہ جدائی کا غم آخر یہ سب کیا تھا؟ اس کی وجہ اس کی ماں تھی جو ہر لمحہ سائے کی طرح اس پر چھائی رہتی تھی۔ پچیس سال تک وہ اس کی انگلی پکڑ کر چلتا رہا۔ اسی لیے اس میں خود اعتمادی نہیں تھی۔ ایک فطری جھجک اس پر طاری رہتی تھی۔ تھوڑا بزدل بھی تھا۔ ہر بات ہر کام کرنے سے ڈرتا کہ کہیں یہ غلط نہ ہو جائے یہ ہی وجہ تھی کہ اس کی کوئی گید رنگ بھی نہ مصروفیت۔ زیادہ تر وہ گھر میں رہتا تھا۔ اچانک آویز کی سوچوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔

جب چھوٹے بھائی نے اس کی ساس کے آنے کی خبر اسے دی تھی۔ نیسہ بیگم ایک تکلیف دہ سوال کے ساتھ آئیں تھیں۔ اس سے گھر چلنے کا اصرار کرتیں اور پوچھتیں۔ ”بتاؤ تم نے میرے بیٹے کو کہاں چھپا دیا ہے۔ کس ملک کی خاک چھاننے بھیجا ہے۔ خدا کے لیے اسے بلا لو، اب جو کچھ تم کہو گی۔ وہی میں کروں گی مگر میرے بیٹے کو مجھ سے ملا دو۔ دیکھو میں اس کی ماں ہوں جیسے یہ بیٹا۔“ انہوں نے لپک کر اپنے ڈھائی سالہ پوتے کو گود میں اٹھالیا اور پیار کر کے بولیں۔

”تم اس بچے کی ماں ہو اگر یہ تمہاری نگاہوں سے اوجھل ہو جائے تو بتاؤ تمہارے دل پر کیا گزرے گی۔ یہ تو ابھی ڈھائی سال کا ہے تم نے جو بھی اس کی پیدائش اور پرورش میں دکھا اٹھائے ہیں اس کا حصہ تو بہت مختصر ہے مگر میرا ابسام تو پورے اٹھائیس سال کا ہے۔ وہ میرا سب سے چھوٹا اور بے حد لاڈلا بیٹا ہے۔ بہو میری سالیس اس سے جڑی ہوئی ہیں، میں نے اس کے لیے بڑا دکھ بھلا ہے وہ بیمار تھا ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا مگر میں دیوانوں کی طرح اسے لیے لیے پھری کوئی پیر کوئی فقیر کوئی ڈاکٹر نہیں چھوڑا۔ وہ ٹھیک ہو گیا۔ خدا نے مجھے اس کی جوانی اور اس کی خوشیاں دکھائیں مگر پھر وہ ایک دم غائب ہو گیا۔ میرا بچہ کہاں چلا گیا.....!“ وہ زار و قطار رو رہی تھیں پھر انہوں نے بہو کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

”یہ سچ ہے کہ اس کی محبت میں مجھ سے تمہاری حق تلفیاں کچھ زیادیتاں ہو گئی ہیں مگر اس میں مجھے تمہیں دکھ پہنچانا مقصود نہیں تھا۔“ انہوں نے آویز کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

”بہو! خدا راجھ سے ان تلخ لمحوں کا انتقام نہ لو اور میرے بیٹے کا پتا بتا دو۔“ وہ بلک بلک کر رو رہی تھیں۔ آویز دوڑ کر ان سے لپٹ گئی اور ان کے ہاتھوں کو تھام کر بولی۔ ”نہیں، نہیں امی! مجھے گناہ گار نہ کریں۔ مجھے آپ سے کوئی شکایت ہے نہ انتقام لے رہی ہوں میں۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ وہ کہاں ہیں، کس شہر، کس ملک۔ کس دیار میں اگر مجھے ان کا پتا ہوتا تو میں خود ان کے پاس چلی جانی یا بلا لیتی سسرال میں مجھ پر جو گزری گزار لی مگر شوہر کی جدائی ان کی چشم پوشی کا دکھ مجھ سے نہیں سہا جاتا۔ آپ کی طرح میں بھی دکھ کے سمندر میں

اتری ہاتھ ماؤں مار رہی ہوں مگر ساحل نہیں ملتا۔“ وہ ساس کا ہاتھ پکڑ کر رونے لگی۔
 آج پہلی بار انہیں بہو پر ترس بھی آیا اور ٹوٹ کر پیار بھی۔ انہوں نے اسے سینے سے لگا لیا۔
 ”اللہ تیرا سر کا سامن سلامت رکھے، سدا سہاگن رہے اور میری ممتا کو تسکین دے، کیا کروں انتظار
 لرتے آنکھیں پھرانے لگتی ہیں تو ایک موہوم سی امید لے کر یہاں آ جاتی ہوں کہ شاید اس کا کوئی پتا چل گیا
 ہو۔“

اتنا کہہ کر وہ اپنے آنسو بھی پونچھتیں اور بہو کے بھی، پھر اٹھ کر چلی جاتیں اور آویزاں کے شانے پر سر
 رکھ کر آنکھیں بند کر لیتی اور سوچنے لگتی شاید مکافات عمل شروع ہو چکا ہے۔ قدرت میری خاموشی اور صبر کا
 سلسلہ اس طرح دینا چاہتی ہے کہ میں احتجاج کے لیے اپنے لب نہ کھولوں اور حالات میرے مطابق خود ہموار
 ہوتے چلے جائیں مگر.....؟

”آخر اب سام روپوش ہو کر اپنا کون سا مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ پہلے اس نے ماں کی زیادتیوں اور نہ
 انصافیوں پر میرے تڑپنے کا تماشا دیکھا اور خاموش رہا اور پھر خود کو مجبور ظاہر کر کے میری محبتوں کا دم بھرتا رہا
 اور اب یوں دور جا کر اس نے اور بھی میرے گرد دیواریں کھڑی کر دی ہیں وہ ماں جس کی تابعداری میں
 اس نے بیوی کے حقوق پس پشت ڈال دیئے تھے۔ ہر لمحہ خوفزدہ رہتا کہ اگر ماں ناراض ہوگئی تو میری دین و
 دنیا دونوں برباد ہو جائے گی لیکن اب انہیں غم دے کر ان کی ممتا کا امتحان لے کر وہ اپنی کون سی عاقبت سنوار
 رہا ہے۔“

سوچے سوچتے آویز کا دماغ شل ہو جاتا مگر کوئی حل سمجھ بھی نہیں آتا۔



نسیہ علیم کے چار بچے تھے۔ شوہر سیدھے سادے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اللہ میاں کی گائے تھے جو کچھ
 کماتے بیوی کے ہاتھ پر لا کر رکھ دیتے تھے۔ ان کا بہت بڑا امپورٹ اسٹاپورٹ کا کاروبار تھا۔ شوہر سے
 زیادہ بیوی انتہائی تیز و طرار چالاک خاتون تھیں انہوں نے بڑے بیٹے بہوؤں کو علیحدہ کر دیا تھا۔ بیٹے بہو
 بھی یہی چاہتے تھے۔ بہوؤں نے اپنے شوہروں سے صاف کہہ دیا تھا کہ آپ یا تو اپنی تابعداری کروائیں یا
 اپنی ماں کی۔ ہم سے دو آقاؤں کی خدمت نہیں ہو سکتی۔ بات معقول تھی اس لیے وہ چپ ہو گئے۔
 نسیہ علیم بھی ان کے تیور بھانپ گئی تھیں۔ خاتون ہوشیار تھیں اس لیے بغیر کسی مزاحمت کے انہیں علیحدہ
 کر دیا۔ اسی میں انہوں نے اپنی عاقبت بھی۔ تیسری بیوان کی بھانجی شیبامی، بڑے الہڑ مزاج کی، اس سے
 نسیہ علیم دینی تھیں، اس پر وہ اپنا کوئی حکم نافذ نہ کر سکتی تھیں۔ بھانجی یعنی کے بیوان کے مقابلے میں بہت تیز
 طرار تھی۔ بیٹا بھی ماں کی نہیں بیوی کی سنتا تھا مگر اس کے باوجود انہوں نے اسے اپنے پاس ہی رکھا تھا اور وہ
 پورے گھر میں دندناتی پھرتی تھی۔ دو کمرے ہی نہیں جیسے پورا گھر اسی کا ہو، پھر سب سے چھوٹا بیٹا سام تھا۔
 جدھر چاہا گھماؤ گھوم جاتا تھا۔ دراصل وہ بچپن سے بیمار رہا تھا۔ بہت کمزور تھا۔ ماں سے بہت قریب تھا
 جو ان ہو جانے کے باوجود وہ اسے بچہ ہی سمجھتی تھیں۔ اس کا بچوں کی طرح خیال رکھتی تھیں، اس کی ہر ضد ہر
 فرمائش پوری کی جاتی، بڑی مشکل سے اس نے انٹر کیا۔ اسکول کالج جانے اور واپس لانے کے لیے انہوں
 نے ڈرائیور رکھا اور جب وہ سیر کے لیے نکلتا تو نوکر ساتھ ٹاؤل ہاتھ میں لیے اس کے پیچھے پیچھے چلتے جہاں
 اس کے ماتھے پر پسینہ چمکتا دیکھتے تو جھٹ ٹاؤل دے کر پسینہ صاف کرنے کو کہتے۔ اچھے نازخروں میں اس

کی پرورش ہوئی تھی۔ دوست بھی خاص نہیں تھے۔ وہ بھی کالج کے جو کبھی کبھی گھر آ جاتے تھے۔ تینوں بیٹے تو بقول ماں کے نافرمان نکلے تھے، اب ابسام رہ گیا تھا جو ان کی محبتوں کا محور تھا، شیمہ خالہ جان کا بڑا مذاق اڑاتی تھی کہتی۔ ”خالہ جان، شادی کر دیں اس چوڑے کی اب۔ یہ بڑا ہو گیا ہے بچہ نہیں رہا۔ بیوی آئے گی تو باقی کام وہ خود سنبھال لے گی۔“
وہ مسکرا کر آنکھیں گھما گھما کر خالہ کے ارد گرد چکر لگاتی اور کہتی۔ خالہ پہلو بدل کر رہ جاتیں۔ وہ جانتی تھیں کہ اس کے منہ لگنے سے اپنی عزت جائے گی۔

☆.....☆

آخر سب کے مجبور کرنے پر انہوں نے ابسام کی شادی کر دی۔ آویز کو انہوں نے پسند کیا تھا۔ وہ نازک، سرخ سفید خوب صورت اور کم گو لڑکی تھی چونکہ ان کے بچوں میں یہ آخری شادی تھی۔ اس لیے بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ دل کے ارمان بھی جی بھر کے نکالے گئے۔ بھائیوں بھاد جوں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یہ سوچ کر کہ اب گھر میں کون سی شادی ہوگی۔ کم سے کم دس بارہ سال تک تو کوئی ایسا فنکشن ہونا نہیں تھا۔ پھر وہ ساس کے سب سے چھوٹے لاڈ لے بیٹے کی شادی تھی مگر یہ چاؤ جو نچلے اس وقت تک تھے جب تک آویز کا ہاتھ کھانے پکانے میں نہ لگا دیا گیا۔ سب ہی نئی نوپلی دہن کے آگے پیچھے پھرتے تھے لیکن جب سے آویز کا ہاتھ کھانے پکانے میں لگایا گیا وہ دہن سے بہو بن گئی اور، بو بھی وہ جو ہر لمحہ ساس کے نشانے پر ہو۔
ابسام اس سے بڑی محبت کرتا تھا۔ اس کا جی چاہتا وہ ہر لمحہ بنی سنوری اس کے پاس بیٹھی رہے مگر مشکل یہ تھی کہ سیمہ ہر لمحہ اسے کام میں لگائے رکھتی تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کا بیٹا اپنی بیوی کی ناز برداریوں میں ماں کی محبت کو بھول جائے، رات کو بھی ان کا بس چلتا تو وہ بہو کے کمرے میں بیٹے کو نہ جانے دیتیں یا بہو کو بیٹے کے کمرے میں جانے کی اجازت نہ دیتیں محض اس لیے کہ بیٹا ماں کی طرف سے کہیں بدگمان نہ ہو جائے، ورنہ ان کا بس چلتا تو وہ بہو کا بستر اپنے ساتھ ہی لگا لیتیں۔
اور جب صبح نماز کے لیے اٹھتیں تو کچھ پہلے ہی سے جا کر اس کا دروازہ کھٹکھٹانے لگتیں۔ ابسام کی نیند سے بوجھل پلکیں بڑی مشکل سے کھلتیں وہ کسمسا کر چیخ پڑتا۔
”کیا ہے ماما! مجھے سونے دیں۔“

”ارے میرے چاند تو آرام کر، میں تو بہو کو نماز کے لیے اٹھانے آئی ہوں۔“

”مما! آپ جائیں وہ کمرے ہی میں نماز پڑھ لے گی۔“

”مجھے جانے دیں ابسام! ورنہ سماخت ناراض ہوں گی۔“ آویز اٹھنے لگتی تو ابسام اس کا ہاتھ پکڑ لیتا۔

”لیٹ جاؤ خبردار جو اٹھیں، تم بیوی میری ہو یا ماما کی۔ روز کا یہی معمول ہے جیسے انہوں نے بنالیا ہے کہ جب نیند پورے شباب پر ہوتی ہے وہ آکر جگا دیتی ہیں۔“ وہ اس کی طرف غصے سے دیکھ کر بولا۔

”تو اس میں میرا کیا قصور ہے جو آپ مجھ پر بگڑ رہے ہیں۔“ وہ روہا سی ہو جاتی۔

”اوہو پلیر! میں تم پر نہیں مہا پر خفا ہو رہا ہوں۔ چلو میرے سر کو پیار سے دباؤ مجھے نیند آ جائے گی۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ لیتا اور وہ مسکرا دیتی۔

ابسام سو جاتا مگر اس کی نیند غائب ہو جاتی اور ساس کی ناراضی کا خوف الگ اور وہی ہوتا کہ ناشتا بناتے ہوئے ہزاروں باتیں سنانے لگتیں۔

”اللہ تو بہ میری، آج کی بہو بیٹیوں کی آنکھوں کا پانی ختم ہو گیا۔ شرم و حیا تو جیسے انہوں نے اٹھا کر رکھ چھوڑی ہے۔ نہ نماز کی نہ روزے کی، ہر وقت میاں کے پہلو میں گھسی رہیں گی۔ اونہرے گڑ مارے نے اسے بھی نکما بنا دیا ہے۔ دھوپ سر پر چڑھ جاتی ہے بھر بھی بستر پر اینٹھتا رہتا ہے اور بہانے بہانے سے بیوی کو آواز پس دیتا رہتا ہے۔ کرہ بند کر کے جانے کیا ہسر پھسر کرتے رہتے ہیں۔“

بھی تو وہ شرم سے سر جھکا لیتی بھی غصہ آ جاتا کہ کیسی ماں ہے میاں بیوی کے تعلقات کو بھی بدنام کرتی ہے۔

ان کا زور شیما پر نہیں چلتا تھا کہ وہ اسے ناشتے کے لیے بھی آواز دے لیں، وہ انتہائی منہ پھٹ اور بدتمیز خالہ جانی کی لاڈلی تھی۔ میاں کا اپنا کاروبار تھا۔ دیر سے جاتا یہی وجہ تھی کہ دیر سے ہی سو کر اٹھتے تھے۔ آویز کو جتانے کے لیے ساس اس پر جان چھڑکتی تھیں۔ نوکرائی کو ہدایت کرتی جاتیں۔

”دیکھو زور اور شیما اٹھ گئے ہوں تو ناشتہ لگا دو۔“ کبھی خالہ جان کو توفیق نہ ہوتی کہ وہ اپنی بھانجی کو نماز کے لیے اٹھانے پہنچ جاتیں، کئی بار آویز یہ کہتے کہتے رہ گئی بلکہ وہ ان سے پوچھنا چاہتی تھی۔

”امی کیا جیٹھ جھٹانی کو نماز معاف ہے؟“

مگر ساس جواب بعد میں دیتی، سب سے پہلے شیما جھٹانی کا زور دار تھیں اس کے رخسار پر اپنی پانچوں انگلیوں کے نشانات چھوڑ جاتے۔ اپنی عزت اپنے ہاتھ وہ اپنے اس خیال سے باز آ جاتی اسے کوئی شوق نہ تھا ان کے ہاتھوں ذلیل ہونے کا۔

ساری بہویں الگ تھیں۔ بہت اچھا تھا ورنہ گھر میں سب اپنی اپنی مرضیاں توہیتے جہاں ساس کی آواز سب سے اونچی ہوتی، آویز اور شیما کو پاس رکھنا ان کی مجبوری تھی۔ جہاں ان کا سب سے چھوٹا بیٹا چپیتا تھا وہیں بھانجی بھی ان کی کم چپیتی نہ تھی کیونکہ وہ اپنی تھی۔ غیر تو آویز تھی۔ جس پر کچم چلایا جا سکتا تھا۔ شیما پر نہیں اگر کبھی ساس کچھ کہہ دیتی تو ایک کی چار وہ سنا دیتی۔ اس لیے نہ یہ علم محتاط رہتی تھیں۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ نے مجھے کولہو کا بیل سمجھا ہوا ہے۔ سارا دن کام میں جتی رہوں۔ میرے سینے میں دل ہے، جذبات ہیں، میں آپ کی بیوی ہوں میرا بھی کچھ حق ہے آپ پر، آپ لوگوں کے اشارے پر چلتی رہوں بس آپ نے اپنی ماں کا رویہ دیکھا ہے کس قدر حقارت سے مجھے دیکھتی ہیں بولیں گی تو لگتا ہے انگارے اگل رہی ہیں۔ جی چاہتا ہے فوراً مرنے جاؤں مگر مرنا بھی تو بس میں نہیں۔“ آخر زور بھائی بھی تو ہیں اس گھر میں، مجال ہے کہ ان کی بیوی کی طرف کوئی ٹیڑھی آنکھ سے بھی دیکھ لے، وہ آنکھ نہ نکال کر رکھ دیں۔ ساس صاحبہ اپنی بہو سے آنکھ ملا کر بات نہیں کر سکتیں۔ یہ سب کیا ہے اس لیے ناں زور بھائی نے ہمیشہ بیوی کے حقوق کا خیال رکھا۔ ان کی عزت بڑھائی۔ وہ آپ ہی کے بھائی ہیں پھر دونوں میں اتنا فرق کیوں ہے، امی کی نظروں میں صرف میں ہی کیوں معتوب رہتی ہوں، آپ کچھ بولتے کیوں نہیں؟“ پتا نہیں کب سے بھرا ہوا والا یکدم پھٹ پڑا اور اس کے آنسو رخساروں پر بہہ نکلے۔ ابسام نے مسکرا کر اس کے آنسو پونچھے اور اسے سمجھانے لگا۔

”دیکھو دو چیزیں کبھی ایک ہی نہیں ہوتیں، ان میں تھوڑا بہت فرق ضرور ہوتا ہے اسی طرح بھائی بہنوں کے مزاج شکل و صورت، میں بھی تفریق تو ضرور ہوتی ہے۔ اب رہ گیا میزاج مزاج میری شخصیت تو بلاشبہ اس پر میری ماما کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔“

”در اصل آویز ماما کہتی ہیں کہ میں اپنے سب بھائیوں میں زیادہ خوب صورت، معصوم اور بھولا بھولا تھا۔ اس لیے مجھے کسی کی نظر لگ گئی اور میں بیمار ہو گیا۔ تب سے میں ٹھیک ہی نہیں رہا۔ اچھا ہو جاتا، پھر بیمار پڑ جاتا۔ مسلسل بیماری سے چڑچڑ اور فوری ہو گیا اور ماما نے میری بڑی خدمت کی ہے وہ میرا سایہ بن گئی تھیں مجھ سے محبت کرتی ہیں۔ ماما میں تو سب ہی پیار کرتی ہیں لیکن میری ماما تو میرے پیچھے دیوانوں کی طرح پھرتی رہی ہیں۔ دن کا چین رات کی نیند کھوئی انہوں نے مجھے پھولوں سے بھی زیادہ ناز رک رکھا اور چاہتی ہیں میں وہی کھاؤں پیوں جو وہ میرے لیے پسند کریں۔ زیادہ سے زیادہ آرام کروں، مجھے کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔“ وہ مسکرایا۔

”آخر آپ کو بیماری کیا ہے، ماشاء اللہ صحت مند بننے لگے ہیں۔“ آویز نے ہنس کر کہا۔

”چلو مان لیا کہ آپ بچپن میں بہت بیمار رہے تھے۔ تو عمو مان بچے بیمار ہو ہی جاتے ہیں مگر بڑے ہو کر سب ٹھیک ہو جاتے ہیں آپ بھی بظاہر ٹھیک نظر آتے ہیں۔ خواہ مخواہ بیمار رہنے یا بیمار کھلوانے کا شوق اور عادت پڑ گئی ہے آپ کو۔“ ابسام نے ایک بلند قہقہہ لگایا۔

”سچ پوچھو تو مجھے محبت کی بیماری لگ گئی ہے۔“

”جی کون ہے وہ جس کی محبت میں آپ نے دنیا داری چھوڑ دی، بستر سے لگ گئے، بولیں یہ بات آپ نے مجھ سے کیوں چھپائی؟“ آویز کو اس کی بات پر ایک دم غصہ آ گیا اور ابسام کا قہقہہ طویل ہو گیا۔

اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا۔ آویز کا موڈ خراب ہو گیا تھا وہ شکایتی نظروں سے اس کو دیکھتی رہی جب ہنسی پر قابو پالیا تو بولا۔

”در اصل میں اس محبت کا ذکر کر رہا ہوں جو مان کو اپنے لاڈ لے بیٹے سے ہوتی ہے۔ ماما ہمیشہ اسی وہم میں رہیں کہ میں کہیں بیمار نہ ہو جاؤں، کسی چیز سے مجھے کوئی نقصان نہ پہنچ جائے، مجھے وہ ابھی تک بچہ سمجھتی ہیں۔“ وہ اپنی ماں کی صحبتوں کا بڑے فخر سے اظہار کر رہا تھا۔

”تو پھر انہیں ابھی آپ کی شادی نہیں کرنی چاہیے تھی کیونکہ آپ ابھی بچہ ہو۔“ وہ جل کر بولی۔

”جب آپ بڑے ہو جاتے اور بیوی کے حقوق، اس کی عزت نفس کی حفاظت کی عقل آپ کو آ جاتی تو شادی کر دیتیں۔ آخر وہ مجھے کس لیے بیاہ کر لائی ہیں صرف نوکرائی بنانے اور لاڈ لے بیٹے کا دل بہلانے کے لیے۔ جب کہ نہ میں اپنی مرضی سے بہن ہو سکتی ہوں نہ کوئی چیز خرید سکتی ہوں، نہ کہیں جاسکتی ہوں نہ کسی سے مل سکتی ہوں۔“ آج وہ اچھی طرح سے اپنے جلے پھپھو لے پھوڑ رہی تھی۔ اس سے پہلے ابسام نے اسے اتنا برہم نہیں دیکھا تھا۔

”مجھے سونے کا بچہ نہیں چاہیے۔ میں آزاد فضا میں سانس لینا چاہتی ہوں۔ آپ کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر تھلکی کی طرح افق در افق، وادی وادی اڑنا چاہتی ہوں۔ میں اپنی آزاد زندگی کو قید نہیں کر سکتی۔ نہ میں کسی کا پہرہ برداشت کر سکتی ہوں۔ خدا کے لیے ابسام مجھے یہاں سے کہیں اور لے چلے جہاں میری سانسوں، میری مسکراہٹوں میرے قہقہوں پر کوئی پابندی نہ ہو۔“ یہ کہہ کر وہ منہ پر دونوں ہاتھ رکھ کر کسنے لگی۔

ابسام ہکا بکا اسے دیکھتا رہا، اسے بالکل سمجھ نہ آئی کہ آویز کو قیوت گویائی کس نے دی۔ یہ احساس کیسے ہوا؟ یہ تو بڑی مسکین معصوم اور بے زبان لڑکی تھی جس پر رولٹ کا گمان ہوتا تھا۔ پھر اسے اس معصوم اور بے زبان لڑکی پر بے حد ترس آنے لگا۔ شاید حد سے بڑھی ہوئی زیادتیاں، نا انصافیاں اور سختیاں ہی کمزور کو

طاقت ورنہ بدیتی ہیں۔ اس نے جو کچھ کہا غلط نہیں تھا کیوں کہ وہ ماں کے مزاج کو سمجھتا تھا۔ ان کے مزاج میں بڑی حاکمیت اور رعونت تھی۔ ابسام نے ہاتھ بڑھایا کہ اسے اپنے حصار میں لے لیا مگر وہ مسلسل روتی رہی۔ اسے اس وقت شوہر کی ہمدردی بھی بری لگ رہی تھی۔

”آویز! میری بات سنو تمہاری ہر دلیل ہر بات شکوہ درہست سہی مگر یہ تو سوچو کہ وہ میری ماں ہیں۔ مجھ میں اتنی جرات نہیں کہ میں ان سے یہ کہوں کہ وہ تمہارے ساتھ زیادتی کرتی ہیں۔ حالانکہ مجھے اعتراف ہے کہ مما اکثر نا انصافی کر جاتی ہیں۔ یہ ان کی محبتوں کی انتہا ہے آویز۔“

”میں اس انتہا کو نہیں مانتی۔“ آویز نے جھنجھلا کر جواب دیا۔

”کیونکہ شوہر کی دیکھ بھال اس کا آرام، اس کی خوشی، ناخوشی، اس کی پسند ناپسند کا خیال رکھنا بیوی کے فرائض میں شامل ہے۔ میاں اور بیوی ایک دوسرے کی ذمہ داری ہیں جسے بیوی ہی انجام دیتی ہے ماں یا بہن نہیں یہ سراسر میری توہین ہے پھر شادی کا مطلب کیا ہوا۔ یہ سارے کام تو نوکرانیاں بھی کر سکتی ہیں مجھے کس لیے ایک آزاد نضاعے اٹھا کر دولت جیسی نعمت سے لبریز قید خانے میں ڈال دیا ہے۔ آپ اگر میری عزت نفس کی حفاظت نہیں کر سکتے تو مجھے میرے گھر چھوڑ آئیے، میں یہاں نہیں رہ سکتی۔“ آویز کی یہ دھمکی ابسام کو لرزائی اس کی آنکھوں میں دیرانیاں سی اتر آئیں۔

”نہیں..... نہیں آویز! ابسامت کرنا ورنہ جو زندگی اور خوشی مجھے تمہارے صدمے میں ملی ہے وہ مجھ سے چھین جائے گی۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا اور ماں کا دل بھی نہیں توڑ سکتا۔ پلیز مجھے معاف کر دو۔“ اس نے آویز کے ہاتھوں پر اپنا سر ٹکا دیا اور آویز کا دل ڈانوا ڈول ہونے لگا۔

☆.....☆

شیبانا نے بھانجی ہونے کا بھرپور فائدہ اٹھایا تھا۔ ذرا بھی وہ ساس کا لحاظ نہیں کرتی۔ اسے مکمل رعایت ملی ہوئی تھی۔ مرضی سے سوتی اور مرضی سے جاگتی، جہاں جی چاہتا اپنے شوہر کے ساتھ گاڑی میں گھومتی پھرتی۔ جب کہ آویز کو کہیں بھی آنے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ جواز یہ پیش کیا جاتا کہ ابسام کو تنہا ہو جائے گی حالانکہ اس حق تلفی پر ایک بار بڑے بیٹے نے بھی ماں کو سمجھانا چاہا۔

”مما! آپ دونوں کو آؤ تنگ پر بھیجا کریں۔ ابسام کو باہر نکالیں ورنہ ذہنی مریض بن جائے گا۔ کس کام کا نہیں رہ جائے گا۔ آپ اسے بابا کے ساتھ کام پر لگائیں۔ آپ نے بچہ بچہ کہہ کر کچھ سوچنے کے قابل نہیں چھوڑا، اب وہ بچہ نہیں ہے اسے مرد بنائیے عورتوں کی طرح ہر وقت گھریں گھسا کر نہ رکھیں۔ اسے زبردستی ہر تقریب، ہر تفریق پر آویز کے ساتھ بھیجیں ورنہ وہ پھر بیمار ہو جائے گا۔“

”اے خدا نہ کرے بیٹا! میں تو ہر طرح اس کا خیال رکھتی ہوں۔“

”بہی آپ کی غلطی ہے ممما! آپ اس سے ہاتھ اٹھالیں، خیال رکھنے والی آپ لے تو آئی ہیں پھر آپ اسے خیال رکھنے دیں۔ یہ سب کچھ اب آپ کے فرائض میں شامل نہیں ہے۔“

نسیہ علیم کچھ نہیں بولیں۔ مسکرا کر اثبات میں گردن ہلا دی۔ وہ اپنے سارے بیٹوں سے عاجز تھیں اگر بس چلتا تو صرف ابسام اور اس کی بیوی پر۔

ایک دن مچھلی جھٹائی ملنے آئیں۔ وہ ابسام کے کمرے میں چلی آئیں۔ ابسام ڈرائنگ روم میں کسی دوست کے پاس تھے۔

”ہیلو آؤیز کیسی ہو؟“
 ”ٹھیک ہوں بھابی! آپ کے مزاج کیسے ہیں، آج کیسے ادھر کا رستہ بھول گئیں؟“ آؤیز نے بڑی خوش دلی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔
 ”بھئی میرا موڈ تو ہمیشہ ہی خوشگوار رہتا ہے۔ میں بازار جا رہی تھی، ڈرائیور سے کہا گاڑی ادھر موڑ لے، تم سے ملنے کو جی چاہا بس آگئی اور وہ تمہاری ساس کا موڈ کیسا ہے؟“ انہوں نے نظروں کو گھما کر ادھر ادھر دیکھا اور ہنس پڑیں۔
 ”کیوں بھابی صرف میری ساس ہیں وہ؟“ وہ مسکرائی۔

”ہاں بھئی، وہ سنا ہے آج کل تم پر زیادہ مہربان ہیں۔“ وہ ہنسیں۔
 ”ٹھیک سنا آپ نے مگر یہ مہربانی صرف مجھ پر کیوں رہتی ہے ان کی؟“
 ”اس لیے کہ تم ان کی سنا کر ملی ہو اور میں کھری کھری سنا دیتی ہوں۔ میں لگی لپٹی نہیں رکھتی۔“ انہوں نے پھر قہقہہ لگایا۔

”بھابی آپ کا خیال غلط ہے، بے زبان کوئی لڑکی نہیں ہوتی لیکن مشکل یہ ہے کہ جس شخص کے لیے وہ لائی جاتی ہے جس سے اس کی ساری زندگی باندھ دی جاتی ہے جب وہ ہی اپنا نہ ہو تو پھر وہ کیا کرے اس کے سامنے ماں باپ کی نصیحتیں ہوتی ہیں کہ ماں باپ کی عزت کا خیال رکھنا، دنیا کی شرم و حیا، رسم و رواج اور شوہر کی عزت دامن پکڑتی ہے، ایسی صورت میں وہ زبان منہ میں نہیں رکھے گی تو وہ بے بس اور کیا کرے گی۔“ اور اس کی بات پر جھٹائی کا بے ساختہ قہقہہ بلند ہو گیا۔

”واہ بھئی، تمہاری بات پر جیسے اپنا بچپن یاد آ گیا۔ میرے پڑوس میں ایک بیگم سرین رہا کرتی تھیں، بڑی نیک صلہ جو خاتون تھیں مگر ان کی بہو اللہ کی پناہ، وہ جو کہتے ہیں کہ اس کی زبان کے آگے تو جیسے خندق کھودی ہوئی تھی تو یہ غلط نہیں تھا۔ صابر صاحب کی بیگم اس سے ڈرتی تھیں کہ اس بے مہار کے منہ کون لگے۔ یہ تو اپنی زبان پر انگارے رکھ کر چلتی ہے۔ وہی مقولہ اس وقت تم نے بیان کر دیا۔“
 ”خیر بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ میں نے تمہیں مشورہ دیا تھا تم کچھ دن کے لیے اپنے میکے چلی جاؤ رہنے کے لیے۔“

”ہاں بھابی مگر پھر ابسام۔“ وہ ان کی طرف دیکھ کر کچھ شرماسی گئی۔
 ”وہ میرے بغیر کس طرح.....!“ مسکرا کر نظریں جھکا لیں۔ انہوں نے ہنس کر اسے گلے لگا کر کہا۔
 ”وہ تمہارے بغیر لے گا کیونکہ اس کے پاس اس کی ماں ہوگی۔ اس کا خیال رکھنے کے لیے۔“ انہوں نے شوخیاں بکھیرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

”میری پیاری دیورانی! یہ بڑا ضروری ہے جب تک تم اسے تنہا نہیں چھوڑو گی اسے تمہاری قدر نہیں ہو گی۔ اس کے جذبات و احساسات کو بیدار کرنے کے لیے کچھ ماہ تک اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لو، اچھا خدا حافظ۔“

وہ ہاتھ ہلاتی ہوئی تیزی سے باہر چلی گئیں جہاں ڈرائیور ان کا منتظر تھا۔ جھٹائی ہمیشہ کی ہنستی مسکراتی شوخ و چٹیل تھیں، ان سے نسیم علیم بڑا خاگر تھا انہیں اور کہتی تھیں کہ اس کی زبان کے آگے کوئی روک نہیں، ہر وقت بولتی ہی رہتی ہے۔ چپ رہنا نہیں جانتی مگر آؤیز کو وہ بہت اچھی لگتی تھیں۔ اب کچھ دن سے شیمابھی اس

کا بہت خیال رکھنے لگی تھی۔ کبھی کبھی آکر پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگی تھی۔ وہ بھی اس سے فرینک ہو گئی لیکن اب آویز کچھ بیماری نظر آنے لگی تھی۔ لگتا جیسے وہ اندر ہی اندر گھلنے لگی ہو، اس کے بعد اسے بخار نہ گھیر لیا اور وہ بستر سے لگ گئی تب نسیہ عظیم بھی گھبرا گئیں اور انہوں نے محلے کے کمپاؤڈر کو کیفیت بتا کر دوامنگولی بھی مگر بخار اترنے کے بجائے اور تیز ہو گیا۔ کچھ دنوں سے شیما اس پر زیادہ مہربان ہو گئی تھی۔ وہ اپنی ساس کو بالکل پسند نہیں کرتی تھی، حالانکہ وہ اس کی سگی خالہ تھیں وہ کئی بار آویز کو سمجھا چکی تھی۔

”تم خود میدان میں نکلو اور اپنے شوہر کو مرد ہٹاؤ، ورنہ اسی طرح سسک سسک کر مر جاؤ گی۔ مجھے دیکھو میں نے شروع سے حالات پر اپنی گرفت رکھی۔ ورنہ میرا حشر بھی تم سے مختلف نہ ہوتا۔ تم نے تو بے دقتی کی انتہا کر دی۔ مہینوں گزر جاتے ہیں مگر تم میکے جھاگتی بھی نہیں اور تمہاری امی جانے کس ٹھنڈی مٹی سے بنی ہوئی ہیں کہ بیٹی کو سسرال میں چھوڑ کر جیسے بھول ہی گئی ہوں۔ ارے بھائی، امی کوئی تو خبر رکھتا تمہاری کہ میری بہن بیٹی پر کیا گزر رہی ہے۔“

”بھائی! دراصل میری ماں نے مجھے دوسرے گھر کی جو تربیت دی تھی اس کا تقاضا تھا کہ وہ مجھے ڈسٹرب نہ کریں۔“

”ارے واہ یہ کیا بات ہوئی۔“ شیما غصہ آ گیا۔

”دوسرے گھر کا مطلب سسرال کے گھر کی تربیت کے یہ معنی بھی نہیں ہوتے کہ بیٹی سے تعلقات توڑ لیے جائیں اس کی خیریت بھی نہ لی جائے کہ وہ زندہ بھی ہے یا مر گئی؟“

”بھائی! میرے بھائی تو کئی بار مجھے لینے آئے مگر میری ساس نے صاف بھیجے سے انکار کر دیا۔“ وہ رو پڑی۔

”تم نے ابسام کو یہ بات بتائی تھی؟“

”ہاں انہوں نے بھی اپنی بے بسی یہ کہہ کر ظاہر کر دی کہ جو ماما ہیں گی کریں گی۔“

”ویری سیڈ۔“ شیما پاس بیٹھ کر اس کے آنسو پونچھنے لگی۔

”میرا بس چلے تو ایسی بے رحم ساسوں اور بزدلوں کو ہم دھاکے میں اڑا دوں۔ اچھا خیر چھوڑو، آج تو میں ایک پارٹی میں جا رہی ہوں تمہاری طبیعت ٹھیک ہوئی تو میں تمہیں بھی لے جاتی۔ کل تم میرے ساتھ ڈاکٹر کے ہاں چلنا، مجھے تمہاری طبیعت گڑبڑ معلوم ہوئی ہے۔“ وہ مسکرائی اور چلی گئی اور آویز سوچ میں پڑ گئی۔

”گڑبڑ سے کیا مراد ہے۔“ وہ زیر لب بولی۔ پھر ایک دم اس کا جی متلانے لگا اور اس نے چہ سہاست فالے منہ میں ڈال لیے۔

”ارے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے؟“ اس دن بڑے دنوں بعد ابسام کو اس کا خیال آ گیا یا پھر پیار امنڈنے لگا اس پر بھگتے ہوئے بولا۔ مگر آویز کچھ نہیں بولی اس نے اس کی طرف سے کروٹ بدل لی۔ وہ دوسری طرف آ گیا۔

”کیا بات ہے آویز۔“ کبھی مجھ سے ناراض ہو؟“

”ناراض نہیں، مجھے آپ سے نفرت ہے۔ پتا نہیں آپ جیسے بزدل مردشادیاں کیوں کر لیتے ہیں۔ دوسروں کی زندگی برباد کرنے کے لیے۔“ وہ غصے میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”نہیں آویز! تم مجھ سے نفرت نہیں کر سکتیں۔“ اس نے آویز کا گرم ہاتھ پکڑ کر اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔
 ”کہہ دو آویز یہ جھوٹ ہے؟“ وہ اداس ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”یہ بہت بڑا سچ ہے۔“ اس نے جھٹکے سے ہاتھ چھڑا کر کہا۔
 ”نہیں آویز! محبت سے کوئی ذی روح نفرت نہیں کر سکتا۔ جب کہ مجھے تم سے بے پناہ محبت ہے۔“
 ”کیا خوب، یہی ہے آپ کی محبت کہ چار دن سے میں بستر پر پڑی ہوں آپ کی ماما کے کپاؤ ڈر سے
 میری طبیعت بتا کر دوائی لے آئیں اور فرض ادا ہو گیا مگر آپ کو ذرا بھی احساس نہیں کہاں تو آپ گھر سے
 نکلے نہیں تھے اور کہاں اب صبح کے نکلے تو شام کو آئے۔ نہ ماما دوائی نہ یہ باندی جسے آپ کی ماما صرف آپ کی
 خدمت اور گھر کی نوکرائی بنا کر لائی تھیں۔“

”آویز! میں تم سے شرمندہ ہوں سچ بات یہ ہے کہ میں صرف ماما کی وجہ سے گھر میں نہیں رہتا۔ اپنے
 دوست کے گھر جا کر پڑھتا رہتا ہوں، البتہ میرا یہ قصور معاف کر دو کہ میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس نہ لے گیا اس
 کی وجہ بھی ماما ہیں، انہیں کپاؤ ڈر پر یہی یقین ہے وہ پسند نہیں کرتیں کہ تمہیں ڈاکٹر کو لے جا کر دکھاؤں۔ تمہیں
 اس وقت بھی تیز بخار ہے چلو تیاری کر لو میں ڈاکٹر کے پاس لے چلتا ہوں۔“
 ”نہیں مجھے کہیں نہیں جانا، آپ کی ماما کپاؤ ڈر سے جو دوائی لائی ہیں ابھی وہی کھالوں گی۔ آپ میری
 فکر نہ کریں۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”اوکے ماما کہاں گئی ہیں؟“

”سامنے والوں سے ملنے۔“

”اور سونیا کہاں ہے؟“

”وہ چھٹی پر ہے۔“

وہ خاموشی سے اٹھا اور سیب کاٹ کر پلیٹ میں رکھ کر لے آیا اور ایک پیس اٹھا کر اس کے منہ تک لے
 جا کر بولا۔ ”لو میرے ہاتھ سے کھا لو شفا ہوگی۔“ بڑا پیار بھرا لہجہ تھا۔
 آویز نے ایک زور کا ہاتھ مارا پلیٹ سیبوں کے پیس سمیت فرش پر جاگری اور پلیٹ کے دو ٹکڑے ہو
 گئے۔

”مجھے آپ کی دکھاوے کی یہ محبت نہیں چاہیے مجھے تنہا چھوڑ دیں۔“ وہ پھر رونے لگی۔

”آویز مجھے معاف کر دو۔“ اب وہ بھی بچوں کی طرح رو دیا۔

”خدا کے لیے یہاں سے چلے جائیں۔ یہ ڈرامہ نہ کریں۔“ اس نے منہ پھیر لیا۔

”آویز! اس وقت تم نے میرا دل تو زودیا۔ عمران ٹھیک کہتا تھا کہ تم پر ظلم ہو رہا ہے اور میں تمہارے لیے

کچھ نہیں کر سکتا۔“

وہ آنسو پونچھتا ہوا باہر چلا گیا۔ اس وقت آویز کو بے حد شاک پہنچا اس نے پہلی بار ابسام کو اس قدر بکھرا
 روتا ہوا دیکھا تھا۔ اسے افسوس کے ساتھ تھوڑی خوشی بھی ہوئی تھی کہ چلو دیر سے سہی احساس تو ہوا اس رات وہ
 پوری نیند سوئی تھی۔ کافی دن چڑھ گیا تھا۔ نسیم علیم نے اسے نارمل دیکھ کر کہا۔

”اے بیٹی! کپاؤ ڈر کیا نے فائدہ دکھایا۔ کئی جلدی آرام آ گیا۔ میں ابھی سونیا کے ہاتھ ناشتا بھجوا رہی

ہوں۔“

اس کا جی چاہا ساری دوائی اٹھا کر ان کے سامنے پھینک کر کہے۔ ”مجھے اس دوا سے آرام نہیں پہنچا۔ میں اور ٹوٹ کر بٹھرنی ہوں۔ میرے اندر آگ لگی ہوئی ہے۔ مجھے آپ کی یہ ہمدردی نہیں چاہیے۔“ مگر وہ صرف دیکھ کر رہ گئی۔

اتنے میں شیمہ آگئی۔ اس نے پیشانی چھوئی۔
 ”بخار تو کم ہے۔ تم تیار کر لو میں ابھی فارغ ہو کر آتی ہوں ڈاکٹر زہرا سے میں نے ٹائم لے لیا ہے۔“ وہ چلی گئی تو آویز اٹھ کر دواش روم چلی گئی۔ شاور لیا اور کپڑے بدل کر باہر آگئی سو نیا ناشتہ لیے انتظار کر رہی تھی اس نے ایک سلاکس لیا اور چائے پی کر کھڑی ہو گئی۔

”بیٹی! تم نے ناشتا کر لیا؟“ آج ساس نے بڑی نرمی سے پوچھا اور اسے دیکھ کر مسکرائیں۔

”ماشاء اللہ آج طبیعت ٹھیک دکھائی دیتی ہے۔“ مگر آویز نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”آویز تیار ہو گئی؟“ شیمہ ہاتھ میں پرس پکڑے اندر آ گئی۔

”جی بھائی میں تیار ہوں۔“ وہ پرس اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔

”اسے کہاں لیے جا رہی ہو شیمہ؟“ ان کا لہجہ ایک دم شعلہ فشاں ہو گیا۔

”میں ذرا گھومنے پھرنے جا رہی تھی، میں نے سوچا گھر میں پڑے پڑے اسے بوریت ہو رہی ہوگی۔

ویسے بھی بیمار ہے ذرا دل بہل جائے گا۔“

”نہیں اب یہ بالکل ٹھیک ہے، دیکھ نہیں رہیں منہ پر رونق آگئی۔ ایک دن کپاؤ ڈرنی دوا اور کھالے گی تو جلد ٹھیک ہو جائے گی۔“

”نہیں ساسو ماں جی اب یہ بالکل ٹھیک ہے۔“ شیمہ ہنس کر بولی اور آویز کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی باہر لے گئی۔ دروازے سے پلٹ کر اس نے ساس کی قہر آلود آنکھوں کو دیکھا اور ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہتی ہوئی جا کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ ”سیسہ علیہم تملاکرہ کنیں۔“

”بھائی! یہ آپ نے اچھا نہیں کیا آپ کو اصل بات بتا دینی چاہیے تھی۔“

”کوئی بات نہیں تھوڑی سی الجھن اور سبہ لینا مجھے تو اب انہیں کچھ بھی نہیں بتانا ہے اور تم بھی اپنی زبان بند رکھنا اسی میں تمہاری بہتری ہے۔“

”کس بات کی بہتری، میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا۔“

”ابھی کچھ دیر بعد سب کچھ تمہاری سمجھ میں آجائے گا جیسا میں کہتی ہوں ویسا ہی کرتی رہنا۔ ورنہ مجھ

سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“ وہ ہنس پڑی۔

”نہیں بھائی! آپ تو بہت اچھی ہیں آپ بری ہو ہی نہیں سکتیں جو آپ کہیں گی میں وہی کروں گی۔“

آویز نے مسکرا کر کہا۔

”گڈ! اچھی دیورانی ایسی ہی ہوتی ہیں۔ سچ بات تو یہ ہے آویز کہ تمہیں دیکھ کر میں کڑھنے لگی تھی۔ بس موقع کی تلاش میں تھی اتنی معصومیت اور سیدھا پن بھی اچھا نہیں ہوتا۔ تم نے خاموش رہ کر خود پر ظلم کیا اور اپنا ہی نقصان کیا اور ابام کو بھی اس کی اپنی نگاہوں میں مشکوک کر دیا۔ بلاشبہ ماں اولاد کی ذہنی اور جسمانی

تعمیر کرتی ہے مگر بیوی تو دل اور روح کا قرار مہیا کرتی ہے مگر میری خالہ جانی نے بھی ایسا نہیں سوچا۔“

باتیں کرتے کرتے کلینک آگیا۔ ڈاکٹر زہرا نے بڑی اچھی طرح آویز کا چیک اپ کیا اور بولی۔

”مبارک ہو آپ کی دیورانی امید سے ہیں مگر کمزور بہت ہیں انہیں میری ہدایت پر پورا عمل کرنا پڑے گا۔“

”جی ڈاکٹر! بالکل آپ جس طرح کہیں گی یہ کریں گی۔“ شیما نے مسکرا کر آویز کو دیکھا۔

اور ڈاکٹر نے دو ایساں پرچی پر لکھ دیں۔ شیما نے وہ پرچی لے لی اور دونوں گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ شیما نے کہا۔

”اب تمہاری فتح کے پورے انتظامات قدرت نے کر دیے ہیں تمہیں قطعی ڈرنے کی ضرورت نہیں۔“

”بھابی! پتا نہیں ماما کا کیا رد عمل ہو گا یہ سن کر؟“ آویز پریشان تھی۔

”پاگل نہ بنو، رد عمل تو جب ظاہر ہو گا جب انہیں کچھ معلوم ہو گا اور تم وہاں وقت گزار دو گی، تمہارے پاس صرف کل کا نام ہے اپنا بیگ تیار رکھنا، پرسوں تم اپنے میکے جا رہی ہو، تمہاری امی تمہیں لینے آئیں گی۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں بھابی؟“ وہ گھبرا کر شیما کی طرف دیکھنے لگی۔

”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے ساری تیاریاں کر لی ہیں۔“ وہ مسکرائی۔

”مگر بھابی! ماما مجھے کیسے بھیجیں گی؟“

”میں جو گھر میں ہوں گی تو نسیہ علیم کچھ نہیں کر سکیں گی۔“

”نسیہ علیم؟“

”ہاں ہاں خالہ جانی تمہاری ساس۔“ اس نے آنکھیں گھما کر قہقہہ لگایا۔

”بھابی جان آپ خواخواہ میری وجہ سے پریشان ہوں گی۔“

”ارے پریشانیاں میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں بلکہ مجھ سے کتر کر نکل جاتی ہیں، دنیا میں رہنے کا گرجھ سے سیکھو، بس میری دعا یہ ہے کہ تم پریشان نہ ہو اور دیکھو ابسام تم پر کتنی بھی محبت چھڑکے دکھائے اس کی باتوں میں نہ آنا مسلسل اپنی ناراضی کا اظہار کرتی رہنا اور یہی بات کہتی رہنا کہ مجھے میرے گھر پہنچا دو، یہاں میرا دم گھٹتا ہے اور اسے ہوا تک نہ لگنے دینا کہ ڈاکٹر نے تمہیں کیا خوش خبری سنائی ہے، ورنہ کا یا پلٹ جائے گی۔“

”بھابی! آپ تو مجھے خوف زدہ کر رہی ہیں کسی کا یا پلٹ؟“

”اب تم مجھ سے صاف صاف سننا چاہتی ہو تو سنو اگر تمہاری ساس کو اصل بات معلوم ہو گئی تو وہ تمہارے بچے کو دنیا میں آنے سے پہلے ہی مار دے گی۔ تمہیں ماں ہونے کا فخر اور خوشی ملے وہ کبھی برداشت نہیں کر سکتیں۔ ان کا کمزور اور بزدل بیٹا باپ بن جائے بیوی اور بچے کی محبتوں میں پڑ کر وہ ماں کو بھول جائے کبھی ایسا نہیں ہو سکتا، وہ کبھی بھی بے گناہ نہیں لگنے دیں گی کہ تم ماں بھی بن سکتی ہو۔“

”بھابی جان!“ وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

”کیا ایسا بھی ممکن ہے؟ کیا ایک ماں ایسا بھی کر سکتی ہے کہ وہ اپنے بیٹے کی اولاد کو بھی ختم کروا سکتی ہے؟“

”ہاں یہ سب کچھ ممکن ہے تمہیں جو کہنا سننا ہے اسی جگہ ڈسکس کرلو، وہاں صرف اشاروں میں بات ہو گی، زبان نہیں ملے گی، تم میری خالہ کو نہیں جانتیں بڑی کینہ پرور، حاسد اور خود پسند خاتون ہیں۔ انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی اور اس کی بیوی پر بڑا ظلم توڑا ہے۔ چھوٹے ماموں بالکل ایسا م کی طرح سپیدھے سادھے تھے جو بہن کے زیر اثر تھے۔ ماموں کا یہ قصور تھا کہ انہوں نے محبت کی شادی کی تھی جس کی سزا انہیں بھگتنا پڑی اور اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے۔ اب وہی کھیل تمہارے ساتھ کھیلا جانے کا امکان پیدا ہو گیا ہے اس لیے

میں نہیں چاہتی کہ جو کچھ چھوٹی ممانی کے ساتھ ہوا وہ تمہارے ساتھ ہو۔“ شیما چپ ہو کر اس کا منہ دیکھنے لگی۔

”اللہ کی پناہ۔“ اس نے توبہ کے انداز میں دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے پھر سر اٹھا کر بولی۔
 ”ٹھیک ہے بھائی! جو آپ کہیں گی وہی کروں گی۔ خواہ مجھے اسام کو چھوڑنا پڑے مگر میں اپنے بچے کی آخری سانسوں تک حفاظت کروں گی۔“ آویز کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
 ”اچھا آؤ کچھ کھالیں، گھر سے نکلے کافی دیر ہو گئی ہے۔ پیاس بھی لگی ہوئی ہے۔“
 وہ ایک جوس شاپ میں گھس گئیں جوس بھی پیتی رہیں، بیٹھی ادھر ادھر کی باتیں بھی کرتی رہیں۔ آویز ہر آنے جانے والے کو دلچسپی سے دیکھتی رہی۔ آج وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ آج اسے یہ سب کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہاں سے فارغ ہو کر وہ ہستی مسکراتی جا کر گاڑی میں بیٹھ گئیں۔

☆.....☆

دوسرے دن شیما کے کہنے کے مطابق اس کی ای بیٹے کو لے کر آ گئیں۔ اسے لینے آویز نے اپنا بیگ تیار رکھا تھا۔ رات کو اسام سے اس کی اچھی خاصی جھڑپ ہو چکی تھی۔ اس نے صاف کہہ دیا تھا۔
 ”میں گھر جاؤں گی اگر مجھے کسی نے زبردستی روکنے کی کوشش کی تو میں ساری زنجیریں توڑ کر چلی جاؤں گی۔ بہت ہو چکا اب میں اس زندان میں نہیں رہ سکتی۔“

”اگر میں تم سے کہوں کہ نہ جاؤ تب بھی؟“ اسام کا اعتبار قابل حیرت تھا۔
 ”کیوں، آپ کو اپنے متعلق یہ خوش فہمی کیوں؟ کیا کیا ہے آپ نے میرے لیے آزاد فضا سے اٹھا کر مجھے زندان میں ڈال دیا۔ میں تازہ ہوا، تازہ فضا کو ترستی رہی، دنیا کی لڑکیوں کی شادیاں ہوتی ہیں تو وہ اپنے شوہروں کے ساتھ دعوتیں اڑاتی ہیں، شاپنگ کرتی ہیں، مانی مون پر پُر فضا مقام پر جاتی ہیں، دوستوں عزیزوں سے ملتی ہیں، غرض کہ زندگی کے لمحے لمحے کو انجوائے کرتی ہیں مگر آپ کی ممانے میرے اوپر خوشیوں کے دروازے بند کر دیئے کوئی دروازہ کوئی دریچہ کھلا نہ رکھا، جہاں سے تازہ ہوا آتی، آخر آپ کے اور بھائی بھی تو ہیں۔ ان پر کسی قسم کی پابندی نہیں مجھے ہر جگہ آزاد تھا اگر آپ ان زیادتیوں کے خلاف آواز اٹھاتے تو میں تمام دنیا سے لڑ جاتی، کسی نے پروا نہ کرتی مگر اب میں کسی کو نہیں سنوں گی۔“
 یہ کہہ کر وہ بستر سے اٹھ کر صوفے پر جا کر لیٹ گئی۔ اسام نے اسے منانا چاہا، اس سے معافی مانگی مگر وہ اپنی ضد پراڑی رہی۔

رات بھر دونوں میں سے کوئی نہیں سویا، دونوں بے چین رہے، صبح جانے کس وقت اسام گھر سے چلا گیا۔ وہ اپنی تئاری میں لگ گئی۔ شیما آئی اور اسے تیار دیکھ کر مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

صبح ناشتے کے وقت نسیہ علیم اسے اٹھانے آئیں تو اس نے یہ کہہ کر کروٹ بدل لی۔
 ”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ اور وہ بڑے غصے میں بڑبڑاتی چلی گئیں۔ امی اور بھائی اسے لینے آ گئے۔ وہ فریٹش ہو کر تیار ہو گئی۔ نسیہ علیم نے بڑی جبرانی سے سمھن کو دیکھا۔ ان کا ماتھا ٹھکا، وہ سمجھ گئیں کہ وہ آئی نہیں بلائی گئی ہیں۔ انہوں نے نسیہ علیم سے کہا۔
 ”بہن میں آویز کو لینے آئی ہوں۔“

”خیر تو ہے، آج تمہیں آویز کا کیسے خیال آ گیا؟“ انہوں نے چپچپے لہجے میں کہا۔

”اس کا خیال تو مجھے ہر لمحہ رہتا ہے۔ آخر وہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے کتنی بار میں نے بلوایا۔ بھائی آیا، بہن آئی مگر آپ نے نہیں بھیجا، آخر کب تک آٹھ دس ماہ ہو گئے ہم اس کی صورت کو ترس گئے۔ اس کے باپ کی طبیعت خراب ہے۔ انہوں نے اسے بلوایا ہے، بیٹی کو دیکھنا چاہتے ہیں۔“

”اگر میں پھر بھی اسے جانے کی اجازت نہ دوں تو؟“

”خالہ جانی یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“ جانے کب شیما آکر بیٹھ گئی تھی اس نے کہا۔

”اس بے چاری کا باپ بستر پر پیار پڑا ہے۔ بیٹی کو یاد کر رہا ہے یہ تو سراسر ظلم ہے، آپ اسے فوراً بھیجئے۔“

”چپ رہو شیما، یہ ہمارا معاملہ ہے تمہیں بولنے کی ضرورت نہیں۔“ انہوں نے بہو کو ڈانٹ دیا۔

”آہا ہا..... یہ صرف آپ کا ہی نہیں ہمارا معاملہ بھی ہے۔“ شیما کھڑی ہو کر ہاتھ اٹھا کر بولی۔

”کل آپ میرے ساتھ بھی یہی سلوک کر سکتی ہیں میں بے چاری کیا کر لوں گی۔ آنٹی آپ اسے فوراً لے جائیں آویز کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔“ آویز خوفزدہ نظروں سے شیما کو دیکھنے لگی۔ آویز کی امی بولیں۔

”اب کوئی زبردستی، دھوکس دھکی نہیں چلے گی۔ میں اپنی بچی کو لے کر جاؤں گی اٹھ جا آویز؟“ انہوں نے آویز کا ہاتھ پکڑ کر جھنک دیا۔ نیسہ علیم کو اتنا غصہ آیا کہ وہ شیما کو مارنے اٹھیں، شیما نے فوراً ان کی کلائی مضبوطی سے پکڑ کر کہا۔

”خالہ جان! اپنی عزت اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ میں آویز نہیں شیما فائق ہوں۔ میرے بابا پولیس آفیسر ہیں میں نہیں ڈرنے والی سمجھیں آپ۔ آپ لوگ تو لالچی نکلے۔ اتنے عرصے سے آپ کا آویز کے ساتھ سلوک دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ میری خالہ جانی تو بھی ایسی نہیں ہو سکتیں۔ آج مجھے یقین ہو گیا کہ آپ ظلم کی آخری حدوں تک جاسکتی ہیں۔“

نیسہ علیم نے کہا جانے والی نظروں سے شیما کو دیکھا اور خاموشی سے بیٹھ گئیں۔ بھائی نے بیگ اٹھایا اور آویز کی امی نے نیسہ علیم کے پاس جا کر کہا۔

”بہو بھی بیٹی کی طرح ہوتی ہے۔ لوگ بیٹا دے کر بیٹی لیتے ہیں۔ یہی دنیا کا دستور ہے مگر میں تو بڑے خسارے میں رہی۔ بہن بیٹی گئی سو گئی، بیٹا بھی ہاتھ سے گیا۔ وہ بھی بھی ساس کے سلام کو نہ آیا۔ کیا ہم اتنے برے تھے کہ آپ نے رسم دنیا بھی نہ بھائی۔“

”مما! میں جا رہی ہوں۔“

آویز نے پاس جا کر رسما کہا مگر وہ گنگ سی بیٹھی دیکھتی رہی اور وہ تینوں باہر نکل گئے اور ان کے ساتھ شیما بھی خدا حافظ کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔



شام کو جب ہر سواندھیر اچھیل گیا اور لائیں جل اٹھیں تو ابسام گھر آ گیا۔

”کہاں تھے تم، سارا دن گھر نہیں آئے۔“ نیسہ علیم کا لہجہ بڑا سخت تھا۔

”کیا کروں گھر میں آکر، میرا دم گھٹنے لگا ہے یہاں۔“ وہ کمرے میں جانے لگا۔

”تمہاری چھٹی چلی گئی اپنی ماں کے ساتھ، اس کی ماں آئی تھی اپنے بیٹے کے ساتھ۔“

”معلوم ہے۔“

”کیوں تمہیں افسوس نہیں ہوا؟“
 ”افسوس کس بات کا، ایسے ہی کرنا چاہیے تھا۔ اس نے اسے دیا کیا تھا۔“
 ”نسیہ علیم چکرا کر رہ گئیں۔“

”یہ کیا ہو رہا تھا؟“

رات کو وہ شوہر کے سامنے بیٹھی بچکیوں سے رو رہی تھیں۔

”بہو چلی گئی، بیٹے نے بھی آنکھیں پھیر لیں، اٹلے سیدھے جواب دیتا ہے میری تمام زندگی کی ریاضتیں، خدمتیں، محبتیں خاک میں مل گئیں، میں نے تو ایسا کچھ نہیں چاہا تھا میں نے آخر اس کے ساتھ برائی کیا کی تھی؟“ انہوں نے سسکیوں کے ساتھ کہا۔

وہ بڑے غور سے بیوی کا چہرہ دیکھنے لگے۔ انہوں نے سگریٹ سلگائی اور سگریٹ کا دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے بڑے کل سے جواب دیا۔

”نسیہ بیگم! یہ تو ایک دن ہونا تھا میں نے تمہارے اصول، کسی نظام میں مداخلت نہیں کی مگر تم نے اپنے لاڈلے اور چھوٹے بیٹے کے سلسلے میں جو حق تلفی کی وہ شاید قدرت کو بھی پسند نہیں آئی۔ اب تمہارا بیٹا جوان ہو گیا ہے۔ وہ اتنا بے وقوف ہے جتنا تم سمجھتی ہو۔“ وہ اٹھ کر ٹہلنے لگے۔

”نسیہ علیم! تمہارے ساتھ شادی کر کے میری پوری شخصیت مسخ ہو کر رہ گئی۔ میں نے جو چاہا مجھے نہیں ملا، میری عادت لڑائی جھگڑے کی نہیں تھی۔ میں بے حد صلح جو انسان تھا مین جب میں نے اپنے مقابلے میں ایک جنگجو قسم کی خاتون کو دیکھا تو مجھے مجبوراً ہتھیار ڈالنے پڑے۔ اس لیے نہیں کہ میں بزل اور گمزور تھا۔ بے اختیار یا قلاش تھا۔ نہیں خدا نے مجھے نہ نعت سے نوازا تھا مگر میں اپنے گھر اور بچوں کو تباہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ویسے بھی ایک گھر میں ایک ہی حکمران ہونا چاہیے دو حکمران ہوتے تو ایک کو مرنا پڑتا۔ سو میں نے خود کو مار لیا اور تمہاری بالادستی قائم رکھی۔ سب بچے شاید تمہارا ہی خیر لے کر پیدا ہوئے کسی نے بھی تمہاری بالادستی قبول نہیں کی اور اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزار دی۔ کسی پر تمہارا بس نہیں چلا۔“

بیٹیوں کو بھی ہمارے جیسے بے وقوف شوہر مل گئے۔ اس میں تمہاری ذہانت اور زمانہ شناسی کا بڑا دخل تھا لیکن ایسا بالکل میرا مزاج لے کر آیا تھا۔ اس نے وہی کیا جو تم نے چاہا۔ وہ میرا بڑا ہی معصوم اور بے ضرر بیٹا تھا جو تمہاری انا اور حکم پسندی کی نذر ہو گیا۔ اس کی بیوی کو تم نے وہ مقام نہیں دیا جو ایک بہو کا ہونا چاہیے تھا۔ اس کے باوجود وہ بے زبان بچی تمہارا ہر ظلم خاموشی سے سہتی رہی، محض اپنے شوہر کی خاطر اور اب جو ہوا وہ اسی سختی اور ظلم کا روع مل تھا۔ شیر شیر ہوتا ہے چاہے تم اسے زنجیروں میں باندھ کر رکھو، چاہے اسے شراب پلا کر بے ہوش کر دو مگر وہ جب بھی ہوش میں آئے گا تو وہ شیر ہی کی طرح دھاڑے گا۔ اس کی فطرت کو کوئی نہیں بدل سکتا۔ سو میرا بیٹا بھی تو آخر مرد ہی تھا نا، کب تک اس کی غیرت نہ جاگتی، یہ حالات تم نے خود پیدا کیے ہیں اب تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟“

”تم اسے سمجھاؤ کہ جا کر آویز کو لے آئے۔“

”دیکھو بیگم! جب میں نے آج تک تمہاری اولاد کے اچھے برے میں دخل نہیں دیا تو اب میں کیوں دوں، مجھے ان جھگڑوں میں نہ ڈالو، جو جی میں آئے کرو۔“ یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔

دوسرے دن جب نسیہ علیم صبح چائے لے کر ابسام کے کمرے میں چکیں تو اس کا بستر خالی تھا۔ اس کی

اٹیچی بھی غائب تھی۔ الماری کھول کر دیکھی تو اس کے کپڑے اور چیزیں بھی اس میں نہیں تھیں۔ ٹیبل پر رکھا انہیں چند لفظوں کا لکھا ایکٹ کارڈ ملا تھا۔
 ”مما آپ جو چاہتی تھیں وہ پورا ہو گیا۔ آویز کے بغیر یہ کمرہ کیا پورا گھر مجھے کاٹنے کو دوڑتا ہے اگر میں اس ماحول میں رہا تو پاگل ہو جاؤں گا۔ چنانچہ مجھے کھلی فضا چاہیے جہاں میں سانس لے سکوں، میں جا رہا ہوں کہاں یہ میں خود نہیں جانتا۔“

ابسام

اور وہ یہ کارڈ لے کر روتی ہوئی شوہر کے کمرے میں چلی گئیں۔
 ”یہ..... یہ دیکھو علیم! میرا بیٹا چلا گیا مجھے چھوڑ کر۔“

یہ کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگیں۔ انہوں نے کارڈ بڑھا اور ان کے پاس بیٹھتے ہوئے بولے۔
 ”نہیں میں تمہیں تسلی دوں گا نہ تمہارے آنسو پوچھوں گا۔ نسیہ بیگم یہ تمہاری کرنی کا پھل ہے۔ جو تمہارے ساتھ اس کی معصوم بیوی اور ہم سب لوگ بھگت رہے ہیں۔ ماں کتنی ہی با اختیار کیوں نہ ہو، اسے اپنے بیٹے، اپنی متاع جاں کو اس کی زندگی، خوشی اور اس کی نسلوں کی بقا کے لیے اس عورت کے حوالے کرنا پڑتا ہے جسے وہ اپنی بہو بنا کر لاتی ہے۔ شادی کے بعد ماں کا کام ختم اور بیوی کا شروع ہو جاتا ہے مگر تم نے تو سارے شعبے اپنے پاس رکھنا چاہے تھے پھر بات کیسے بنتی۔“ وہ مسکرائے۔
 ”چلو مجھے خوشی ہوئی کہ وہ اس ماحول سے نکل گیا۔ تازہ ہوا اور ماحول ہموار راستے تو ملیں گے اسے، میری دعا ہے کہ جہاں رہے خوش رہے۔“ اور وہ اپنی شاپ پر جانے کی تیاری کرنے لگے۔

”تم کتنے بے رحم ہو علیم! تمہیں ذرا بھی مجھ سے ہمدردی نہیں۔“ نسیہ بیگم غصے میں چیخ پڑیں۔
 ”تم نے کب کسی سے ہمدردی کی ہے نسیہ بیگم، تمہیں تو اپنی اولاد سے بھی ہمدردی نہیں۔ تم نے تو مجھے کسی قابل نہیں چھوڑا، مجھے پیہ کمانے والی مشین بنا کر رکھ دیا۔ میں جو گوشت پوست کا بنا ہوا اپنے سینے میں دل رکھنے اور ہسنے ہنسانے خوش رہنے والا انسان تھا تم نے میرے جذبات کا گلا گھونٹ دیا۔ میں اپنی شناخت کھو بیٹھا اگر خدا نے مجھے اولاد نہ دی ہوتی تو شاید میں کسی پاگل خانے میں ہوتا۔ اب تم کیا چاہتی ہو مجھے ایک کونے میں بڑا رہنے دو، مجھے کیوں آکر ڈسٹرب کرنی ہو؟“

نسیہ بیگم آنسو بھری آنکھوں سے انہیں دیکھتی رہیں۔ ان کے اندر بھنور سے پڑنے لگے۔ آج انہیں احساس ہو رہا تھا کہ واقعی انہوں نے علیم کو نظر انداز کر کے اپنے لیے کتنی مشکلات پیدا کر لی تھیں۔
 ”کاش میں نے اتنا لمبا سفر زندگی کے یہ راستے علیم کے قدم سے قدم ملا کر ان کے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر طے کیے ہوتے تو شاید گھر کا یہ نقشہ نہ بنتا، بچوں کے اوپر باپ کا ہولڈر ہوتا اور آج میں گھر اور بچوں کے مسائل کا یہ بوجھ تھا اپنے کاندھوں پر اٹھائے نہ پھرتی۔ تم نے ٹھیک کہا علیم، یہ میری کرنی کا پھل ہے جو میں بھگت رہی ہوں۔“

☆.....☆

آویز کو جب معلوم ہوا کہ ابسام گھر سے چلا گیا تو اسے شاک سا لگا، اس نے سوچا شاید ابسام مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ تب ہی وہ میرے آتے ہی خود بھی چلا گیا جیسے وہ میرے آنے کا منتظر ہو اور وہ بڑی دیر تک روتی رہی۔

”پتا نہیں کیا ہوگا؟ کیا ہونے والا ہے؟“
 میں تو سمجھتی تھی کہ میرے یہاں چلے آنے پر ابسام ہوش میں آجائے گا کچھ اپنی غلطیوں اور ماں کی زیادتیوں کا سدباب کرے گا مگر.....!
 اتنے میں شیما آگئی، آویزا اس سے لپٹ کر روتے ہوئے بولی۔
 ”بھابی! ابسام کیوں چلا گیا؟“ شیما نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔
 ”جانے دو! تم کیوں پریشان ہو رہی ہو، اسے یہی کرنا چاہیے تھا اس کا جانا ہی ہمارے لیے بہتر ہے۔“
 اس نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔
 ”اب کچھ دن اس کے لیے کچھ نہ سوچو اور اپنے بچے کی فکر کرو۔“
 ”اللہ بھابی ابھی سے.....“ وہ مسکرا کر شرما گئی۔
 ”اچھا بھابی! اب تو میں یہاں آگئی ہوں، کوئی خطرہ نہیں ہے اب تو ماما کو پوتے کی خوش خبری سنا دیں۔“

”ہرگز نہیں جب خیر سے وہ دنیا میں آجائے گا تب میں خود انہیں سر پر اتر دوں گی۔“
 تین ماہ گزر گئے تھے آویزا کا ابسام سے اختلاف تھا مگر اس کے جانے کی خبر سے وہ مجھ کر رہ گئی تھی۔ تب ایک دن اسے کارڈ ملا۔ اسے اتنی خوشی ہوئی کہ وہ سینے سے لگا کر رو پڑی۔ کچھ دیر بعد اس نے پیکٹ کھولا لکھا تھا۔
 آویزا جان! تم مجھے بزدل، بے وفا، بے حس جانے کیا کیا سمجھ رہی ہو گی مگر نہ میں بزدل ہوں۔ نہ بے وفا جس کا ثبوت یہ کارڈ ہے۔ میں تم سے بالکل ناراض نہیں۔ سوچو تو میں منتظر تھا۔ زندیاں کا دروازہ پہلے کون کھولتا ہے۔ شکر ہے پہلے تم نے کر دی مگر بہت دیر بعد مگر دروازہ کھلتے ہی دو بے بس پیچھی مختلف سمتوں سے اڑ گئے۔ تمہیں تو منزل مل گئی مگر مجھے اترنے کے لیے کوئی پڑاؤ نہیں ملا۔ واپس بھی نہیں جاسکتا کہ تمہارے بغیر گلستان بھی میرے لیے ویرانہ ہے۔ تم میرے لیے پریشان نہ ہونا میرا انتظار کرنا۔
 تمہارا ابسام

کیسا ادھورا اور نامکمل کارڈ تھا نہ اتانہ پتانہ فون نمبر.....!
 ”ابسام یہ کیا اسرار ہے؟“
 وہ مٹھی میں جکڑ کر رو پڑی مگر اتنا سکون ضرور مل گیا تھا۔ وہ ناراض نہیں ہے اور اس نے اس اقدام کو غلط نہیں سمجھا۔

پھر دن تیزی سے گزرنے لگے اور ایک دن قدرت کا دیا تھا اپنی تمام تر آب و تاب سے اس کی گود میں ہنسنے لگا۔ اسپتال سے وہ گھر آگئی تھی۔ تب ایک دن شیما مٹھائی گئے ڈبے کے ساتھ خالہ جان کو ان کے پوتے کی نوید سنانے چلی گئی اور ڈبے سے ایک برنی کا پیس نکال کر ان کے منہ کی طرف بڑھائی تو انہوں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اپنا منہ کھول دیا۔
 شیما نے جلدی سے برنی ان کے منہ میں ٹھوس دی اور ہنسنے لگی۔

”کیا بات ہے بھئی بہت خوش ہو، کسی مٹھائی ہے یہ؟“
 ”پہلے آپ دل بھر کے مٹھائی کھالیں تب بتاؤں گی۔“ اس نے دوسری برنی اٹھائی۔
 ”نہیں، پہلے مجھے بتاؤ بات کیا ہے؟“ انہوں نے اس کا ہاتھ ہٹا کر پوچھا۔

”خالہ جان! آپ کو پوتا مبارک ہو۔ آویز کا بیٹا آج پانچ دن کا ہو گیا ہے۔ ماشاء اللہ بہت پیارا ہے۔“ وہ ہلکھلا کر ہنس پڑی اور نسیم بیگم نے کھڑے ہو کر بڑی حیرت سے کہا۔
 ”ہائیں آویز کا بیٹا! یعنی میرے اسام کا وارث آگیا اور مجھے خبر نہیں۔“ انہوں نے شیمہ کی طرف دیکھا۔

”یہ کب..... میرا مطلب ہے.....!“ وہ گڑبڑا گئیں۔
 ”خالہ جانی! جن دنوں یہاں آویز کی طبیعت خراب تھی اور ایک دن میں اسے گھمانے پھرانے کا کہہ کر کلینک لے گئی تھی۔ تب لیڈی ڈاکٹر زہرا نے انکشاف کیا کہ وہ امید سے ہے۔“
 ”تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا؟“ وہ روہاسی ہو گئیں۔
 ”خالہ جان میں آپ کو سر پرانزد دینا چاہتی تھی۔“
 ”سر پرانز یاد رکھ؟“

”آپ اسے جو بھی معنی دیں لیکن یہ حقیقت تھی کہ آویز کو کھلی فضا اور تبدیلی آب و ہوا کی شدید ضرورت تھی اور ڈاکٹر کی سختی سے ہدایت تھی کہ اسے کسی قسم کا ٹینشن نہ ملے۔ اس لیے میں نے اس کی امی کو ساری تفصیل بتادی اور وہ آکر اسے لے گئیں۔ حالانکہ آویز اور ان کی امی کا اصرار تھا کہ یہ بات آپ کو بتادی جائے لیکن میں نے یہ بہتر نہیں سمجھا۔“
 ”تم کون ہوتی ہو، میرے معاملات میں ناٹنگ اڑانے والی؟“ نسیم بیگم ایک دم ہڑک اٹھیں اور خونخوار نظروں سے اس کو دیکھنے لگیں۔

”لو، میں کچھ ہوتی نہیں اس کی، ایک تو خالہ جان آپ کا حافظہ اتنا کمزور ہو گیا ہے ارے میں آویز کی چھوٹی جنھانی ہوں اور اس کے بچے کی چھوٹی تائی۔ ہائے کتنا اچھا لگے گا جب وہ اپنی توتلی زبان سے مجھے تائی جان بولے گا اور میرے شامی کو بھائی جان کہے گا۔“ وہ خوش ہو کر بولی۔
 ”بھائی میں جاؤں۔“ مجھے تو تھوڑا سا زہرا لہا کر کھلا دو۔ غضب خدا کا میرے خون نے میرے ساتھ دغا کی اور مجھے یقین ہے کہ آویز کو تم نے ہی میرے خلاف بہکایا ہوگا۔ ورنہ وہ تو بڑی معصوم اور محبت کرنے والی لڑکی تھی۔ افسوس میں نے ہی اس کی قدر نہ کی۔“
 ”ہائے خالہ جان! وہ معصوم لڑکی تو اب بھی آپ سے محبت کرتی ہے، کہہ رہی تھی کہ پوتے کو دادی سے ملانے لے جاؤں گی۔ میں نے اسے منع کر دیا۔“

”خدا غارت کرے تجھے تو نے مجھ سے کب کا بدلہ چکایا ہے۔“ انہوں نے تین چار ہتھڑا اس کے جڑ دیئے۔

”تو تو میرا خون تھی، اپنی تھی میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تو میرے ساتھ سازش کر کے میرے ہی گھر کو توڑے گی مجھے ذلیل کرے گی۔“ نسیم بیگم رونے لگیں۔
 شیمہ پاس بیٹھ کر ان کے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

”خالہ جان! بہو کوئی مٹی کی بنی ہوئی نہیں ہوتی۔ اس کے بھی ارمان ہوتے ہیں اسے بھی زندگی اپنے طور سے گزارنے کی آرزو ہوتی ہے مگر آپ جیسی سخت گیر عورتوں نے ہی ساس بہو کے رشتوں کو ناقابل تسخیر اور نفرت زدہ بنا دیا ہے۔ یہ تو سراسر غلط ہے۔ جب آپ اسے نہیں مانیں گی تو وہ کب آپ کو مانے گی۔ بولے

میں نے غلط کہا؟“ وہ بولی۔

”مجھے ہی دیکھ لیں، آپ نے مجھے کب مانا، اپنی ڈگر پر چلانا چاہا۔ مجھے کب حقوق دیئے وہ تو میں نے خود ہی اپنے آپ کو منوایا جس طرف چاہا زندگی کا رخ موڑ دیا کیونکہ یہ زندگی میری اپنی تھی۔ جسے گزارنا بھی مجھے ہی تھا۔ میں آویز نہیں تھی۔

”اچھا ساسو ماں، اب غصے کو تھوک کر اپنے پوتے کو دیکھنے کی تیاریاں کریں، بائے۔“ وہ ہاتھ سے اشارہ کر کے آنکھوں سے اوجھل ہو گئی اور نیسہ بیگم دیکھتی رہ گئیں۔

☆.....☆

نسیہ علیم، بھانجی کے کڑوے مزاج اور خود سری سے واقف تھیں وہ کبھی اسے اپنی بہو نہ بتاتیں۔ اگر زاور خود کشی کی دھمکی نہ دیتا۔ وہ بیٹے کے ہاتھوں مجبور ہو گئیں اور بھانجی کو بہو بنا کر گھر لے آئیں۔ اس نے گھونگھٹ اٹھاتے ہی اپنے جوہر دکھانا شروع کر دیے۔ اس نے ساس کو خوب انجی مرضی پر نچایا اور نسیہ بیگم اس کے ہاتھوں کھلوانی رہیں۔ ان کی دال اس لیے نہیں گئی کہ ایک تو بہن کی بیٹی تھی، دوسرے بیٹے کی چیمٹی پھر جیڑ بھی انہوں نے دل کھول کر دیا تھا۔ اس لیے وہ صرف کڑوے گھونٹ پی کر رہ جاتی تھیں۔ اب بھی انہوں نے اس کی باتوں پر ایک تھنڈی سانس بھری اور پوتے سے ملنے کی تیاری کرنے لگیں۔ تیاری کر کے وہ سدھیانے پہنچ گئیں۔ انہیں آتا دیکھ کر سب حیران رہ گئے۔

نسیہ علیم نے سب سے پہلے بہو کو گلے لگایا۔ پیار کیا بیٹے کی مبارک باد دی۔ اس کے بعد پوتے کو اٹھا کر سینے سے لگالیا۔ پھر بڑی دیر تک اسے پیار کرتی رہیں۔ ان کا دل بھر بھر آ رہا تھا وہ سوچ رہی تھیں کہ اس وقت ابسام ہوتا۔ انہوں نے آویز سے کہا۔

”بیٹی! ابسام گھر سے چلا گیا ہے کیا تمہیں اس کے متعلق کچھ معلوم ہے؟“

”نہیں ماما! مجھے کچھ پتا نہیں کہ وہ کیوں گئے اور کہاں ہیں؟“

”اگر اس کا کچھ اتا پتا معلوم ہو جائے تو کہنا ماما بہت پریشان ہیں گھر آ جاؤ۔ خدا نے تمہیں بہت پیارا بیٹا دے دیا ہے اب تم پر کوئی پابندی نہیں۔“ انہوں نے اسے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

”بیٹی! تم پر بھی اب کوئی پابندی نہیں جہاں جی چاہے گھومو پھرو۔ کھاؤ پیو خوش رہو۔“ یہ کہہ کر وہ آویز کو لپٹا کر رو پڑیں۔

”میرا گھر سونا ہو گیا ہے بیٹی، اگر تم یہاں نہ آتیں تو شاید ابسام بھی کہیں نہیں جاتا۔“

”بہن خیر سے آپ کی دوسری بہویں بھی تو ہیں۔ آپ ان کے بچوں سے دل بہلائیں اب جب تک ابسام آویز کو خود لینے نہیں آئے گا میں ہرگز نہیں بھیجوں گی۔“ آویز کی امی نے کہا۔

مگر ایک سال کے بعد دوسرا سال اور پھر تیسرا سال بھی شروع ہو گیا۔ ابسام نہیں آیا۔ البتہ اس عرصے میں ابسام کے چار کارڈ آویز کو ملے جس میں آویز کے لیے نیک جذبات، محبت بھری دعائیں لکھی تھیں۔ یہ کہ میں جلد آؤں گا۔ تمہاری راہوں کے سارے کانٹے اپنی پلکوں سے چن کر انہیں پھولوں سے سجا دوں گا۔ تمہارے ایک ایک کرب کا ازالہ کروں گا بس تھوڑا سا انتظار اور۔

”آخر تک؟“ وہ سسک پڑی۔

”اسے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ اب ہم دو سے تین ہو گئے ہیں۔ اس کا بیٹا بھی اب بھاگنے دوڑنے اور

باتیں لرنے لگا ہے، اسے یہ کون بتائے گا؟ یا اللہ یہ کیسی سزا ہے؟“
نسیہ عظیم کا جب دل زیادہ گھبراتا تو بہو سے بیٹے کی خبر لینے آ جاتیں۔ پوتے کو پیار کرتیں اور رو دھو کر چلی جاتیں۔ آویز کو ان پر ترس آنے لگا تھا۔

☆.....☆

رمضان شریف شروع ہو چکے تھے۔ عید آنے والی تھی مگر جانے وہ عید کب آئے گی۔ جب وہ اور ابسام اپنے بچے کے ساتھ مل کر عید منائیں گے۔ وہ سوچ سوچ کر یاگل ہونے لگتی۔
تین سال سے اس نے عید نہیں منائی۔ عید کے کپڑے نہیں پہنے۔ گجرے نہیں پہنے۔ مہندی نہیں لگائی۔ ست رنگی چوڑیاں نہیں پہنیں۔ حالانکہ ماں اور ساس ہر عید پر اس کے لیے عید کے کپڑے، مہندی اور چوڑیوں کا اہتمام کرتی تھیں مگر وہ انہیں اسی طرح اٹھا کر الماری میں رکھ دیتی تھی۔
آج ساتھیوں کا روزہ تھا۔ صبح ہی سے اس کا دل بہت اداس تھا۔ جیسے جیسے عید کے دن قریب آرہے تھے وحشت اور ویرانی بڑھ رہی تھی۔

ابسام سے اسے علیحدہ ہوئے چار سال ہو گئے تھے۔ افطاری کا اہتمام کر کے وہ امی کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھی کہ افطار کا ٹائم ہو گیا۔ اس نے وضو کیا اور سب کو کھانا دے کر وہ نماز پڑھنے کھڑی ہو گئی۔ دعا مانگتے ہوئے اس کی پلکیں جھپک جھپک گئیں۔ گیٹ بجاتا تو اس کا دل بے ساختہ دھڑک اٹھا۔
عید میں دو دن باقی تھے۔ وہ اچانک آ گیا ہاتھ میں صرف ایک سفری بیگ تھا۔ بڑا فریش اور خوشگوار موڈ میں لگ رہا تھا۔ جیسے وہ لمبے سفر سے نہیں کمرے سے تیار ہو کر آ رہا ہو۔ آویز نے اسے دیکھا اور گھبرا کر آنکھیں ملنے لگی۔ بیٹا ماں کی ناگوں میں لپٹ کر حیرانی سے ابسام کی طرف دیکھنے لگا۔ ابسام نے بیگ ہاتھ سے پھینکا اور لپک کر بچے کو اٹھا کر سینے سے لگا کر بے قراری سے چومنے لگا۔
”میرا بیٹا، میری جان۔“

”کہاں تھے آپ؟“ آویز اس کے پہلو سے لگ کر رونے لگی۔
”نہیں آویز پلیز روؤ نہیں اب میں آ گیا ہوں۔ کہیں نہیں جاؤں گا۔“ اس نے بیٹے کو نیچے اتارا اور اس کے آنسو پونچھنے لگا۔ بچہ گھبرایا ہوا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں گھر میں سب کو اس کے آنے کی خبر ہو گئی۔ ماں نے آ کر اسے گلے سے لگا لیا۔
”السلام علیکم امی!“

”جیتے رہو، خوش رہو بیٹا کیسے ہو، کیا گھر سے آ رہے ہو؟“ اسے خوش باش اور فریش دیکھ کر انہوں نے پوچھا۔

”کیسا گھر کس کا گھر امی؟“

”تمہاری ماما کا گھر اور کس کا گھر۔“

”نہیں امی! اسے گھر نہیں زندان کہیے۔“

”اچھا خیر یہ بتاؤ تمہارا سفر تو اچھا گزر رہا؟“

”جی امی! تین سال سے مسلسل مسافت میں ہوں۔“ وہ ہنس پڑا۔

”تمہیں اپنے بیٹے کے متعلق معلوم تھا؟“

”کیوں امی! آپ نے مجھے اتنا بے خبر سمجھا تھا؟“
”کس نے بتایا؟“

”یہ ابھی نہ پوچھیں۔“ وہ پھر ہنسا۔

”اچھا تم بیٹھو میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔“

بابا اور بھائی بھی نماز پڑھ کر مسجد سے آگئے اسے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔

”السلام علیکم ابوجی۔“ وہ اٹھ کر ان کی طرف لپکا۔

”جیتے رہو بیٹا تم کب آئے؟“ انہوں نے اسے گلے سے لگایا۔

”بس ابھی آیا ہوں۔“

پھر بھائی آکر بغل گیر ہو گیا۔ ہنس کر بولا۔ ”واہ بھائی جان! عید سے پہلے عید کا چاند نظر آ گیا۔ بابی مبارک ہو عید کا پہلا چاند۔“ بھائی نے مسکرا کر آویز کو پچھڑا تو وہ شرمائی۔

افطار کا خصوصی اہتمام کیا گیا تھا۔ بڑی سی ٹیبل مختلف کھانوں سے بھری ہوئی تھی۔ سب نے ہنستے مسکراتے ہوئے روزہ افطار کیا۔ ایک عرصے کے بعد ابسام کو گھر کے کھانے اور افطار کا لطف آیا تھا۔ نماز پڑھ کر ابسام نے ساس سے کہا۔

”امی جان! اب مجھ سے کھانے کا اصرار نہ کیجیے گا۔ اب میں آرام کروں گا۔“

”ارے بیٹا! تھوڑا سا تو کھا لیتے؟“

”نہیں امی! ذرا بھی گنجائش نہیں۔“ یہ کہہ کر وہ آویز کے ساتھ کمرے میں چلا گیا۔ وہ رات شکایتوں اور

حکایتوں کی رات تھی۔ رونہ بھی اور منانے کی رات تھی۔

”میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی آپ اتنا طویل عرصہ میرے بغیر گزار لیں گے۔ اتنی بڑی دوری سے لیں گے؟“ آویز نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

”آویز! حالات انسان کو بہت کچھ سہنے پر مجبور کر دیتے ہیں اب میں آ گیا ہوں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ ابسام مسکرا کر بولا۔

”اچھا یہ بتائیے کہ بیٹے کے آنے کا کس نے بتایا آپ کو؟“

”میں نے اپنے جاسوس چھوڑے ہوئے تھے جو مجھے لمحے لمحے کی خبر دیتے رہتے تھے۔“ اس نے

شرارت سے کہا۔

”اور اب تک آپ کہاں تھے؟ کتنے ملک گھومے۔ یورپ میں کتنا وقت گزارا؟“ وہ بھی شریر لہجے میں بولی۔

”یورپ میں نہیں میرے ملک، میرے شہر سے اچھی بھی کوئی جگہ ہے بھلا۔“ اس نے ہتھکڑیاں لگایا تو آویز گھبرا کر بیٹھ گئی۔

”کیا مطلب ہے آپ کا پھر آپ نے یہ تین سال کہاں گزارے، کہاں روپوش رہے؟“

”اس اپنے ملک، اپنے شہر میں اور کہاں؟“ وہ بدستور مسکراتا رہا۔

”آپ مذاق کر رہے ہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”کیوں نہیں ہو سکتا۔“

”مجھے یقین نہیں آرہا۔ آپ تین سال کراچی میں رہے، کسی کی نگاہ بھی نہ پڑی آپ پر، نہ آپ کا جی چاہا ملنے کے لیے، صبر کیسے آیا آپ کو یہ تو ایک ان نیچرل سی بات ہوئی۔“

”ہاں آویز! تم یہ بات کہہ سکتی ہو۔ میں دریا میں رہ کر بھی پیاسا ہی رہا۔ یہ میرا ضبط کا کمال تھا۔ یہ میری محنت تھی جو میں نے اپنے آپ کو بدلنے کے لیے کی تھی۔ پاپا نے مجھے ایک راستہ دکھایا تھا۔ میں نے ایک تو لیہ فیکٹری کھول لی۔ پاپا نے مجھے سرمایہ فراہم کیا، آدی دیئے، فیکٹری نے کام شروع کر دیا۔ پاپا کے ایک دوست تھے جو اس کام میں ماہر تھے۔ انہوں نے مجھے گائیڈ کیا اور فیکٹری چل پڑی۔ یہ بڑی ذمے داری اور محنت کا کام تھا۔ یکسوئی اس صورت میں مجھے مل سکتی تھی کہ میں اس ماحول سے اس گھر سے نکلوں اور اپنا مستقبل بناؤں۔ ممائی محبتوں اور لاڈ پیار نے مجھے بالکل ناکارہ بنا دیا تھا، پاپا کی کوئی شنوائی نہ تھی، تب انہوں نے نہایت رازداری کے ساتھ یہ پروگرام ترتیب دیا۔ میں پہلے ہی اس یکسانیت اور ٹھن سے اکتایا ہوا تھا پھر تمہیں پریشان دیکھتا تو جی چاہتا زہر کھا کر خودکشی کر لوں یا جا کر سمندر میں چھلانگ لگا دوں۔ لعنت میری مردانگی پر میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ بس پاپا نے جب مجھے اعتماد میں لے کر اپنا پلان بتایا تو میں فوراً تیار ہو گیا مگر شرط یہی تھی کہ میں کسی کی نظروں میں نہ آؤں، شوبہی کروں میں ملک سے باہر گیا ہوا ہوں۔ تب ہی تو کامیابی ممکن ہے۔ ورنہ لوگ تمہیں کب چھوڑیں گے۔ میں نے انتھک محنت کر کے فیکٹری کو دن دو گنی رات چو گنی ترقی دی اللہ نے مجھے کامیابی سے ہمکنار کیا ترقی دی، اب دوسری فیکٹری کا پلان بھی زیرِ غور ہے۔ گارمنٹس فیکٹری کا انشاء اللہ وہ بھی منظر پر آجائے گی ایک دن۔“ اس نے داد طلب نظروں سے مسکرا کر دیکھا۔

”واقعی ابسام! آپ نے تو کمال کر دیا۔ آپ تو میری سوچوں میرے تصور سے زیادہ بلند نکلے۔“ آویز کی آنکھوں میں آنسوؤں کا ڈبانا لگے جو شکر اور فخر کے آنسو تھے۔

”اتنا ضبط، اتنا صبر، بہت مشکل تھا جسے آپ کی محبت نے آسان بنا دیا۔“
”آویز! میں نے تمہاری پلکوں پر سچے ہوئے حسین خوابوں کو تعبیر بخش دی ہے۔ اب تو تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں؟“

”مجھے پہلے بھی آپ سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ اب تو آپ نے مجھے سب کچھ دے دیا۔“ آویز نے اس کے شانے پر سر رکھ کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس رات کی طرح وہ صبح بھی بہت خوب صورت اور سہانی تھی۔ پھر ابسام نے ساس سر سے گھر جانے کی اجازت مانگی جو خوشی مل گئی اور وہ صبح ہی آویز اور بیٹے کے ساتھ گھر چلا گیا۔ نسیمِ علیم کو تو جیسے دیوانگی سوار ہو گئی۔ وہ بیٹے کو لپٹا کر بھی ہنسی بھی رونے لگتیں۔ بھی پوتے کو سینے سے لگا کر پیار کرتیں بھی، بہو کو گلے سے لگا لیتیں۔ باپ بھائی، بھابھیں سب ہی صدقے واری جارہے تھے۔ آخر وہ عید آ ہی گئی تھی جس کا انتظار تھا۔ اس میں ایک ننھے مہمان کے اضافے نے عید کی خوشیوں کو دو بالا کر دیا تھا۔ ایک عرصے کے بعد سب بھائی بہن اور ان کے بچے اکٹھے ہوئے تھے۔ نسیمِ علیم پھولے نہیں سمار ہی تھیں۔ علیم صاحب بھی خوش تھے، سدا کی بد مزاج، خود پسند، سخت گیر نا انصاف بیوی بھی اب شوہر کا طواف کرنے لگی تھی۔ بڑی نرم نرم مسکراہٹوں سے نسیمِ بیگم، علیم صاحب کو دیکھ رہی تھیں۔ آویز نئی دہیوں کی طرح تیار ادھر سے ادھر ہنسی مسکراتی پھر رہی تھی۔ آج اسے وہ سب کچھ مل گیا جس کی اس نے کبھی تمنا کی تھی۔

.....☆.....

تہمینہ بانو

ناولٹ

مکانِ جنت

شہر خاموشاں میں ہمیشہ کی طرح پرندوں کی
چچہاہٹ اور پتوں کی سرسراہٹ نے اس کو ویلکم کیا
تھا، وہ لمبے لمبے مضبوط قدم اٹھاتا مخصوص قبروں تک
پہنچا۔ پہلے ان قبروں پر گلاب کے پھول اور گلیوں کی





نے گھٹنوں میں سر نہیں دیا تھا۔ وہ اس قبر کی طرف دیکھ رہی تھی جس کے سر ہانے وہ بیٹھی تھی۔ چہرہ اس کا مکمل چادر کی اوٹ میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے غصے اور جھجھک کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اسے ایک نظر دیکھا اور بلا ارادہ ہی اس کی طرف چل دیا۔

”کیا آپ کو پتا ہے اس جگہ عورت ذات کا آنا ممنوع ہے؟“ وہ اس کے سر پر کھڑے ہو کر بھاری اور تیز آواز میں بولا تو لڑکی نے چونک کر آواز کی سمت دیکھا۔

وہ ایک دفعہ پھر تیز آواز میں بولا۔ لڑکی نے آنسو بھری آنکھوں سے ایک نظر اسے دیکھا اس کے سامنے سر جھکائے کھڑی ہو گئی۔ اس کی بڑی بڑی پرکشش آنکھیں جو آنسوؤں سے لبریز تھیں معصومیت بھرا چہرہ ایک پل کو اسے ٹھہرا گیا تھا۔

”آپ یہاں کیوں آئی ہیں؟“ اب کی بار اس کے لہجے میں کافی حد تک نرمی تھی۔ وہ آج کافی عرصے بعد کسی عورت ذات سے مخاطب تھا۔

”میں یہاں آئی نہیں، یہاں رہتی ہوں۔“ اس نے سر جھکائے ہی آنسو بھری آواز میں کہا۔

”آپ گارجین کی کیا لگتی ہیں؟“ اس نے اپنے سے کافی فاصلے پر کھڑے اس شخص کو دیکھا جو کسی کی قبر پر پانی کا چمڑکاؤ کر رہا تھا۔ ایک پل اسے دیکھنے کے بعد دوبارہ لڑکی کی طرف متوجہ ہوا جو نفی میں سر کو ہلا رہی تھی۔ اب کی بار اسے شدید دھچکا لگا۔ یعنی وہ اس گورکن کی کچھ نہیں لگتی تو پھر یہاں.....

”تو پھر یہاں کیوں ہیں آپ.....؟“ اس کے لہجے میں پھر تیزی آ گئی تھی۔

”اس انتظار میں ہوں کہ شاید ماں کو مجھ پر رحم آجائے اور مجھے بھی آغوش میں لے کر اپنے ساتھ سلا لیں جیسا کہ بچپن میں سلا یا کرتی تھیں۔“ اس نے کہتے ہوئے اس قبر کو دیکھا جس کے پاس وہ کھڑی تھی۔ آنسو اس کے رخساروں کو مسلسل جھگور رہے تھے

پتیاں بکھیریں، بکھرتے کے ساتھ ہی جن کی خوشبودار تک پھیل گئی تھی۔ اس کے بعد ان دونوں قبروں پر اس نے دعا پڑھی۔ جیسے ہی واپسی کے لیے مڑا بلا ارادہ ہی اس کی نظر سامنے کی طرف اٹھ گئی۔ وہ آج بھی وہیں مخصوص قبر کے سر ہانے پر ہی سی بلک چادر اوڑھے گھٹنوں میں سر دینے بیٹھی تھی۔ جہاں وہ اسے مسلسل پچھلے پندرہ دنوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے پورے قبرستان پر نظر دوڑائی جہاں اسے گورکن اور اس لڑکی کے علاوہ کوئی دوسرا نظر نہیں آیا تھا۔ اس نے چند سیکنڈ لڑکی کو دیکھا پھر سر جھٹکتا ہوا اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔



دن بھر کی مصروفیت کے بعد رات کو جیسے ہی وہ سونے کے لیے لیٹا بند آنکھوں میں وہی مکمل بلک چادر میں پچھی لڑکی سا گئی۔ اس نے پٹ سے آنکھیں کھولیں، اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”بارکون ہے وہ..... وہاں کسی کی قبر پر آتی ہے باقاعدگی سے۔ کیا وہ گورکن کی کچھ لگتی ہے۔ اگر وہ اس کی کچھ لگتی ہے تو کچھ دنوں سے پہلے اسے بھی وہاں نہیں دیکھا تھا جب کہ گورکن کو تو میں تب سے وہاں دیکھتا ہوں جب سے وہاں جانا شروع کیا تھا۔“ وہ خود سے ہی سوال و جواب کر رہا تھا۔ یہ بھی سچ ہے کہ جب سے اس کے والدین فوت ہوئے تھے وہ بہت کم وہاں جاتا تھا لیکن جب سے لڑکی کو دیکھا تھا بلا ناغہ وہاں جانا شروع کر دیا۔ پتا نہیں کون سی طاقت اسے وہاں صاف لے جاتی تھی۔ لڑکی کو بھی اس نے اس کے پاؤں میں پہنی جوتی سے پہچانا تھا کہ وہ کوئی لڑکی ہے ورنہ باقی وجود تو اس کا مکمل چادر میں چھپا ہوتا تھا۔

آج بھی وہ افس جانے سے پہلے شہر خاموشاں کی طرف چل دیا۔ وہاں پہنچ کر اپنے والدین کی قبروں پر فاتحہ پڑھی اور مڑ کر اس جگہ کی طرف دیکھا جہاں وہ آج بھی اپنے مخصوص حلیے میں بیٹھی تھی لیکن آج اس

جسے اس نے ایک دفعہ بھی صاف نہیں کیا تھا۔

”واٹ رہش! پاگل تو نہیں ہیں آپ۔“

”کاش ہو جاتی۔“

”آپ چلیں میرے ساتھ۔“ اس نے سوچے سمجھے بغیر اپنی کلائی پر بندھی رسٹ واچ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”مگر کہاں؟“ اب کی بار اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

”میرے گھر۔“ وہ بھی اسی کو ہی دیکھ رہا تھا۔

”کس حیثیت سے۔“

”انسانیت کے ناطے۔“

”سوری! مجھ میں اور ذلت برداشت کرنے کی

ہمت نہیں۔“ کہنے کے ساتھ ہی اس نے رخ موڑ لیا تھا۔

”یہاں جو ذلت اٹھا رہی ہیں اسے برداشت کرنے کی ہمت ہے۔“

”جہاں آپ کو اپنی عزت و ناموس محفوظ نظر آئے وہاں ذلت برداشت ہو جاتی ہے۔“

”میں نہیں سمجھتا کہ یہاں آپ کی عزت و ناموس محفوظ ہے۔“

”لوگوں کی نظروں سے تو دور ہوں۔“

”یہ بھی آپ کی غلط فہمی ہے۔“ اس نے اسے سر اٹھا کر دیکھا جو خواہ مخواہ بات کو طول دے رہا تھا۔

”آپ میرے ساتھ میرے گھر چلیں۔ اس بات کی گارنٹی میں دیتا ہوں کہ آپ کی عزت پر کوئی حرف

نہیں آئے گا۔ میرے گھر کی چار دیواری آپ کے لیے محفوظ پناہ گاہ ثابت ہوگی۔“ پتا نہیں اس لڑکی میں

ایسا کیا تھا کہ اسے اپنے گھر میں رہنے کی آفر کر رہا تھا۔ اس سے پہلے اس نے بھی کسی لڑکی کے لیے اتنی

ہمدردی اپنے دل میں محسوس نہیں کی تھی۔

”آپ اس طرح کیوں اصرار کر رہے ہیں

کہ I don't know? but I know

آپ.....“

”میں آپ پر کیسے trust کر لوں۔“

”آپ کو خود پر ہے۔“ اس نے بھی اس کی بات کو کاٹ کر بولا۔ اس نے الٹا سوال کر ڈالا جس پر وہ کچھ بول ہی نہ سکی۔

”آپ کو خود پر ٹرسٹ تو ہوگا آئیے۔“ سپاٹ سے انداز میں کہتا وہ اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتا آگے کی طرف چل دیا۔ کچھ سوچ کر وہ بھی اس کے پیچھے چل دی۔ ون تو جیسے تیسے گزر رہی جاتا تھا لیکن رات وہ خوف و ہراس میں رہ کر ڈرے سہے ہوئے گزارتی تھی۔

☆.....☆

”آپ کا نام کیا ہے؟“ گاڑی ڈرائیو کرتے اس نے اس سے پوچھا جو اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی گود میں رکھے ہاتھوں کو ایک دوسرے میں

پیوست کیے شاید کپکپاہٹ کو دور کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے ایک نظر اس کے ہاتھوں کو دیکھا

جو واضح کپکپا رہے تھے۔ اس نے اس کا اعتماد بحال کرنے کے لیے دوبارہ وہی سوال کیا۔

”جی..... ہادیہ ذوالقرنین.....“ اس نے سر جھکائے ہی جواب دیا۔

”Wow very nice name۔ میرا نام

حدید عالم ہے۔ ویسے ملتے جلتے نام ہیں۔“ حدید نے دوستی والے انداز میں کہا لیکن وہ چپ رہی۔ اس

نے مین گیٹ کے باہر گاڑی روکی اور اسے اترنے کا کہتا ہوا خود بھی باہر نکل آیا۔ اسے ساتھ لیے وہ گھر کے لاؤنج میں داخل ہوا۔

”یہ گھر آج سے آپ کے حوالے۔“ اس نے چابیوں سے بھرا کی رنگ اس کے ہاتھ میں تھماتے

ہوئے کہا تھا۔ وہ تو یہ سوچ کر ہی گھبرا اٹھی کہ وہ اکیلا

رہتا ہے اور وہ رستے میں یہ سوچتی آرہی تھی کہ اس کے گھر والوں کو کیسے فیس کرے گی۔

”آپ کی ضرورت کی ہر چیز اس گھر میں موجود ہے اگر پھر بھی کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا جھجک آپ مجھ سے کہہ سکتی ہیں۔ I hope آپ کو یہاں کوئی پرالہ نہیں ہوگی۔ میں اب چلتا ہوں آل ریڈی آفس سے کافی لیٹ ہو چکا ہوں باقی باتیں واپسی پر کریں گے۔ اوکے ٹیک کیئر۔ میں مین گیٹ لاک کر کے جا رہا ہوں۔ آپ اندرونی دروازہ لاک کر لیجیے گا ایک چابی میرے پاس ہے ویسے تو یہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ پھر بھی احتیاط لازمی ہے۔ اللہ حافظ۔“ وہ اس کی سنے بغیر اپنی ہی کہتا اندرونی دروازہ عبور کر گیا تھا۔

☆.....☆

وہ جو ہونق بنی کھڑی تھی کافی دیر اسی پوزیشن میں کھڑی رہی۔ حدید کی گاڑی اسٹارٹ کرنے کی آواز پر وہ چونکی۔ اس نے اپنے پاؤں کے پاس پڑا کی رنگ اٹھایا جو پتا نہیں کب اس کے ہاتھ سے گر گیا تھا۔ اس نے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ بڑا سا لاؤنج، چار کمرے، ایک ڈرائنگ روم اور ایک کچن پر مشتمل یہ کافی اچھا گھر تھا۔ لاؤنج میں ہر طرف بکھری چیزوں نے اس کی خوب صورتی کو ماند کر دیا تھا۔ اس نے آدھا گھنٹا لگا کر سب چیزوں کو اپنی جگہ سیٹ کیا تھا۔ بھوک کی شدت کو منانے کی غرض سے کچن کا رخ کیا۔ کچن کی حالت دیکھ کر ہی وہ گھبرا اٹھی تھی۔ سنک گندے برتنوں سے بھرا ہوا تھا۔ چولہا اتنا گندا تھا کہ اس کا کمر بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ پورا کچن اپنی حالت خود بتا رہا تھا کہ یہاں عرصہ دراز سے کسی عورت ذات کا گزر نہیں ہوا۔ اس نے گھنٹا لگا کر کچن کو صاف کیا۔ پھر سکون سے ناشتا کیا۔ پھر اس نے کمروں کا جائزہ لیا۔ جس میں دو لاکھ تھے جو شاید گیٹ روم کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ دو آن لاک تھے۔ ایک کی طرف بڑھی وہ کمرہ کافی زبردست ڈیکوریت کیا ہوا تھا اسے دیکھ کر ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ کمرہ باقاعدگی سے صاف کیا جا رہا تھا۔ غالباً یہ حدید کا کمرہ تھا۔ پورے

کمرے میں کلوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی جو اس کے حواسوں کو منتشر کر رہی تھی۔ کمرے کی ڈیکوریشن، لوکیشن، فرنیچر کی سیٹنگ اور خاص طور پر پیٹنگ کو دیکھ کر اسے اپنا گھر اور خاص طور پر اپنا بیڈ روم شدت سے یاد آیا تھا۔ اچانک اس کی نظر بیڈ کے سائڈ ٹیبل پر فریم شدہ تصویر پر پڑی وہ حدید کی تھی جو وہاں مسکرا رہا تھا۔ اس نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے اس تصویر کو غور سے دیکھا۔ وہ بلاشبہ ہینڈسم، چارمنگ اور ڈیپنٹ مرد تھا۔ ہادیہ اسے سراہے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ واقعی ہی زبردست مرد تھا۔ وہ دوسرے کمرے کی طرف بڑھی وہاں چیزوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کمرہ کسی عورت ذات کے استعمال میں رہ چکا ہے۔ وہ کمرے کے چاروں اطراف ایک نظر ڈالتے ہوئے بیڈ پر نیم دراز ہوئی۔ کافی دنوں سے وہ سکون کی نیند نہیں سوتی تھی۔

☆.....☆

رات گئے حدید کی واپسی ہوئی تھی۔ لاؤنج میں قدم رکھتے ہی اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ اسے کافی عرصے بعد آج لاؤنج اپنی اصلی حالت میں نظر آ رہا تھا۔ درندہ کا بڑا خانہ ہی لگا کرتا تھا۔ ذہن پر زور دینے سے یاد آیا کہ آفس جانے سے پہلے وہ کسی لڑکی کو اس گھر میں چھوڑ کر گیا تھا۔ جسے گھر واپسی تک وہ بالکل بھول چکا تھا۔ کچھ سوچتے ہوئے وہ کچن کی جانب چل دیا۔ کچن کو دیکھ کر اسے یقین کرنا پڑا کہ وہ لڑکی کافی صفائی پسند ہے۔ چلو کسی لڑکی کو گھر لانے کا یہ فائدہ تو ہوا گھر، گھر لگنے لگا ہے۔ وہ مسکرا کر اپنے لیے کھانا نکالنے لگا۔

پورا ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ ہادیہ کو یہاں رہتے ہوئے وہ بہت کم اس کے سامنے آئی تھی لیکن جب بھی سامنے آئی اسے چونکا ہی دیا تھا وہ مکمل سادگی کا پیکر تھی۔ اٹھنے بیٹھنے کھانے پینے غرض ہر کام میں بہت اچھی ثابت ہو رہی تھی۔ اسے یہ یقین کرنا پڑا کہ وہ ایک باحیالڑکی ہے۔ اس کے باوجود اس کے دل میں

جو عورت ذات کے لیے نفرت تھی اس میں ایک ارج بھی کی نہیں آئی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کے ساتھ تو میرا کوئی ریلیشن نہیں ہے اس لیے وہ اس طرح دکھائی دیتی ہے۔

☆.....☆

آج سُنڈے تھا۔ حدید نماز ادا کرنے کے بعد جوگنگ کے لیے چلا گیا تھا۔ واپسی پر اس نے دیکھا بادیہ کا کمرہ ابھی تک لاکڈ تھا۔ بلا ارادہ وہ اس کے کمرے کی طرف چل دیا۔ جیسے ہی اس نے دروازہ ناک کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا وہیں منجمد رہ گیا۔ اندر سے بلند آواز میں قرآن کی تلاوت کی جا رہی تھی۔ بادیہ کی آواز اس کے اندر عجیب سا ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ وہ کچھ دیر کھڑا سنتا رہا پھر اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ فریش ہونے کے بعد وہ کچن کی طرف چل دیا۔ جہاں وہ پہلے ہی موجود تھی۔ اسے دیکھ کر وہ دروازے پر ہی ٹھک گیا تھا۔ وہ دو بچے کے بغیر آستینیں کہنیوں تک فولڈ کیے برتن دھونے میں مگن تھی۔ حدید کی طرف اس کی پشت تھی۔ وہ اسے آج پہلی دفعہ بغیر دو بچے کے دیکھ رہا تھا۔ وہ رات کو اُس سے واپسی پر ہی نظر آئی تھی اکثر کھانا کھا رہی ہوتی یا پھر برتن سمیٹ رہی ہوتی تھی۔ صبح وہ اس کے کمرے سے نکلنے سے پہلے ہی اُس چلا جاتا تھا۔ منڈے کو بھی زیادہ تر ایسا ہی ہوتا تھا۔ اس نے اسے مخاطب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اُلٹے پاؤں واپس لوٹ گیا۔ کچھ دیر بعد اس کے دروازے پر ناک کیا گیا۔ ”ناشتا کر لیں۔“ باہر سے ہی کہہ کر واپس لوٹ گئی۔ جب وہ ٹیبل پر آیا وہ ناشتا شروع کر چکی تھی۔

اس نے ایک نظر اسے دیکھا جس نے معمول کی طرح دوپٹہ چہرے اور گردن کے گرد لپیٹا ہوا تھا۔ ”آپ کا بی لیں گی کیا چاہئے۔“ کھانا کھانے کے بعد اس نے پوچھا۔

”چاہئے۔“ اس نے اسے دیکھتے ہوئے جواب

دیا۔ جیسے ہی اس کی نظریں بادیہ کے ڈریس پر پڑی اس کے ذہن میں چوہنیاں سی ریگنے لگیں۔ ارج کا وہ ڈریس تھا جو اس نے شادی کے بعد ارج کی پہلی برتھ ڈے پر اسے گفٹ کیا تھا۔

”اُف جدید یہ کیا ہے۔“ گفٹ کو دیکھتے ہی ارج بھڑک اٹھی تھی۔

”تمہیں پتا ہے ناں کہ مجھے اس طرح کے ڈریس کبھی پسند نہیں رہے تو پھر تم نے کیا سوچ کر یہ گفٹ لیا۔“

”ارج کیا برائی ہے س میں، ویسے بھی مشرقی عورت اس ڈریس میں ہی پہچانی جاتی ہے۔“

”مجھے کوئی پہچان و بچان نہیں کروانی۔ باج میسے ہو گئے مجھے تمہارے ساتھ رہتے ہوئے، ابھی بھی تمہیں میری چوائس کا پتا نہیں چلا۔ تم نے کبھی مجھے اس طرح کے ڈریس میں دیکھا ہے۔“

”نہیں دیکھا لیکن دیکھنا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ تم میری خاطر یہی ڈریس پہنو۔“

”اُم سوری! میں یہ ڈریس نہیں پہن سکتی۔“ اس نے بے دردی سے وہ ڈریس اس کی طرف اچھال دیا اور پاؤں پچھتی وہاں سے چلی گئی تھی۔ اس دن پہلی دفعہ آپیے سے باہر ہوا تھا۔

پانچ سال کے بعد آج بھی یہ سب سوچتے ہوئے اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو چکا تھا۔ غصے سے ہی اس نے چائے بنائی، بادیہ کو دیکھا جیسے وہاں بادیہ نہیں ارج ہو۔ وہ ایک دم اٹھا کچن سے نکلا ہوا کمرے سے نکل گیا تھا۔

☆.....☆

آج وہ گھر معمول سے پہلے آ گیا تھا۔ لاؤنج سے گزرتے ہوئے اس کی نظر اس پر پڑی جو صوفے پر بیٹھی خلاؤں میں گھور رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے بے آواز آنسو بہہ رہے تھے جو شاید اسے بھی محسوس نہیں ہو رہے تھے۔ وہ کمرے میں جانے کی بجائے

اس کی طرف چلا آیا تھا۔ آفس بیگ اور لیپ ٹاپ نیبل پر رکھتے ہوئے اس کے برابر والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ کہیں بہت دور نکلی ہوئی تھی کہ اسے حدید کے آنے اور بیٹھنے کا بھی احساس تک نہیں ہوا تھا۔ آنسو اس کے مسلسل بہہ رہے تھے جو رخسار سے ہوتے ہوئے گود میں رکھے ہاتھوں پر گر رہے تھے۔ معصوم سے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں تھیں جنہیں محسوس کرتے ہوئے وہ بھی پریشان ہو گیا تھا اور سوچنے لگا کہ پتا نہیں اس لڑکی کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ وہ آفس میں اتنا بڑی رہا کہ یہ تک پوچھنے کا نام نہیں ملا تھا۔

گلا صاف کرتے ہوئے اس نے مخاطب کیا۔ اس نے چونک کر اپنے دائیں طرف دیکھا۔ ”آ..... آپ کب آئے؟“ آواز میں واضح کپکپاہٹ تھی۔ ”کچھ ہی دیر پہلے۔ لیکن آپ شاید کافی دیر سے کہیں گم ہیں دیکھیں چائے کا کیا حال ہو گیا۔“ اس نے آنسو صاف کرتے ہوئے چائے کو دیکھا جس میں دو تین کھیاں گر گئی تھیں۔

”آپ فریش ہو جائیں میں آپ کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔“ اسے وہاں بیٹھنا دشوار لگ رہا ہے۔ ”آپ پہلے چائے لے آئیں، میں فریش بعد میں ہو جاؤں گا۔“ کہنے کے ساتھ ہی صوفے پر ہی جوتوں سمیت لیٹ گیا۔

”وارڈروب میں کوئی اور ڈریس نہیں ہے۔“ اس کے ہاتھ سے چائے لیتے ہوئے بولا۔ ”جی.....!“ اس کے کچھ لے نہ پڑا تھا۔

پچھلے تین دنوں سے آپ ایک ہی ڈریس میں نظر آ رہی ہیں۔ اس لیے پوچھا تھا۔

”نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ وارڈروب تو ڈریسز سے بھری پڑی ہے لیکن..... میری چوائس کا یہی ایک ڈریس تھا۔“ یہ کہہ کر وہ ہاں رکی نہیں تھی۔

☆.....☆

”ایم سوری! مجھے آپ کو یہاں لا کر فراموش کرنا چاہیے تھا جو بھی تھا آپ کی ضروریات کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔“ شاپنگ بیگ اس کے ساتھ رکھتے ہوئے اس نے ہادیہ سے کہا۔

”اٹس اوکے آپ.....“ وہ ہادیہ کی بات کا۔ ہوئے بولا۔ ”یہ کچھ ڈریسز ہیں سوری میں آپ ساتھ نہیں لے جاسکتا تھا مجبوری ہے اس لیے اپنی چوائس کے لیے آیا۔ اب یہ جو ہیں جیسے قبول کریں۔“

”آپ مجھے شرمندہ کیوں کر رہے ہیں۔“ ارے نہیں اس میں شرمندگی کی کیا بات ہے۔ ”کھانا لگاؤں آپ کے لیے۔“ اس نے اُٹے ہوئے کہا۔

”نہیں مجھے بھوک نہیں ہے آپ بیٹھیں مجھے بات کرنی ہے آپ سے۔ کیا آپ مجھے اپنے بیک گراؤنڈ کے بارے میں بتانا پسند کریں گی۔“ ”مجھے دیکھ کر آپ کو کیسا لگتا ہے۔“ ہمیشہ کی طرح سر جھکائے اس نے جواب دیا۔

”وہی تو ہر لڑکی ہی شریف گھرانے سے تعلق رکھتی ہے لیکن وہ خود شریف نہیں ہوتی۔“ اس کا لم اچانک چٹخ ہوا۔

”جی.....“ اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا جو اب ہی دیکھ رہا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں میں نمی پھیلنے لگی۔ ”ایم سوری وہ..... میں.....“ فوراً ہی اسے ا۔ رویے پر شرمندگی محسوس ہونے لگی۔

”اٹس اوکے۔ میں اپنے والدین کے ساتھ اور ان کی فیملی کے ساتھ رہتی تھی۔ چاچو کے چار بہن تھے میں گھر بھر کی لاڈلی تھی۔ میری زندگی بہر خوش حال اور پرسکون گزر رہی تھی کہ ایک دن اچانک کالج سے واپسی پر ہمارے گیٹ کیمپر نے مجھے بتایا کہ میرے والدین کا روڈ ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ میں نو

کے جاتے ہی اس کے شوہر کی ہوس پرستی عود کر آئی تھی۔ میں بہت مشکل سے بچ بچا کرواں سے نکلی تھی۔“ وہ سر جھکائے دوپٹے کے پلو سے آنسو صاف کرنے لگی۔

”تو آپ ہوٹل میں بھی تو رہ سکتی تھیں۔“ اس نے سائیڈ پر سے پانی کا گلاس اسے پکڑا۔

”جب طوفان اچانک سر پر پہنچ جائے تو پھر کچھ بھائی نہیں دیتا۔“

”سو سید..... تو آپ کے بابا جان.....“

”وہ بتائیں کس حال میں ہیں، میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔“

”تو اب کیا کریں گی۔“

”مجھے کچھ نہیں کرنا۔“ اس کی آواز مکمل آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی۔

”مجھے یہاں سے کہیں نہیں جانا۔“

”ساری زندگی تو آپ یہاں نہیں رہ سکتیں۔“

”نہیں میں یہیں رہوں گی چاہے سرونٹ کی حیثیت سے ہی ابھی مجھے یہاں رہنے دیں۔“

”اگر میں آپ کو شرعی رشتے سے رکھنا چاہوں تو.....“

”جی.....“ وہ حیران ہوئی۔ ”میرا مطلب ہے اپنے نام کے ساتھ میرا نام پسند کریں گی۔“

”جی.....!“ اب کی بار اس نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ اسے اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آیا تھا۔

تو کیا دل کی آواز اتنی طاقت ور ہوئی ہے کہ جلد ہی عرش پر قبولیت کا شرف حاصل کر لیتی ہے۔ اس کی دھڑکن ایک دم بہت تیز ہوئی تھی۔ اس کے آفس ٹائم میں وہ اس کے کمرے میں اس کی تصویر کو دیکھتے گھنٹوں گزار دیتی تھی۔

”میرے خیال میں آپ کو ظلم کے خلاف آواز اٹھانی چاہیے جو کہ کسی مضبوط سہارے کے بغیر ناممکن ہے اس لیے وہ سہارا میں آپ کو فراہم کرنا چاہتا ہوں

ہسپتال پہنچی۔ وہاں پہنچ کر مجھے بتا چلا کہ مجھے چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے ابدی نیند سو گئی ہیں اور بابا جان انکوں سے معذور ہو چکے ہیں۔ یہ خبر سنتے ہی میں اپنے حواس کھو بیٹی تھی۔ جب مجھے ہوش آیا ماما کو مجھ سے بچھڑے تین دن ہو چکے تھے۔ مجھے یقین نہیں رہا تھا کہ میری ماما مجھے چھوڑ گئی ہیں۔ چاچو نے بتایا کہ بابا جان علاج کے لیے آؤٹ آف کنٹری چلے گئے ہیں جب کہ بواجی (گھر کی پرانی ملازمہ) نے بتایا کہ وہ کمرے تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں کیونکہ چاچو لوگوں نے انہیں نشے کے انجکشن لگا لگا کر ان کی حالت خراب کر دی ہے۔ ہارٹ پیسٹنٹ تو وہ پہلے ہی تھے جب میں نے بابا جان سے ملنے پر اصرار کیا تو بچی نے مجھے لاکر میں بند کر دیا۔ کھانا کھلانے کے لیے وہ لاک کھلتا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ چاچو لوگ ہمارے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ ایک دن اچانک چچی نے مجھے بتایا کہ میرا نکاح ان کے بیٹے سے ہو رہا ہے۔ یہ چاچو کا تیسرے نمبر کا بیٹا تھا جو نیم پاگل تھا۔ اس وقت تو میں خاموش رہی لیکن نکاح کے وقت مولوی صاحب کے سامنے انکار کر دیا۔ حیرت کی بات تھی کسی نے کچھ نہیں کہا۔

دولوی صاحب کے جانے کے بعد سب اپنے کاموں میں بڑی ہو گئے مجھے دوبارہ لاک اپ نہیں کیا گیا تھا لہ چاچو نے تو تیار سے کہا کہ میں دوبارہ کالج جوائن کر لوں۔ تب بواجی نے مجھے بتایا کہ چاچو لوگوں نے نئے روڈ ایکسیڈنٹ میں مارنے کا پلان بنایا ہے۔ مئی پا کا بھی ایکسیڈنٹ انہوں نے ہی کروایا تھا۔ راصل چاچو لوگوں کو ہم سے نہیں ہماری دولت سے رض تھی۔ اس کی خاطر وہ ہر لمٹ کر اس کر رہے تھے۔ صبح کالج ٹائم سے پہلے بواجی کی وجہ سے میں نئی دوست کے گھر آ گئی۔ یہاں وہ اپنے شوہر کے ہاتھ رہتی تھی کہ اچانک ہی ایک دن میری دوست کی ملی میں کسی کی ڈیجھ ہو گئی تو وہ وہاں چلی گئی۔ اس

اگر آپ مناسب سمجھیں تو.....“
 ”میں تو آپ کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔“
 ”مجھے دیکھ کر آپ کو کیا لگتا ہے۔“ اس نے
 مسکراتے ہوئے اسی کا کیا ہوا سوال دہرایا تھا اور اس
 نے پہلی دفعہ اسے مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کی
 مسکراہٹ اس کے اندر تک اتر گئی تھی۔ جواباً وہ بھی
 مسکرا دی۔

☆.....☆

میرے ابو نے میری ماں کی اجازت کے بغیر
 دوسری شادی کر رکھی تھی۔ یہ ایسی خبر تھی جو زیادہ دیر
 چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ امی کو پتا چلا تو ان کے استفسار
 کرنے پر نا صرف انہوں نے اعتراف کیا بلکہ
 دھڑلے سے اس عورت کو لا کر امی کے سر پر مسلط
 کر دیا۔ یوں ہمارے گھر سے سکون ہمیشہ کے لیے
 رخصت ہو گیا تھا۔ میں اکلوتا تھا ابو کی دوسری بیوی
 سے تین بیٹیاں دو بیٹے تھے۔ امی بابا کے دیئے گئے زخم
 کے ساتھ زیادہ دیر جی نہ سکیں اور جلد ہی منوں مٹی تلے
 جاسوئیں۔ ان دنوں میں چندرہ سال کا تھا۔ میٹرک کا
 امتحان دے کر فارغ تھا۔ بابا کی اسپر پارٹس کی
 دکانیں تھیں ہمارا شمار خوش حال گھرانوں میں ہوتا تھا۔
 امی کی جدائی کا کسی کو کوئی خاص فرق نہ پڑا، سوائے
 میرے۔ آہستہ آہستہ ماں کے ساتھ ساتھ بابا بھی مجھ
 سے کھو گئے تھے۔ یہ وہی بابا تھے جو مجھے بے حد پیار
 کرتے تھے۔ میرے لاڈ اٹھاتے تھے۔ دوسری ماں
 نے سوئیلا پن بہت ایمان داری سے نبھایا بابا کو مجھ سے
 بدظن کر دیا۔ بہن بھائی پہلے ہی مجھ سے نفرت کرتے
 تھے۔ ماں نے میرا کالج چھڑوا دیا۔ میں بابا کے ساتھ
 کاروبار میں غرق ہوتا گیا۔ جس کا مجھے بہت رنج تھا۔
 ان ہی دنوں بابا کے ایک دوست ان سے ملنے آئے
 ان کی ملاقات بابا کے بجائے مجھ سے ہوئی۔ میرے
 حالات ان سے پوشیدہ نہ تھے۔ ان کے مشورے پر
 میں نے پرائیویٹ تعلیم کا سلسلہ شروع کیا۔ اب

اختیار کر لی تھی۔

☆.....☆

ان کی شادی کو ایک مہینہ ہو چکا تھا مگر وہ اسے یہا
 والا پروٹوکول نہیں دے پا رہا تھا جب کہ ہادیہ نے ق
 قدم پر اس کی سوچ کی نفی کی تھی۔ اس نے ثابت کر
 تھا کہ تمام عورتیں عمل طور پر ایک جیسی نہیں ہوتیں
 اس کے باوجود حدید دل میں چھپی عورت ذات۔
 لیے نفرت کو سنا نہیں پایا تھا۔

”کھانا بنانے کے علاوہ اور بھی بہت سے ا
 ہوتے ہیں شوہر کے جو بیوی پر عائد ہوتے ہیں
 ایک دن حدید اسے بازو سے پکڑ کر اپنے بیڈ روم
 لے آیا تھا۔ شادی کے بعد بھی وہ اپنے روم میں
 بیٹھتی تھی۔ اس کے رویے کو وہ بھی سمجھنے سے ق
 تھی۔ اگر حدید نے اس کی طرف قدم نہیں بڑھایا
 اس نے بھی کوئی پیش رفت نہیں کی تھی لیکن آج ا
 کیا ہوا تھا۔

”یہ اب میرا نہیں ہمارا بیڈ روم ہے۔“ اس
 اسے کمرے کے وسط میں لاکھڑ کیا تھا۔

”آج آپ نے میرا وارڈروب سیٹ کرنا ہے
 وہ تو ہوش میں ہی کبھی ابھی بھی وہ اپنے باز
 اس کے مضبوط ہاتھ کا لمس محسوس کر رہی تھی اور ان
 ہوتی دھڑکنوں کو معمول پر لانے کی کوشش کر رہی تھی
 وہ ٹھنکی باندھے اس کی حرکات سکنا ت اور ساتھ

لب دیکھ رہی تھی۔ جو وارڈ روم کے سارے کپڑے بیڈ پر پھیلانے پٹائیں کیا کہہ رہا تھا۔ اس نے غائب دماغی سے ہی سرکوا ثبات میں ہلادیا۔

☆.....☆

آٹکھوں کو مسلنے کے بعد دوبارہ اسے دیکھا تو اس کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ نائٹ بلیپ کی روشنی میں بھی وہ اسے صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا شدت سے دل چاہا کہ وہ اٹھے اور پیار سے اس کا گچ کی گڑیا کو بازوؤں میں بھر کر اس کے رخساروں پر پھیلے آنسو اپنے ہونٹوں پر چن لے۔ اچانک اسے ہادیہ کے چہرے میں ارج کا چہرہ نظر آنے لگا تو اس نے تنفر سے کروٹ بدل لی۔

☆.....☆

”میں نے کیس دائر کر دیا ہے انشاء اللہ جلد ہی آپ کو آپ کا سابقہ مقام مل جائے گا۔“ صبح ناشتے کے وقت اس نے اسے بریکنگ نیوز دی تھی۔

”مجھے کچھ نہیں چاہیے آپ بس مجھے میرے بابا جان سے ملو ادیں پلیز۔“

آپ کو بابا جان سے ملوانے لے چلوں گا۔“

”آپ..... آپ سچ کہہ رہے ہیں۔“ وہ بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی اگر آپ پریشن دیں تو میں بوا جی کو کال کر کے بتا دوں۔“ جدید نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا تھا وہ جلدی سے نیلی فون سیٹ کی طرف بڑھی تھی اور گھر کے لینڈ لائن پر فون کیا جو کہ اتفاقاً بوا جی کو کال کی تھی اور بابا جانی کے متعلق پوچھا تھا۔ انہوں نے ٹھیک طرح سے نہیں بتایا صرف اسے خود کا خیال رکھنے کو کہا تھا۔ اس نے حال احوال پوچھنے کے بعد بابا جان کے متعلق پوچھا بوا جی نے جو بتایا وہ سب سن کر وہ شاک نہ ہی تو رہ گئی۔ ریسپورس کے ہاتھ سے گر گیا تھا۔ وہ لاؤنج میں آیا تو اسے ساکت کھڑے دیکھا۔

”آر یو اوکے۔ آپ ایسے کیوں کھڑی ہیں۔“

آواز پر وہ چونکی۔ ”بات ہوئی آپ کی۔“

”جی..... جلد ہی وہ ہوش میں آگئی تھی۔“

”میرے بابا بچھلے دو دنوں سے ہسپتال میں

رات کو واپسی پر اس نے اسے اپنے بیڈ پر دوپٹے کے بغیر بے خبر سوتے دیکھا تو کچھ دیر کے لیے شاک نہ ہوا تھا پھر نورانی اسے یاد آیا تھا کہ وہ خود ہی تو صبح اسے اپنے بیڈ روم میں چھوڑ کر گیا تھا۔ کمرے کے وسط میں کھڑا کافی دیر اسے دیکھتا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر کسی مانوسیت کا احساس ہوتا تھا جیسے اسے پہلے نہیں دیکھ رکھا ہے کہاں..... یہ اسے یاد نہیں تھا۔ اس نے دوبارہ کمرہ کلاک کی طرف دیکھا 10 بج رہی تھی۔ وہ اتنی جلدی نہیں سوتی تھی مگر آج..... وہ سوچتا ہوا وارڈ روم کی طرف بڑھا جسے دیکھ کر اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس نے کپڑے دھو کر کچھ پریس کر کے بینگ کیے تو کچھ ویسے ہی تہہ کر کے رکھے ہوئے تھے۔ اسے اس کے جلد سونے کی وجہ معلوم ہو گئی تھی۔

فریش ہو کر کھانا کھانے کے بعد جیسے ہی بیڈ پر سونے کے لیے لیٹا تو اس کے وجود سے اٹھتی برقیوم کی بھینی بھینی خوشبو نے اس کے حواس کو معطل کر دیا۔ وہ بے خودی کی سی کیفیت میں اسے دیکھنے لگا تھا و اس کی طرف کروٹ کے بل سو رہی تھی۔ اس کا مصوم سا برنور چہرہ اسے اپنے دل میں اتارتا محسوس رہا تھا۔ وہ گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا اب تو اسے دیکھنے چھوٹے کا حق بھی رکھتا تھا۔ وہ تھوڑا سا سمسائی تو وہ جو بڑی محویت سے دیکھ رہا تھا۔ جلدی سے اپنی آنکھوں پر بازو رکھ کر سوتا بن گیا۔ رات کے سرے پہ اس کی آنکھ کھلی تھی جیسے ہی اس نے آنسو دیکھا ٹھٹھک گیا تھا۔ وہاں وہ جائے نماز پر دعا لے لیے ہاتھ اٹھائے بیٹھی تھی۔ خاموش لب..... بند لکھوں سے آنسو خاموشی سے رواں تھے۔ اس نے

ہیں۔“ کہتے ہی وہ ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔
 ”آپ پلیز حوصلہ رکھیں آپ کے بابا کو انشاء اللہ
 کچھ نہیں ہوگا۔“ وہ اسے اپنے ساتھ لگا کر تسلی دینے لگا۔
 ”پلیز کیا آپ مجھے آفس جانے سے پہلے ہسپتال
 چھوڑ دیں گے۔“
 ”وائے ناٹ چلیں۔“

جلد ہی وہ متعلقہ ہسپتال پہنچ چکے تھے۔ پورے
 ایک سال کے بعد وہ بابا جان کو دیکھ رہی تھی جو بستر پر
 پڑے نظر نہیں آ رہے تھے۔ اتنے ہی تو کمزور ہو چکے
 تھے اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ میرے ہی بابا جان
 ہیں۔ بابا کی اچانک نظر ہادیہ پر پڑی تھی۔ وہ بائیں
 منہ کر رہے تھے۔ ساتھ ہی ان کی آنکھوں سے موٹی
 گرنے لگے تھے۔ وہ تڑپ کر بابا کی طرف بڑھی تھی
 اور ان سے لیٹ کر بلک بلک کر رو دی۔

اور وہ تو انہیں دیکھ کر ہی چونک گیا تھا یہ تو انکل
 عبدالصمد ہیں تو کیا..... ہادیہ ان کی..... اونو..... اس
 کے ذہن میں بیک وقت بہت کچھ گٹھ گٹھ ہوا تھا۔ وہ
 جب بھی انکل سے ملنے جاتا تھا وہ ڈرائنگ روم سے
 ہی بل کر واپس آ جاتا تھا۔ بھی گھر نہیں گیا تھا۔ اس دن
 وہ واپسی کے لیے اجازت لے رہا تھا۔ جب یہ لڑکی دو
 بکس ایک فائل ہاتھ میں لیے وہاں آئی تھی۔ سلام
 کرتے ہی وہ بابا سے مخاطب ہوئی تھی۔

”بابا جان اور کتنی دیر ہے میں آل ریڈی کافی لیٹ
 ہو چکی ہوں اکیڈمی سے۔“

”ہاں ہاں بس چلتے ہیں۔ نین ان سے ملو یہ
 میرے دوست کا بیٹا ہے ہادی (وہ پیار سے اسے ہادی
 ہی بلاتے تھے) حال ہی میں اسٹڈی سے فارغ
 ہوئے ہیں۔“

”اوہ کیسے ہیں آپ۔“ مسکراتے ہوئے اس نے
 پوچھا۔

”اللہ کا شکر میں بالکل ٹھیک ہوں۔ انکل اگر آپ
 کہیں تو میں انہیں ڈراپ کر دوں۔“

”ارے نہیں بیٹا میں ادھر ہی کام سے جا رہا ہوں
 میں چھوڑ دوں گا۔ آج اس کی وین نہیں آئی تو.....
 آپ کا بہت شکر یہ بیٹا، جیتے رہو۔“
 اس وقت وہ سترہ سال کی تھی اور اب 25
 ہو رہی تھی۔ ہادیہ کی رونے کی آواز نے ہی اسے
 یادوں کی دنیا سے باہر نکالا تھا۔

”بس کر دیں اس طرح تو آپ انہیں اور ڈسٹر
 کر رہی ہیں۔“ اس نے اسے پکڑ کر سیدھا کیا جو
 جان سے چٹئی ہوئی تھی۔

☆.....☆
 ”بیٹا کہاں تھیں آپ..... کم از کم مجھے اپنی خبر
 کی اطلاع ہی دے دیجیے۔ تمہیں پتا ہے میری حال
 کیا ہو گئی تھی جب مجھے یہ پتا چلا کہ تم گھر سے چلی
 ہو۔“ ان کی حالت اب بھی خراب تھی وہ انکل
 بول رہے تھے۔“

”بابا جانی میرا جانا ہی بہتر تھا۔ میں وہاں خود کو
 آپ کو زندہ درگور ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔“
 ”بیٹا اپنے چاچو کو معاف کر دینا میں نے ہم
 معاف کر دیا ہے۔“

”بابا جان مجھ میں اتنا ظرف نہیں ہے۔“
 ”السلام علیکم انکل۔“ وہ ان کے پاس ہی بیٹھ
 ابھی بھی اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی انکل ہیں
 جنہیں وہ کچھ عرصہ پہلے ملتا رہا ہے۔

”ہادی بیٹا تم یہاں؟“ وہ اسے اس وقت یہاں
 دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ انہوں نے با
 ر آنکھوں کو صاف کر کے اسے دیکھا شاید میرا وہم؟
 لیکن وہ وہی تھا جسے انہوں نے بیٹوں کی طرح چا
 تھا۔ جب لاسٹ ٹائم اسے دیکھا تو وہ ایک نو عمر لڑکا
 اور اب وہ ایک خوبصورت دکارو پ دھار چکا تھا۔

”بیٹا مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم یہاں ہو میرے
 سامنے ہو۔“ انہوں نے کہا ہی اس انداز سے کہ وہ
 شرمندہ ہو گیا تھا۔ ہادی کے نام سے وہ چونکی۔ اگر

دودھ کا گلاس دینے آئی تو وہ لیپ ٹاپ میں بڑی تھیا۔ اس نے گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور مڑنے لگی تھی کہ اس نے اسے پکارا۔

”نہیں.....!“ وہ ناچھی سے اسے دیکھنے لگی۔ آج سے پہلے اس نے کبھی اس نام سے نہیں پکارا تھا۔
 ”ایسے کیوں دیکھ رہی ہو تم؟“ پتا نہیں کب اس نے آپ سے تم تک کا فاصلہ طے کیا تھا۔
 ”جیسے اس نام سے بابا جان کے علاوہ کسی نے کبھی نہیں پکارا تو.....“

”لیکن اب میں تمہیں اسی نام سے پکاروں گا۔“ اس نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنے پاس بیٹھ پر بٹھالیا تھا۔ ”کیونکہ مجھے نین کہنا اچھا لگتا ہے۔“
 ”جی بولیں کیا کہنا تھا آپ کو؟“ وہ اس کی نظروں سے کنفیوژد ہونے لگی تھی۔
 ”یار! میں تمہارا شوہر ہوں تو تم مجھ سے غیروں والا سلوک کیوں کر رہی ہو۔“

”اگر یہ بات میں آپ سے کروں تو.....“
 ”سوری یار اگر مجھے پہلے پتا ہوتا کہ تم صدا نکل کی بیٹی ہو تو میں کبھی فراموش نہ کرتا نہیں۔“
 ”تو کیا ایک بیوی کا شوہر کے محسن کی بیٹی ہونا لازمی ہے۔“

”ارے نہیں یار.....“ اس نے مسکراتے ہوئے اسے بازوؤں میں لیا۔ میں ارج کی وجہ سے عورت ذات سے بدظن ہو چکا تھا۔ جس طرح کی عورت کو میں پسند کرتا تھا وہ کبھی ویسی نہیں بنی تھی بلکہ میری سوچ کے مخالف تھی۔

”آپ کو کیسی عورت پسند تھی۔“ وہ ایک دم اس سے علیحدہ ہو کر پوچھنے لگی۔

”بالکل تمہارے جیسی۔“ اس نے پیار سے اس کی ناک دبائی وہ شرم سے سر جھکا گئی۔

”اگر میں کہوں کہ تم میری آئیڈیل ہو تو یہ غلط نہ ہو گا۔ میں نے سنا تھا کہ یہ ہر کسی کو اس کا آئیڈیل نہیں

لے بھی دماغ میں جیسے دھماکا ہوا تھا۔
 ”ایم سوری انگل میں پریکٹیکل لائف میں اتنا ہی ہو گیا تھا کہ چاہ کر بھی رابطہ نہیں رکھ سکا۔“ اس نے ان کا ہاتھ پکڑ کر ہونٹوں سے لگایا۔

”بابا جان یہ میرے ہزبینڈ ہیں۔“ اس نے رتے ڈرتے بتایا۔

”کیا..... واقعی تم سچ کہہ رہی ہو؟ میرا تو برسوں کا لمبا خواب پورا ہو گیا ہے بیٹا۔“ خوشی ان کے اُسے سے چھلک رہی تھی۔

”ٹھیک یو بیٹا تم نے بہت بڑا احسان کیا ہے مجھ میں تمہارا بہت مشکور ہوں۔“

”اس کا مطلب آپ نے مجھے اپنا بیٹا نہیں سمجھا۔“
 ”ارے نہیں نہیں تم مجھے نین کی طرح ہی عزیز۔“ انہوں نے دونوں کو ہی بازوؤں میں بھر لیا تھا۔
 اب مجھے کوئی فکر نہیں ہے اب یہ محفوظ ہاتھوں میں ہے میں سکون سے مر سکوں گا۔“

”بابا جان ایسی بات کر رہے ہیں آپ۔“ وہ ٹرپ تو مگنی تھی۔

”بابا جان ہمیں آپ کی بہت ضرورت ہے۔“
 مدد کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ بابا جان کی ماس اکھڑنے لگی۔ وہ والدین کے بعد باپ جیسے انسان کو کھونا نہیں چاہتا تھا لیکن اللہ کے سامنے کسی کی مرضی چلی ہی کب ہے۔ ڈاکٹر کے افسوس کا اظہار کرنے پر ہادی کی چیخ و پکار نے ہوسپتال کی درودیوار کو اکے رکھ دیا تھا۔ اس وقت حدید کو بھی اسے سنبھالنا کل ہو گیا تھا۔

☆.....☆

کافی دن ہادی صدمے کے زیر اثر رہی تھی۔ اس اران حدید نے ہی اسے سنبھالا تھا۔ آج وہ نارمل لہ رہی تھی۔ گھر کے سارے کام اس نے خود کیے تھے وہ بھی اسے دیکھ کر ریلیکس تھا ورنہ پچھلے دنوں وہ سے دیکھ کر بہت پریشان رہتا تھا۔ رات کو وہ اسے

”مطلب!“

”ارج میں، میں تم جیسی لڑکی تلاش کرتا تھا اور تم میں، میں ارج کو تلاش کرتا رہا۔ تم نے قدم قدم پر میری سوچ کی لٹی کی تو میں خود کو تم سے دور نہیں رکھ پا رہا تھا۔ میرا خود کو کنٹرول کرنا مشکل تھا۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے تم نے مجھے کتنا ترسایا ہے۔“

”آپ بھی میرا اندازہ نہیں لگا سکتے۔“ جلدی میں اس کی زبان پھسل گئی تھی۔

”تو کیا تم بھی.....“ وہ حیران رہ گیا۔ ”جھوٹ تم تو مجھے دیکھتی تک نہیں تھیں۔“

اور وہ خود سے شرمندہ ہوتی کمرے سے بھاگ نکلی۔ وہ پیچھے ہنستا رہ گیا تھا۔

☆.....☆

جب سے وہ چاچو کے گھر سے واپس آئی تھی۔ بہت اداس اور خاموش تھی حدید کو اس کی خاموشی بہت ڈسٹر ب کر رہی تھی۔ دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد جب وہ کمرے میں آئی تو وہ بھی کچھ دیر بعد اس کے پاس آ گیا تھا۔ وہ جو بیڈ پر بیٹھی سر جھکائے بے آواز آنسو بہا رہی تھی۔

”نہیں کیا ہوا ہے تمہیں؟“ اس نے پیار سے اس کا جھکسا اور پراٹھایا تھا اور وہ تو اس اپنائیت پر ہی تبصرہ گئی تھی۔ اس وقت اسے کسی کندھے کی ہی ضرورت تھی۔

”نہیں بتاؤ مجھے کیا ہوا ہے؟“ وہ پریشان ہو گیا تھا۔ ”ہادی میں چاچو کو بھول نہیں پارہی انہیں کیوں ایسا ہوا ہے۔“

حدید سے مشورہ کرنے کے بعد وہ بواجی کو ہمیش کے لیے اپنے پاس لانے کی غرض سے چاچو کے گھر گئی تھی وہاں جا کر اسے بواجی سے پتا چلا تھا کہ جس دن وہ گھر چھوڑ کر گئی تھی اس کے تیسرے ہی دن وحید (نیم پاگل جو چاچو کا بیٹا) چپکے سے گھر سے نکل گیا تھا اور کہیں غائب ہو گیا تھا۔ کافی تلاش کیا لیکن وہ کہیں

ملتا اور ارج سے شادی کے بعد مجھے یہ یقین ہو گیا تھا لیکن اب تمہاری صورت میں مجھے میرا آئیڈیل مل گیا ہے۔“

”ارج کیسی لڑکی تھی۔“ وہ اس کی طرف دیکھنے کی بھی ہمت نہیں کر پائی تھی۔

”میری شریک زندگی کے متعلق خواہش تھی کہ ایک مکمل مشرقی اداؤں سے آراستہ نازک سی لڑکی ہو جو میری گرم نگاہوں پر موم کی طرح پکھل جائے۔ میری پٹلی کی شرارت پر چھوٹی موٹی بن جانے والی وارنٹی پر خود ہی سمٹ جائے۔“ اور وہ خود میں سمٹنے لگی تھی اسے لگ رہا تھا کہ وہ اسے ہی بیان کر رہا ہے۔

اور وہ اس کی حالت سے محفوظ ہو رہا تھا۔ مسکراتے ہوئے اس نے اسے بانہوں کے حصار میں لے کر اس کی پیشانی پر لب رکھ دئے تھے اور وہ اس حرکت پر بوکھلا گئی۔

”جو میرے لمس پر صندل کی طرح مہک اٹھے میری شدتوں پر گھبرا کر بکھر جائے۔ چھوٹی سے چھوٹی بات بھی کرتے ہوئے جھجکے شرمائے اور میں.....“

”پلیز بس کریں۔“ اس نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اس میں اور سننے کی ہمت نہ تھی۔

”میں نے اپنے بارے میں نہیں ارج کے بارے میں پوچھا تھا۔“ اس بات پر اس کا چھت پھاڑتہ تھا۔ اس کو بری طرح شرمندہ کر گیا تھا۔

”یار! میں اپنا آئیڈیل بتا رہا تھا تمہیں۔ اور ارج تو ایک بے باک لڑکی تھی اس میں مشرقی لڑکی والی کوئی بات نہیں تھی خود شرمندہ ہونے کی بجائے مجھے شرمندہ کر دیا کرتی تھی۔ اسے فارن لڑکی کہلوانا زیادہ پسند تھا۔ وہ میری نرمی اور محبت کا زیادہ فائدہ اٹھاتی تھی۔ کبھی اس نے میری کسی خواہش کا احترام نہیں کیا تھا۔ اس وقت وہ میری سوچ کے مخالف تھی اور اس وقت تم۔“

نہیں ملا۔ آٹھویں دن اس کی دیڈ باڈی ایڈی سینئر سے گھر لائی گئی تھی۔ اس صدمے کو چچی برداشت نہ کر سکیں اور جلد ہی وہ بھی وحید کے پاس پہنچ گئیں۔ اچانک چاچو کو فوج کا ایک ہوا تھا جس کی وجہ سے وہ بستر سے لگ گئے۔ چھوٹے دونوں بیٹے آؤٹ آف کٹری جا چکے تھے۔ فہد جو کہ بڑا بیٹا تھا اس نے بی بابا جان اور چاچو کو سنبھالا تھا۔ نین تو شا کڈ رہ گئی تھی کہ اس ڈیڑھ سال میں کیا کچھ ہو گیا تھا۔

”بیٹا اپنے چاچو کو معاف کر دینا۔ میں نے بھی کر دیا ہے۔“ بابا کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔ تو بابا جان اس وجہ سے کہہ رہے تھے جس حالت میں اس نے چاچو کو دیکھا تو وہ کانپ اٹھی تھی۔ چاچو نے کپکپاتے ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیئے تھے جسے اس نے فوراً کھول دیا تھا۔ یہ تو وہ چاچو بالکل نہیں لگ رہے تھے جنہیں وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ یہ تو اس کے بچپن والے چاچو تھے جو اسے بہت پیار کرتے تھے۔ وہ کافی دیر ان کے پاس بیٹھی رہی تھی۔ چاچو اس سے آہستہ آہستہ بات کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ٹوٹے پھوٹے الفاظ وہ بہت مشکل سے سمجھ پا رہی تھی۔ چاچو کو تو وہ دیکھتے ہی معاف کر چکی تھی۔ بواجی کو اس نے ان کے پاس ہی رہنے دیا تھا۔ کیونکہ انہیں اس کی زیادہ ضرورت تھی۔ فہد نے بھی اسے بہنوں کا سا پروٹوکول دیا تھا۔ وہ بوجھل دل کے ساتھ گھر واپس آئی تھی۔ تب سے بار بار اس کا دل بھرا رہا تھا۔ اس کے سامنے وہ ٹوٹ کر بٹھری تھی۔ جو ہر دفعہ ہی اس کی ایسی حالت پر کھرا جاتا تھا۔

”یہ تو مکافات عمل ہے میری جان۔“ ہر ایک کو اس کے کیے کا صلہ تو ملتا ہی ہے یار تمہیں رونے کے بجائے ان کے لیے دعا کرنی چاہیے کہ اللہ چاچو کی مشکل آسان کرے۔“ وہ اس کے بال سہلاتے ہوئے اسے سمجھا رہا تھا۔

جس کی رونے سے ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔
”ادھر دیکھو میری طرف۔“ اس نے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا تھا۔

”تمہیں میری خوشی کا کوئی خیال نہیں ہے۔“ اس کے آنسو یکدم ٹھم چکے تھے۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔ ”میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ کیا تم میری خاطر خوش نہیں رہ سکتیں۔ کیا ہم اپنی زندگی کو اپنے لیے نہیں گزار سکتے۔“

”کیا ہمارا خوشیوں پر کوئی حق نہیں ہے۔ یا پھر میرا تم پر کوئی حق نہیں ہے۔“

”ایم سوری! میں نے آپ کو زیادہ پریشان کر دیا۔“ اس نے آنسوؤں سے ترچرے کو صاف کرتے ہوئے کہا۔

”کوئی ایک دفعہ تھوڑی پریشان کیا ہے۔“ وہ چپ رہی۔

”یار ہمیں زندگی کو گزارنا نہیں زندگی کو جینا ہے۔“
”کیا تم زندگی کا کچھ حصہ میرے لیے وقف کر سکتی ہو۔“ اس نے مسکین سی صورت بنائی۔

”میرا سب کچھ آپ کے لیے ہی تو ہے۔“
”لیکن مجھے کیوں نہیں لگتا تم ساری دنیا کے لیے پریشان ہو جاتی ہو۔ ہر دوسرے انسان کے غم میں روتی ہو۔ کبھی میرے لیے اتنا روتی ہو، پریشان ہوتی ہو، ہر دفعہ مجھے ہی اپنے لیے پریشان کیا ہے۔“

”ہادی جو آپ ہیں میرے لیے وہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔“ کہنے کے ساتھ ہی وہ اس کے سینے میں منہ چھپا گئی۔

”اچھا کچھ جلدی اعتراف نہیں کر لیا تم نے۔“ اس نے مصنوعی غصے سے اس کے کندھے پر مکار سید کیا جس پر وہ کھلکھلا کر ہنس دیا۔ ہادیہ نے بھی بھرپور ساتھ دیا۔

.....☆.....

میرا شہلا گل سحر



”نہیں بھائی ویسٹ انڈیز کے کھلاڑیوں کو دیکھ کے میرا دل ہولتا ہے“۔ اس نے لکھتے ہوئے صد لگائی۔
 ”لو جی ہارٹی ٹونی پھر سے پہن لی ہمارے کھلاڑیوں نے کتنے ہی پیچ مس کر دیئے اور کتنی بالز وایت دیں“۔
 ”بھئی بھائی ہمیشہ کی طرح جی بھر کے مزہ لینے لگے۔“
 ”بھائی ہمارے کھلاڑیوں کی غلطی نہیں ہے دراصل اس خوفناک ٹیم سے کھیلنا ہی مشکل کام ہے تو بہ میں ہوتی تو قریب دیکھ کر ہی بے ہوش ہو جاتی“۔ الویرا نے منہ بنایا۔
 ”بری بات“۔ بھائی نے ٹوکا۔

”شکل و صورت اللہ تعالیٰ کی دین ہے تم ان کی شکل نہیں کا کر دو گی دیکھو“۔ بڑے بھائی نے اسے ٹوکا تو وہ کندھے اچکا کر رہ گئی۔

☆☆☆☆

حسن پرستی اور ارجلے رنگوں سے گویا اسے فویا ہو گیا تھا، دادی کی سنائی گئی کہانیوں سے اس نے اپنی زندگی کی بھی ایک خوبصورت کہانی بن لی تھی خوبصورت اور سرخ و سفید شہزادے کی کہانی۔

ریٹائر کرٹل شفیق کی چار اولادیں تھیں طلحہ، صہام، شہراز اور گڑیا سی بی الویرا جو پیدائش کے وقت کافی کمزور تھی اور کئی ماہ بیمار رہی تب دادی نے اس ننھی گڑیا کی ذمہ داری خود لے لی، کیونکہ مسز شفیق تینوں بچوں کے ساتھ پہلے ہی مصروف تھیں، دادی کے لاڈ پیار اور طلسماتی کہانیوں نے اسے ایک الگ تھلک دیں کی باسی بنالیا تھا، کچھ خوبصورتی اور ارد گرد کے لوگوں کے ریماکس نے بھی اسے قدرے مغرور کر دیا تھا، دادی

”دادی مجھے بریوں کی کہانی سنائیں ناں“۔
 بھری دوپہر میں اوسمشی دادی کو اس نے بلایا۔
 ”لڑکی اب تم بچی نہیں رہی، بڑی ہو گئی ہو مگر کہانی سننے کی بیماری ابھی تک چپکلی ہوئی ہے“۔ دادی نے نیند سے بھری آنکھیں کھول کے اسے لتاڑا تو اس نے منہ پھلایا، لاچار دادی نے اسے اپنے ساتھ لٹا کر سوتے جاگتے پری کی کہانی سنائی جس کا نام الویرا پری تھا اور جس کا خوبصورت شہزادہ اڑتے ہوئے گھوڑے پہ سوار ہو کے اسے دیو کی قید سے آزاد کرانے کے لیے جاتا ہے دادی کے سونے کے بعد وہ دیر تک شہزادی بن کے اپنے شہزادے کو سوچتی رہی۔

☆☆☆☆

بچپن کی سرحد پار کر کے جوانی کی دہلیز پہ قدم رکھتے ہی اس کے خواب اور بھی رنگین اور پختہ ہو گئے وہ بے حد حسین تھی، تین بھائیوں کی اکلونی بہن کی حیثیت سے بہت لاڈلی بھی تھی مگر وہ بچپن سے حسن برست تھی، اور وقت کے ساتھ اس کی حسن پرستی بڑھتی گئی اسے ہر چیز اجلی اور سفید اچھی لگتی کالے رنگ سے اسے بے رحمتی بھلائی تھی، سانولے تھے اس لئے وہ ان سے بھی کھینچ کھینچ رہتی۔

☆☆☆☆

پاکستان اور ویسٹ انڈیز کے مابین کرکٹ کا میچ چل رہا تھا وہ برآمدے میں بیٹھی نوٹس بنا رہی تھی۔
 ”الویرا آجاؤ بھی میچ بہت زبردست جا رہا ہے“۔ چھوٹے بھائی نے اسے آواز دی وہ جانے تھے کہ وہ کرکٹ کی دیوانی ہے۔



”ماشا اللہ!“ عورت نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

”یٹا غلطی آپ کی نہیں میری ہے میں جلدی میں آرہی تھی۔“ پیار سے اس کا گال سہلاتے ہوئے انہوں نے معذرت خواں لہجے میں کہا تو اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس نے اپنی فرینڈز کی طرف رخ کیا، فضہ کا دولہا دیکھ کر وہ حق و حق رہ گئی وہ خوبصورتی کی جیتی جاگتی تصویر تھا، جیسے اس کے خوابوں کے شہزادے میں روح پھونک دی گئی ہو، خوبصورت ہونے کے ساتھ وہ بلا کا بولڈ بھی تھا، فضہ قبول صورت تھی، سرخ و سفید تھی، مگر نقش و اجبی سے تھے الویرا اس کی خوش قسمتی پہ رشک کر رہی تھی یہ دیکھے بغیر کہ وہ کسی کی مستقل نظروں کے حصار میں تھی اور کوئی کسی سے اس کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کر رہا تھا۔

☆☆☆☆

وہ ناشتہ کر کے ٹی وی پہ چینل سرچ کر رہی تھی ایگزیم کی فراغت کے بعد وہ خاصی دیر سے اٹھتی تھی۔
”میں تو بھول چلی باہل کا دیس پیا کا گھر پیارا لگے۔“ بڑی بھابی اس کے کانوں میں گنگنائیں تو نہ سمجھنے والے انداز میں اس نے بھابی کو دیکھا۔
”چلو بی بی میرے ساتھ ڈرائنگ روم آؤ، کچھ لوگ تمہیں دیکھنے آئے ہیں۔“ بھابی نے شرارت سے آنکھیں منکارتے ہوئے کہا۔
”کیوں کیا میں دنیا کا سا تو اس عجوبہ ہوں۔“ اس کی پوزیشن میں ذرا تبدیلی نہ آئی۔
”فضول باتیں چھوڑو امی نے پیغام بھیجا ہے کہ حلیہ درست کر کے ڈرائنگ روم پہنچو۔“ بھابی اسے امی کا پیغام دے کر چلتی بنی حلیہ تو اس کا درستی ہی تھا، گرمی کے موسم میں وہ ویسے بھی پھلکی بن جاتی تھی۔
ابھی کچھ ٹائم پہلے ہی وہ نہا کے فیروزہ اور نیوی بلیو کمر کا سوٹ پہن کے نکلی تھی بالوں کو سمیٹ کر اس نے کچر لگایا اور ڈرائنگ روم کا رخ کیا، ابھی تو فائنل

کی تربیت نے ایک مثبت چیز بھی اس میں پروان چڑھائی تھی وہ اللہ کی ذات سے محبت کرتی تھی بقول دادی تمام کائنات میں حسین ترین بہتی ہمارا رب ہے اور یہ کائنات اس کی خوبصورتی کی چلتی پھرتی تصویر ہے اس لیے وہ عبادت بہت رغبت سے کرتی تھی یونیورسٹی میں فنکشن تھا، وہ خود بھی انارکلی کے روپ میں تھی، سی گرین اسٹاکس ڈریس ہیوی جوبلری اور مناسب میک اپ کے ساتھ اس کا روپ آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا، ریپ پر کیٹ واک کرتے ہوئے وہ جیسے ہی سامنے آئی تالیوں کی گونج سے اس کی ہنس راج جیسی گردن احساس تقاخر سے تن سی گئی اپنے دوست سے ملاقات کے لئے آنے والے شخص نے تالیوں کی گونج کے تعاقب میں اسے پہ دیکھا تو زبردست ایکسپوزنگ کے ساتھ نفاست اور مہارت سے کیے گئے میک اپ میں وہ مغرور ناک والی لڑکی کوئی اپسرا لگ رہی تھی ہارٹ بیٹ رکی ہوئی تھی اور پھر اس کے اسٹج سے غائب ہونے تک نگاہیں اس پری کا تعاقب کرتی رہیں دل جیسے ایک دم ویران اور خالی ہو چکا تھا۔

☆☆☆☆

فضہ کی شادی کے فنکشن کے لیے اس نے خاص طور پر شاپنگ کی تھی کہ وہ اس کی میٹ فرینڈ بھی تھی اور ان کے گروپ کی پہلی لڑکی بھی، جو اپنے پیار کے سنگ رخصت ہو رہی تھی، رات کے ٹائم اس نے سیاہ بارڈر والی اسٹاکس ساڈھی باندھی تھی اسٹپ کٹ بال اور میچنگ لوازمات کے ساتھ اس کی چھپ ہی نہالی تھی، اپنی فرینڈ کے ساتھ قدم اٹھاتی وہ اسٹج کی طرف بڑھ رہی تھی کے غلٹ سے آئی ایک خاتون سے ٹکرائی، اس کے زمیں بوس ہونے سے پہلے اس عورت نے اسے سنبھال لیا۔
”سوری آئی!“ غلطی نہ ہونے کے باوجود بھی اس نے اس نفیس خاتون سے معافی مانگی۔

میں چمکتی لوگ اس کے چمکتے دسکتے روپ میں اضافہ کر رہی تھی، گھر والوں سے ناراض ہونے کے باوجود تڑپ تڑپ کر سب سے مل کر روئی تھی کہ اس آنگن کی وہ اگوتی اور جیتی چڑیا تھی۔

☆☆☆☆

شایان ولا میں اس کا استقبال نے تباہ شاہ پھولوں سے کیا گیا تھا، رسوں کے بعد اسے جملہ عروسی میں بیٹھا دیا گیا تھا، وہ بہت نر دس تھی، کچھ لمحوں کے بعد اس کے خوابوں کا شہزادہ حقیقت کا روپ دھار کر اس کے سامنے موجود تھا، اس کا شہزادہ بغیر ہوائی گھوڑے کے اسے اتنی جلدی اڑا لیا تھا کہ وہ خود کو ان حالات کے لیے تیار بھی نہیں کر پائی تھی، دروازے کی آہٹ نے اسے حقیقی دنیا میں لا پٹا، دروازہ لاک کر کے کوئی جملہ عروسی میں آیا تھا، سر جھک گیا، دھڑکن تیز اور ہتھیلیاں بھیک گئی تھیں۔

”السلام علیکم؟“ گونگھٹ اٹھاتے ہوئے گھمبیر آواز میں سلام کیا گیا۔

”الویراجی!“ بہت نرمی سے اس کے ہاتھ دو گرم ہاتھوں میں منتقل ہوئے تھے الویرا کی دھڑکن تیز اور پلکیں جھلی ہوئیں تھیں۔

”جانتی ہو آپ کو میں نے یونیورسٹی میں اتار رکھی کے روپ میں دیکھا اور شدت سے آپ کو مانگا تھا آپ تو میری من چاہی دعائیں۔“ شایان نے اس کا چہرہ اٹھا کے اس کی پیشانی پہ بوسہ دیا تو مارے حیا کے وہ گنہار ہو گئی۔

”الویرا آنکھیں کھولو۔“ شایان کے اصرار پہ اس نے آنکھیں کھولی تھیں دھیرے سے پلکیں اٹھا میں اس کے لمس سے جسم میں برقی روسی دوڑ رہی تھی مگر اس طعنیہ ماحول میں جیسے ایک بڑا دھماکہ ہوا یہ شخص تو اس کا شہزادہ نہیں تھا بلکہ یہ تو سانولی رنگت والا عام سے نقوش والا بندہ تھا اس نے ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ کر بے ساختہ سسکی روکی اس کا دوسرا ہاتھ جو شایان کے

کا انگوٹھا دیا ہے اور گھر سے نکالے جانے کی تیاری شروع، جھپٹتے ہوئے پردہ اٹھایا تو سامنے دو ڈیسنٹ سی خواتین براجمان تھیں، ایک تو قدرے جانی پہچانی لگ رہی تھیں، آہستگی سے سلام کر کے وہ امی کے ساتھ صوفے پہ ٹک گئی مگر دھیان اس عورت میں انکا تہادوسری خاتون بھی گہری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں انہوں نے اس سے کچھ سوالات کیے اور وہ سر جھکائے آہستگی سے جواب دیتی رہی۔

لڑکا یو بی ایل بینک میں منیجر تھا اور پراپرٹی ڈیلنگ کا کاروبار بھی تھا گھر میں صرف پچھو اور ماں تھیں، ماں ریٹائرڈ ہیڈ مسٹر تھیں اور پچھو ڈگری کالج میں لیکچرار تھیں، بھائی کی جوانی میں فوتگی کے بعد اس نے بھائی اور بھتیجے کے لیے زندگی وقف کر دی تھی اور الویرا کو اس نے ہی اپنی کو لیک کی بھانجی کی شادی میں دیکھا تھا اور جی جان سے پسند کیا تھا اور اس کے بارے میں ساری معلومات اکٹھی کر لیں تھیں گھر میں سب کو ہی یہ رشتہ پسند آیا تھا سوائے الویرا کے، رمضان کے بعد اس کے بھائیوں کی شادی تھی وہ بہت ارمانوں سے تیاری کر رہی تھی مگر انفسوس کے اس کی شادی آٹافانٹاٹے کر دی گئی۔

”لڑکیاں وقت پہ گھر کی ہو جائیں تو بہتر ہے۔“ دادی کو پچھڑے بہت وقت گزر گیا تھا مگر انہیں یاد کر کے ابھی بھی وہ رو رہی تھی اس کا رونا دھونا احتجاج کچھ کام نہیں آیا، غصے کے مارے اس نے شایان کی pic بھی نہیں دیکھی یہاں تک کہ شادی کا دن آپہنچا، اندر ہی اندر طوفان سمیٹے بظاہر وہ چپ تھی اس کی گزراور فرینڈز کی چیئر جھاڑ جاری تھی۔

”نی کالا شاہ کالا، کالا ہے میرا دلدار گورے نوں پراں کر۔“ اس کے گروپ کی لڑکی لہک کر گرا رہی تھی، اور اس کی سہیلیوں کے چہرے پہ بھی مسکراہٹ تھی مگر اس کا دھیان کسی اور طرف تھا، میہ دیں لہنگے میں برائیل لک لیے وہ اپرا لگ رہی تھی، کبھی تاک

اس کی شکست خوردگی کو تازہ کر دیتی، اس کی سب سے بڑی خواہش حسرت میں بدل گئی تھی۔

☆☆☆☆

شایان شروع شروع میں تو اس کی حیا سمجھا، مگر وقت کے ساتھ اسے ابھرنے کی محسوس ہونے لگی اس کی آمد پر وہ روایتی بیویوں کی طرح خوشی کا اظہار نہیں کرتی تھی بلکہ خوفزدہ ہو جاتی اور گرد کے ماحول میں خود کو مشغول رکھتی اور ناں رات کو خود اس کی طرف پیش قدمی کرتی ایک دن یہ ابھرنے بھی سلجھ گئی جب اس کی ایک سینکڑن کنز جو الوریا کی کلاس فیلو اور گروپ فیلو بھی تھی ان کے گھر آئی الوریا بہت خوش تھی، باتوں باتوں میں اس نے الوریا کو چھیڑا۔

”اُف کیسا نادانی کا دور تھا وہ بھی ہے ہمارے گروپ میں سب کی الگ الگ خواہش تھی میں مزید تعلیم کے لیے اسکولرشپ لینا چاہتی تھی وجہ کا خواب پیکچرار شپ تھا سحر اپنا اخبار نکالنا چاہتی تھی“ فضا نے پالنا چاہتی تھی۔ ”وہ شرارت سے مسکرائی۔“ مگر بے چاری کو طلاق ہو گئی اس کا شوہر عیاش ٹائپ تھا شراب اور شباب کا رسیا، اور ویسے بھی خوبصورت مرد عورتوں کو کھلونے اور پاؤں کی جوتی ہی سمجھتے ہیں۔“ ماہا نے حقارت سے کہا۔

”میری اتنی پیاری دوست کا نصیب کتنا کھوٹا نکلا، دیکھو تو جسے وہ ہیرا سمجھ رہی تھی وہ ہی پتھر نکلا۔“

”اور الوریا کا کیا جنون تھا۔“ شایان نے بے ساختہ پوچھا تو جذباتی سی ماہا ایک دم مسکرا دی۔

”الوریا کا خواب تھا کہ ایک بہت ہی خوبصورت اور حسین و جمیل شہزادہ اڑتے ہوئے گھوڑے پہ سوار ہو کر اسے لینے آئے گا۔“

”تو ہمارا شایان کی شہزادے سے کم ہے کیا؟“

”بالکل بالکل آئی کیوں نہیں۔“ ماہا نے جلدی سے ان کی ہاں میں ہاں ملائی الوریا نے چور نظروں سے شایان کو دیکھا تو اس کا چہرہ ادھواں ادھواں سا ہو رہا

ہاتھ میں تھا اس کی مضبوط گرفت میں اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی آنسو اندر ہی اندر گر رہے تھے اور ہونٹوں پہ چپ سی لگ گئی تھی اس کی کیفیت سے بے خبر وہ اپنی امی اور پھپھو کے بارے میں بتا رہا تھا جنہوں نے اس کی خاطر دنیا کی ہر خوشی اپنی ذات لٹا دی تھی وہ اسے ان کی خدمت اور فرمانبرداری کی تلقین کر رہا تھا وہ جسمانی طور پر تو اس کے پاس بھی مگر ذہنی طور پر وہ شدید ٹینشن میں تھی، قسمیں، وعدے، گستاخیاں باقی کے مراحل کس طرح طے ہوئے وہ غائب دماغی سے دیکھتی رہی اس کے سپنوں کا ہر نشان چلتا رہا اور وہ کسی لکڑی کی طرح شایان کی بانہوں میں سلگتی رہی۔

☆☆☆☆

صبح سویرے آنکھ کھلی سر عجیب بھاری تھا، شایان اس کے قریب گہری نیند سو رہا تھا چہرے پہ مسکراہٹ تھی مگر الوریا کو اپنے ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں سمیٹنے سے فرصت نہیں تھی وہ خود اٹھ کر باتھ روم میں چلی گئی، نہاتے ہوئے آنسو روانی سے بہتے رہے دل سے جیسے ہر آگ ختم ہو چکی تھی، اس کے خوابوں کا مکمل بری طرح ٹوٹا تھا وادی دل میں بسا شہزادہ اس تک آنے کا راستہ بھول گیا تھا اور روح کا گلستان خزان کی زد میں تھا اور بہار کس دیس میں جاتی تھی۔

☆☆☆☆

ویسے کے بعد وہ ایک چکر گھر کا بھی لگا چکی تھی مگر گھر والوں کے ساتھ اس کا رویہ روڈ تھا اور اپنی عقل پر بھی ماتم کر رہی تھی کہ غصے میں آکر اس نے شایان کی تصویر کیوں نہیں دیکھی تھی پھپھو اور امی کی نیچر بہت نرم تھی وہ ان کے ساتھ مل گئی تھی شایان اس کا بہت خیال رکھتا، پیار لٹاتا مگر وہ بہت کم اس کی طرف دھیان دیتی خاص کر اسے دیکھنے سے گریز کرتی چاہتے ہوئے بھی اس رشتے سے کپڑا ماز مشکل لگ رہا تھا عجیب سی ایک بھاس دل میں لگی ہوئی تھی شایان کی انتہائی قربت

تھا جانے کیوں اسے ندامت سی ہونے لگی اور ماہا پر بھی غصہ آنے لگا۔

☆☆☆☆

کچھ دنوں میں ہی شایان کا رویہ بدلنے لگا وہ اس سے سرسری انداز سے پیش آنے لگا زیادہ وقت کام میں خود کو مصروف رکھتا اس کی دوری سے الویرا پریشان سی ہونے لگی اب وہ اس کی ایک نظر کی منتظر رہنے لگی اس کا نظر انداز کرنا اسے بری طرح چل رہا تھا وہ اسے موقع ہی نہیں دے رہا تھا کہ وہ شکوہ کرنی پھپھو اور شایان کے جانے کے بعد وہ اور ساسو ماں اکیلے رہ جاتیں وہ یچن میں ان کا ہاتھ بٹائی، الٹا کے سلیفے، طریقے اور انداز گفتگو سے وہ بہت متاثر تھی وہ شایان کے بچپن کے قصے سنا کر خود بھی ہنستیں اور اسے بھی ہنساتیں چند دنوں میں اس نے ان سے کافی کو لنگ سیکھ لی تھی ایک دن رات کا ڈنر اس نے خود تیار کیا تھا ہی کے کام کو وہ بہت غور سے دیکھتی تھی وہ ہر قسم کی کو لنگ بہت مہارت سے کرتی تھیں اس لیے خود کو آزمانے کے لیے رات کا ڈنر اس نے خود تیار کرنے کا ذمہ لیا، نرکسی کو فنے، مٹن پلاؤ، مکس سبزی اور میٹھے میں فروٹ ٹرانفل بنایا، رائیہ اور اسٹائش سا سلا د بھی بنایا۔ کھانا کھاتے ہوئے بالکل خاموشی تھی یہ بھی اس گھر کا طریقہ تھا کہ کھانا کھاتے ہوئے کسی قسم کی بول چال نہیں ہوتی تھی الویرا نے کن اکھیوں سے تینوں کا جائزہ لیا مگر وہ بالکل نارمل کھانا کھا رہے تھے فی الحال کوئی تعریف یا تنقید سامنے نہیں آئی تھی کھانے کے بعد نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے ماں سے کہا۔

”آج کھانے کا ذائقہ تو *changel* تھا۔“

”مثلاً کیسا ذائقہ تھا۔“ پھپھو نے شرارت سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”روٹین سے ہٹ کر اور بہت لذیذ۔“ شایان نے سنجیدگی سے کہا مگر آنکھیں شرارت سے چمک رہی

تھیں۔

”کچے زن مرید ہو بیوی کے ہاتھ کا کھا کر ماں کے ہاتھ کا ذائقہ بھول گئے؟“ پھپھو نے مسکراتے ہوئے ایک چپٹ لگائی۔

”میری بیبی نے واقعی بہت اچھا کھانا بنایا ہے۔“ امی نے پیار سے اسے دیکھتے ہوئے ہزار کا نوٹ تھمایا پھپھو نے بھی امی کی تقلید کی۔

”کیا اب مجھے بھی خرچا کرنا پڑے گا، ادھار نہیں چلے گا؟“ شایان نے سر کھجایا۔

”تم الویرا کو گھمانے لے جاؤ گے اور اس کا من پسند تحفہ بھی دلو او گے۔“ پھپھو نے تنبیہی نظروں سے اسے دیکھا۔

”اف اتنا مہنگا ذائقہ!۔“ شایان نے اودھم مچایا۔

”چلو شیطان مسخریاں بند کرو اور بیوی کو اس کا

انعام دو۔“ امی نے بھی چپٹ لگائی، مجبوراً شایان کو

الویرا کو لے کر نکلتا پڑا، الویرا اس کا گریز سمجھ رہی تھی وہ

اس کے ساتھ ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان تھی اس نے

نظروں کا زاویہ بدل کے شایان کو دیکھا اسٹیرنگ پہ

جیسے مضبوط ہاتھ، کلائی پہ ہندھی ریسٹ واچ، مضبوط

بازوؤں پہ گھٹے بال کتنی مضبوط پناہ گاہ تھی اس کے

مضبوط اور توانا بازو ہاتھوں سے نگاہ چرے پہ گئی چستی

آنکھیں، ماتھے پہ کھڑے بال جو ہوانے بکھر دیئے

تھے، ہونٹوں پہ نرم مسکان اور چہرے پہ پھیلی نرمی۔

”یہ شخص کتنا اپنا اپنا سا لگنے لگا ہے۔“ اسے یاد آیا

ایک دفعہ مودی دیکھتے ہوئے اس نے اس بہرون کا

خوب مذاق اڑایا تھا جو کم صورت، ہیرو کے روٹھے پر

زار و قطار رو رہی تھی۔

”پاگل دنیا میں کوئی شخص بھی عام نہیں ہوتا، محبت

جو آسانی اور الوہی جذبہ ہے اس کے جادو سے ہی

ایک شخص دوسرے کے لیے ساری دنیا سے منفرد نظر

آنے لگتا ہے چاہت کا پودا دل میں بھی اکتا ہے تو اس

کی جڑیں روح تک رسائی حاصل کرتی ہیں وہ

چاہت محبت بھری نظر بن کے جس چہرے پہ اٹھتی ہیں

☆☆☆☆

جس دن سے شایان پوری دنیا سے اس کے لیے متنفر ہو گیا تھا اور اس کی چاہت نے اس کے دل کے گلستان کو سرسبز کر دیا تھا ایک عجیب سا نقشہ اور سرگوشی اس کو اپنے حصار میں لے رہی تھی مگر شایان کا رویہ بدل گیا تھا اس کی دیوانگی میں کمی آ گئی تھی، وہ نارمل اس سے behave کرتا اس کی بے پروائی اسے پریشان کر رہی تھی وہ جتنا پاس آتی وہ اتنا دور ہو جاتا۔

☆☆☆☆

اس آنکھ پھولی میں خوشی کے شادیاں تب پھولے جب شایان نے چھٹی لی کے وہ چاروں اس رمضان عمرے کے لیے جائیں گے، الوریٰ کی خوشی کا ٹھکانہ ہی نہیں تھا یہ اس کی دیرینہ خواہش تھی کہ وہ اللہ کی چوکھٹ پہ جا کے مانگے اور بوسہ دے مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا، رمضان سے ایک دن پہلے انہوں نے جانا تھا کہ اچانک الوریٰ کی طبیعت خراب ہو گئی، چیک اپ کے بعد انکشاف ہوا خوشخبری کا سارا گھر خوشی سے جھوم اٹھا مگر الوریٰ کو ڈاکٹر نے سفر سے منع کر دیا اور وہ جیسے خاموش سی ہو گئی تھی امی اس کی خاطر رک گئیں اور پھر شایان کے جانے کے انتظامات مکمل ہو گئے، شایان جانے سے پہلے اس کے پاس آیا وہ نم آنکھیں لیے بیٹھی تھی۔

”میں نے بہت کوشش کی کہ ہم ساتھ جائیں، ہنی مون جیسی فرسودہ رسم کے بجائے اگر ہم وہ خرچہ اس پاک جگہ کی زیارت کریں تو ہماری کتنی پریشانیاں ختم ہو جائیں گی، خیر نصیب کی بات ہے، ابھی سوچا ہے تم نے حجرہ اسود کا رنگ بھی کالا ہے مگر وہ جنت کا پتھر ہے اور لوگ اسے بوسہ دینے کو ترستے ہیں اور تم کو کالا رنگ پسند نہیں اس لیے شاید وہ جگہ تمہارے حق میں نہیں تھی۔“ شایان کی بات پر تڑپ کر اس نے اسے دیکھا مگر اس کے چہرے پر کسی قسم کے طنز کا شائبہ تک نہیں تھا وہ اس کا ہاتھ دبا کر نکل گیا مگر کتنے ہی

وہ چہرے سارے زمانے سے ہٹ کے اور حسین ترین نظر آتا ہے اور ہمارے معاشرے میں عورت کی قدر اس کے شوہر کی وجہ سے ہوتی ہے بہت خوبصورت ڈش دیکھی میں بن جاتی ہے اس پر ڈھکن نہ ہوتو ہر کوئی اسے کھانے سے ہٹچکائے گا بالکل اسی طرح ڈھاپنی ہوئی اور ڈھکن سے ڈھکی ہر چیز لوگ بلا جھجک استعمال کرتے ہیں شوہر بھی بیوی کا محافظ ہوتا ہے جو معاشرے کے ہر بگاڑ سے اسے بچاتا ہے، گرم و سرد سے محفوظ رکھتا ہے اس کا اپنا جیون سا بھی رفته رفته اس کے لیے بہت خاص ہو رہا تھا ساری دنیا سے الگ اور نرالہ، نصہ کے واقعہ نے اس کے دل و دماغ سے وہ طلبہائی دنیا اور حسین و جمیل شہزادے کے تصور کو اکھاڑ کر پھینک دیا تھا بس اسے اب اپنے اصل شہزادے کو منانا تھا۔

”سمنر شایان ملک کیا آپ کچھ دیر اپنے خوابوں کی دنیا سے باہر آنا پسند کریں گی؟“ شایان کے سپاٹ لہجے نے اسے ماضی سے حال میں لا بٹھا تو وہ بری طرح گڑ بڑا گئی، شاپنگ کے دوران بھی وہ اس سے لا تعلق رہا اس نے موسم کی مناسبت سے امی اور پھر پھو کے لیے بھی سوٹ لیے کچھ اپنی ذاتی شاپنگ کی البتہ شایان نے اسے گولڈن ٹارڈ کی چین لے کر دی تھی، بقول اس کہ کے پھر پھر اور امی اس کی کلاس لیں گی کہ فرسٹ ٹائم شاپنگ پہ گئے اور کچھ ڈھنگ کی چیز بھی نہ خریدی پورا راستہ وہ گردن میں پہنی چین پر انگلیاں پھیرتے ہوئے مسکراتی رہی اور شایان کا ہے بگا ہے اس پر نظر ڈال رہا تھا جو سیٹ کی پشت پہ ٹیک لگائے مدھری مکان ہونٹوں پہ لیے جانے کس خوش کن احساس میں گھری ہوئی تھی۔

”آنکھوں کے جھروکوں سے میں نے دیکھا جو سانورے تم دور نظر آئے بہت دور نظر آئے۔“ لتا کی آواز گاڑی میں گونج رہی تھی اور شایان کی قربت اور اس کی خوشبو سے اس کا دل گویا پکھل رہا تھا۔

فارغ ہو کے جیسے وہ لیٹی امی مولانا طارق جمیل کا سیل پہ بیان رہی تھیں ریکارڈنگ چل رہی تھی۔
 ”روز حشر میں جوٹل پہلے تو لا جائے گا وہ بیوی کا شوہر سے حسن سلوک ہوگا۔“ اس کا پہلا عمل ہی نامص تھا اب اس شخص کا کس امرت بن کے اس کے دل پہ برس رہا تھا اور ندامت کے آنسو اس کے تکیے کو بھگوتے رہتے تھے۔

☆☆☆☆

21 دن اس پر 21 صدیاں بن کے گزریں تھیں آج اس دشمن جان کی آمد تھی دو دن پہلے ہی امی نے وائٹ واش کروا کے سارے گھر کی سینک چینج کروائی تھی آج افطاری ایشیال تھی اس کا میکہ بھی مدعو تھا آف وائٹ لان کے سوٹ میں ہلکا سامیک اپ کے امی کے منع کرنے کے باوجود وہ ان کے ساتھ لگی ہوئی تھی ان کا خانساں فضلہ بھی کام میں مصروف تھا کال بیل کی آواز پہ وہ لوگ چونکے، چوکیدار کے گیٹ کھولنے پر اور ساحت میں پڑنے والی آوازوں پہ وہ امی آگے پیچھے باہر نکلیں پھپھو ہینڈ بیگ تھامے شایان کو دیکھ کر گویا دونوں پہ ساری شادی مرگ طاری ہوگئی شایان امی سے لپٹا تھا اور پھپھو اس سے مل کے اس کا جائزہ لے رہی تھیں۔

”بہت کمزور ہوگئی ہو کیا روزے سارے رکھ رہی ہو اپنا خیال نہیں رکھ رہیں؟“

”اوہو پھپھو گرمی ہے اندر چلیں ان محترمہ کا پوسٹ مارٹم بعد میں کر لیجئے گا۔“ شایان نے اسے دیکھ کے سر ہلایا اور پھپھو کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے اندر چلا گیا امی کو اندر بھیج کر وہ کچن میں آگئی جانے کیوں آنسو اٹھانڈ کر برسنے کو تیار تھے۔
 ”فضلہ چچا کیا کیا بنایا ہے۔“ کچھ ٹائم کے بعد وہ دشمن جاں کچن میں آگیا۔

”بیٹا ہر وہ چیز جو آپ کو پسند ہے۔“ فضلہ پچانے دانت نکالے اور بھرائی کے آواز دینے پر وہ باہر چلے گئے۔

پچھتادوں کو اس کا مقدر بنا گیا تھا رمضان کا استقبال اس نے اس دفعہ بہت دل سے کیا اپنی خطاؤں کی معافی مانگی امی کے لاکھ منع کرنے کے باوجود وہ روزہ رکھتی عبادت خشوع و خضوع سے کرتی، وہ امی کے کمرے میں شفٹ ہو گئی تھی روزانہ رات کو وہ ایک sms اس دشمن جان کو کرتی جس کی چاہت نے اس کے وجود میں گل کا روپ دھار لیا تھا اور اس کی سانس کے ساتھ سانس لے رہا تھا۔

☆☆☆☆

پھپھو کال کرتیں اس سے بات کرتیں شایان بہت کم اس سے بات کرتا اور وہ دل مسوس کر رہ جاتی رات کو افطاری اور عبادت سے فارغ ہونے کے بعد امی اس کا دل بہلانے کے لیے شایان کے بچپن کے قصے سناتیں ان کے شوہر کی موت حادثاتی طور پر ہوئی ان کی پیدائش کے بعد ان کی ماں اور پھپھو نے انہیں مل کر پالا پھپھو نے ساری زندگی جیتنے کے لیے تیاگ دی اور اب شایان کے یہاں اس آنگن میں ایک اور گل کھلنے والا تھا اور اس کی خوشی وہ عید کے بعد کھل کر سلیم بیٹ کرنا چاہتے تھے، البوریا کی دعائیں طویل ہو گئیں دوسرے عشرے میں وہ اپنے رب سے اپنی خطاؤں کی بے پناہ معافی مانگی اس نے شایان سے کھل کے اپنی چاہت کا اظہار sms پر کر دیا تھا مگر دوسری طرف خاموشی تھی۔

☆☆☆☆

ایک شخص کے دور جانے سے اس کی زندگی جیسے ویران ہی ہو گئی تھی۔

”شوہر سے لا پرواہی برتنے والی اور اپنے خوابوں میں جینے والی لڑکیاں اپنے شوہروں سے سرد رویہ رکھنے کے باوجود ہار جاتی ہیں اپنے خوابوں میں گم اپنے شوہروں کے دل سے قدر کھودیتی ہیں کہاوت ہے کہ خوش نصیب وہ نہیں جس کا نصیب اچھا ہو بلکہ خوش نصیب وہ ہے جو اپنے نصیب سے خوش ہو۔“ رات کو

رہی ہے خطرہ ہے۔“ شایان نے تکیہ دوبارہ رکھا تو اس کا بی پی شوٹ کر گیا۔

”میری پہلی عید ہے، بجائے مجھے مہندی لگوانے اور چوڑیاں پہنانے کے آپ مزے سے سو رہے ہیں۔“ الویرا کی آوازیں آنسوؤں کی نمی گھل گئی تھی۔

”میں بد صورت ہوں تمہارے خوابوں کا شہزادہ نہیں ہوں اس لیے میرے ساتھ جانا سرا سرتہاری تو ہیں ہے۔“ شایان نے طنزیہ مسکراہٹ سے اندر کا زہر باہر نکالا تو الویرا پھوٹ پھوٹ کر رودی کچھ اس کی طبیعت سخت خراب تھی اس کا بی پی شدید لو ہو گیا تھا کچھ ہی دیر میں پھپھو اور امی بھی اس کے پاس تھیں شایان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے طبیعت پھٹنے پہ

اس نے ساری شکایت امی اور پھپھو سے کر دی جو زیر لب مسکراتے ہوئے شایان کے کان پہنچ رہی تھیں اور وہ فرما رہا تھا اپنی ہر غلطی مان رہا تھا اس کی کلاس لینے کے بعد پھپھو لوگ روم سے چلی گئیں شایان نے اس کی آنکھوں سے ہاتھ ہٹایا رونے سے متورم آنکھیں چہرے کی شادابی میں ذردیاں سی گھل گئی تھیں اس نے حلقی سے منہ موڑا مگر شایان نے ہاتھ پکڑ کر آہستہ سے اٹھایا اور تکیے کے سہارے بیٹھا کر اس نے کئی پیکٹ اس کے قدموں میں ڈھیر کر دیے کپڑے، جوتے، جیولری وغیرہ پھر ایک پیارا سا ویلیوٹ کا کیس کھول کر اس نے دو گولڈ کے ٹنگن اس کو پہنادیئے۔

”یہ میں نے مدینہ سے خریدے تھے تمہارے لیے کے چاند رات کو دوں گا چلو پہلے چاند رات ملو پھر مہندی لگوانے لے جاؤں گا چوڑیاں میں خود پہناؤں گا۔“ اس نے بازو کھولے الویرا سرخ ہو گئی شایان نے اسے قریب کیا تو وہ اس کے اندر جیسے سمٹ گئی۔

”میری عید میرے خواب میری خوشی تم ہو۔“ وہ ہولے سے بولی اور پھر شایان کی رم بھم برستی چاہت میں بھگینے کے لیے خود کو اس کے سپرد کر دیا۔

☆.....☆.....☆

”ایسا اب تم سناؤ sms تو بہت رومٹنگ سینڈ لی نہیں اور اب گونگے کا گڑ کھا کے بیٹھی ہو۔“ شایان نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑیں جو بھگی پللیں زمین پر جمائے ہوئے تھیں۔

”ویسے مہر شایان ذرا اپنے شوہر کو دیکھو کالا تو پہلے ہی سے تھا اور سے سر بھی گنجا ہے بلکہ ویسٹ انڈیز کا کھلاڑی لگ رہا ہوں۔“ شایان نے اپنا مذاق اڑاتے ہوئے تہقہ لگایا تو وہ حلقی سے اسے گھورتی تن فن کرتی کمرے سے نکل گئی اس کی پشت دیکھ کر شایان شرارت سے مسکرایا تھا۔

☆☆☆☆

افطاری بڑے اہتمام سے کی گئی تھی الویرا کی ساری فیملی بھی ہار پھول اور فروٹ لے کر آئی تھی عشاء کے بعد جب سب کی واپسی ہوئی تو سب تھکے ہارے تھے پھپھو نے بہت پیار سے اسے ڈانٹنے کی رنگ پہنائی تھی جو وہ خاص طور پر اس کے لیے لائی تھیں پھپھو سے وہاں کے قصے سن کر وہ روم میں آئی تو شایان کے خراٹے گونج رہے تھے جلتی کڑی وہ بھی اس کے ساتھ لیٹ گئی اور پھر کئی دن ایسے ہی رہا آفس کے بعد گھر پہ بھی آفس کا کام اور افطاری اور تروتوج کے بعد لمبی تان کے سو جانا، الویرا کا حوصلہ جواب دے رہا تھا آخری عشرہ بس اپنے آخری مراحل میں تھا اس کی عبادت طویل ہو گئی تھی اور طبیعت بھی بو جھل سی رہنے لگی امی اور پھپھو اس کا بہت زیادہ خیال رکھنے لگیں تھیں۔

☆☆☆☆

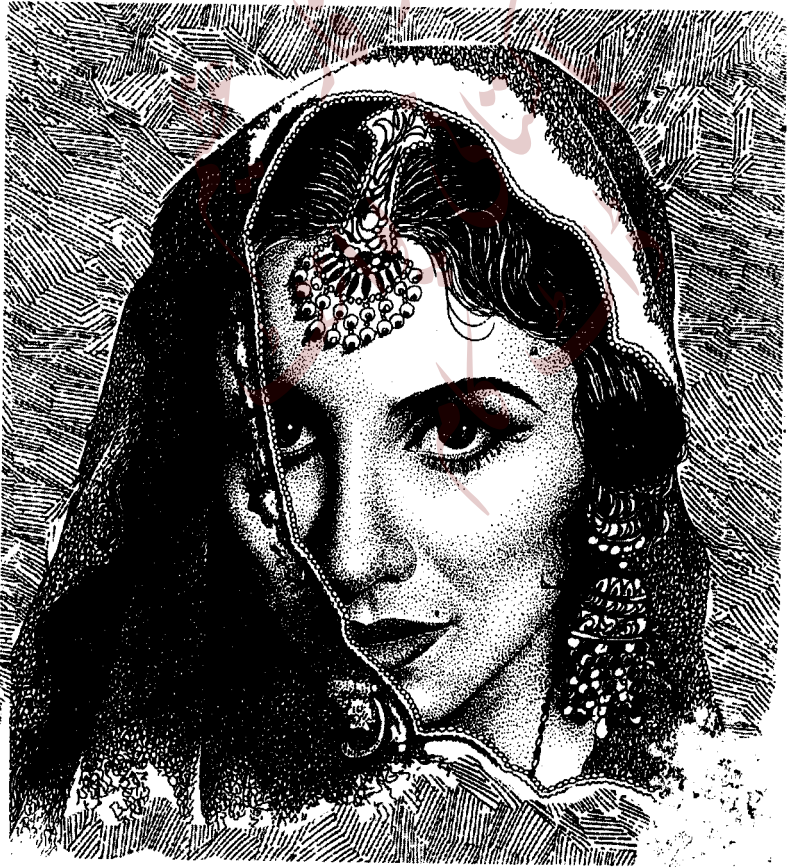
آخری روزے پہ اس کے صبر کا پیمانہ جیسے لبریز ہو گیا شایان افطاری کے بعد سے ہی کمرے میں لیٹ گیا تھا وہ مغرب کی نماز پڑھ کر آئی فضا میں چھجیویں کی آوازیں آرہیں تھیں صبح عید کا اعلان ہو گیا تھا۔

”چلیں ناں چھت پر چاند دیکھتے ہیں۔“ اس نے نکل اس کے چہرے سے ہٹایا۔

”نہیں ضرورت نہیں ویسے بھی کافی فائرنگ ہو

شہر الہی

”شایان بیٹا کچھ دیر اور رک سکتے ہو میرے پاس؟“ ان کی حریفی آواز پہ وہ ایک دم رک گیا۔
”جی پاپا کیوں؟“ وہ دروازہ بند کرتا ان کے سر ہانے آ بیٹھا۔



”نک نہیں کیا“۔ وہ چپ چاپ سنتا رہا۔
 ”28 سال کی عمر میں رائے انٹرپرائزرز میری
 ہو گئی تھی، اپنے ابو کا اکلوتا بیٹا تھا میں، امی کا چہرہ تک
 نہیں دیکھا تھا، مجھے جہنم دیتے ہی آنکھیں بند کر گئی
 تھیں، محنت کو کبھی عار نہیں سمجھا، رائے انٹرپرائزرز کو
 تین منزلہ سے سات منزلہ کر دیا، شہر کے ٹاپ ٹین
 بزنس ٹائیکونز میں میرا نام آتا تھا، شہر یا رائے قابل
 عزت، قابل رشک اور قابل چاہت بظاہر کوئی کمی

”میری محبت میں اگر کوئی کمی رہ گئی ہو تو مجھے
 معاف کر دینا ہے“۔ ان کی بات پر شایان نے ان
 کے دونوں ہاتھوں کو مضبوطی سے تھام لیا۔
 ”نہیں بابا! آپ کی محبتوں کا احسان کبھی نہیں چکا
 سکوں گا میں“۔ اس کی آنکھیں پھٹ گئیں، وہ کچھ دیر
 اسے دیکھتے رہے پھر ہولے سے آنکھیں موند لیں۔
 ”میں اتنا اچھا نہیں ہوں شایان! جتنا تم سمجھتے ہو
 گناہ میں نے بھی کئے ہیں اور اعتراف..... شاید آج



”پاپا! آپ کو تھوڑا آرام کر لینا چاہئے۔“ وہ ان کی نازک حالت کے پیش نظر بولا۔
 ”نہیں بیٹے! اعتراف کر لینے دو، بخشش تو نہ جانے نصیب میں ہے بھی یا نہیں۔“ وہ ان کی بات پر چپ ہو گیا۔

”بڑا مان تھا مجھے خود پر کہ وہ مجھے نہیں ٹھکرائے گی، آخر کمی کیا تھی مجھ میں، خوش شکل، خوش اطوار، خوشحال اور شاید ہر طرح سے پرفیکٹ، ٹھکرائے جانے کا سوال ہی نہیں تھا، مجھ جیسا انسان اس کی خوش نصیبی ہوتی، رشک ہوتا اسے اپنے آپ پر لیکن۔“ وہ آنسوؤں کے باعث بول نہ سکے۔

”اے میری کوئی ضرورت نہیں تھی اس کی زندگی میرے بغیر ہی چاند ستاروں سے پوری طرح مزین تھی، بے شک اس زندگی میں بڑا سا بنگلہ نہیں تھا، نوکر چاکر نہیں تھے آسائش نہیں تھیں، لمبی سی گاڑی نہیں تھی میں نہیں تھا، لیکن ان سب چیزوں کے بدلے اس کے پاس عنان تھا۔“ شایان ان کے چہرے پر ابھرتے تکلیف کے آثار دیکھ کر بے چین ہو گیا۔

”خلوص کی ہر حد کو پار کرتا ہوا، وفاؤں کی ہر انتہا کو چھوٹا ہوا، اس کی زندگی میں موجود ہر کمی کو پورا کرتا ہوا، اس کی شخصیت کی ہر خامی کو درگزر کرتا ہوا، سخت سردیوں میں اپنا اور کوٹ اس کے ٹھٹھرتے ہوئے کندھوں پر ڈال دیتا، تپتی گرمیوں میں اپنی شرٹ اتار کے اس کے چہرے پر ڈس کر دیتا، بائیک تک نہیں تھی اس کے پاس لیکن بھری کبھی نہ کسی سے مانگ تاگ کر اسے باقاعدگی سے آفس چھوڑ کر جاتا اور واپسی میں لینے بھی آتا، بھی تو میری ہر آسائش کو ایک لمحے میں ٹھکرا کر حور نے اسے چن لیا۔“

”عنان اس کی محنت میں پاگل ہوتا ہوا۔“ شہریار رائے کو اعتراف بہت مہنگا پڑ رہا تھا۔

”اور میں زندگی میں چلی بار ہار گیا، ستم یہ کہ میرے ابو نے مجھے اس بارے میں بھی کچھ نہیں بتایا۔“

نہیں تھی، کوئی ادھر اور یہاں نہیں تھا، میں ہر لحاظ سے پرفیکٹ تھا لیکن خدا نے کسی کو پرفیکٹ نہیں بنایا، شہریار رائے کی آواز ہلکتی چلی گئی۔

”شاید اس لئے کہ اگر بنادیتا تو ہر پرفیکٹ انسان فرش کا خدا ہوتا۔“ شایان نے دھیرے سے کہا تھا۔
 ”لیکن میں پرفیکٹ ہوئے بغیر بھی خدا بن بیٹھا۔“ آنسوؤں کے گالوں پر بہہ گئے۔

”ابو نے مجھے سب کچھ بتایا زندگی میں آنے والے ہر نشیب و فراز کے بارے میں، بزنس میں ہونے والی ہر اونچ نیچ کے بارے میں، رشتہ داروں کے بارے میں دنیا داریوں کے بارے میں لیکن، عشق داریوں کے بارے میں بتانا بھول گئے مجھے نہیں معلوم تھا کہ جب کوئی گلابوں جیسی مہک، ستاروں جیسی چمک اور سورج جیسی دمک لے کر راستے میں آجائے تو نظریں کیسے پھیرتے ہیں واپس کیسے پلٹتے ہیں راستہ کیسے بدلتے ہیں، مجھے نہیں پتہ تھا کاش میں جانتا ہوتا۔“ شایان چپ چاپ سنتا رہا۔

”میں اس کے انتہائی معصوم حسن کے آگے ہار گیا، اس نے بھی آنکھ بھر کر میری طرف نہیں دیکھا، کبھی گھٹنوں میرے آفس میں بیٹھ کر مجھ سے باتیں نہیں کیں، بھی میرے ساتھ سچ یا ڈنڈا کرنے نہیں گئی میری ہر بات کے جواب میں اس کے پاس صرف ایک لفظ ہوتا تھا، جی۔“ وہ کہتے کہتے رک گئے۔

”وہ کون تھی پاپا؟“ شایان بے حد حیران تھا۔

”حور ہے! میری ہر دھڑکن میں شامل، میری ہر سانس میں ٹھکی وہ رائے انٹر پرائزرز کے سوائے پیلاٹز میں سے ایک تھی بے حد مختی، بے سہارہ اور بے حد خاموش، اپنے کام سے کام رہتی اپنی ہر کوشش کے باوجود میں اس کے سامنے بکھرتا ہی چلا گیا، کبھی یہ سوچنے کی زحمت ہی نہیں کی کہ اس کی زندگی میں کوئی اور بھی ہو سکتا ہے۔“ شایان نے اس کے خشک ہوتے لبوں کے ساتھ پانی کا گلاس لگایا تھا۔

تھیں۔ نہ کوئی لفظ نہ کوئی آنسو نہ کوئی ماتم نہ کوئی سوال صرف بے یقینی اور گہری خاموشی۔ رات گیارہ بجے میں اس کا بے جان اور خاموش وجود بمشکل اپنی گاڑی میں ڈال کر اس کے گھر تک چھوڑ کر آیا پورے ایک ہفتے بعد وہ واپس آئی میں اس کا حلیہ دیکھ کر حیران رہ گیا، کپڑے تک تبدیل نہیں کئے تھے اس نے اس ایک ہفتے میں اس نے عنان کو ڈھونڈنے کی ہزاروں کوششیں کر لیں فارن ایمبسی کے کئی چکر لگائے، کوئی ٹریول ایجنٹ نہیں چھوڑا سارے انٹرنیشنل اخبار چھان مارے مگر عنان کا کوئی سراغ نہیں ملا اور ملتا بھی کیسے مجھے اس پر ذرا سا بھی ترس آتا تو ملتا ناں بڑی سفاکی سے میں نے اس کے دل میں خچر گھونپ دیا۔

”بس کرو اب بھول جاؤ اسے“۔ میری بات سن کر پہلی بار اس کی آنکھوں سے آنسو بہا کر آئے۔

”کسے بھول جاؤں سر! میں سانس لیتا بھول سکتی ہوں لیکن عنان کو نہیں بھول سکتی“۔ انسان اس وقت تک آنکھیں کھلی نہیں کرتا جب تک اسے یقین رہتا ہے کہ وہ جیت جائے گا لیکن جب آخری امید بھی ختم ہو جائے تو پھر سارے انتقام آنکھوں سے ہی لیتا ہے جیسے حوریہ لے رہی تھی میں بڑا چپ چاپ اس کے ہاتھوں میں نشوونما پکڑا چلا گیا۔

”پھر کیا ہوا پاپا؟“ شایان کو ان کا وقفہ کچھ زیادہ ہی طویل لگا۔

”وہی جو میں نے چاہا تھا عنان کی گمشدگی کے دس ماہ بعد میں نے اس سے شادی کر لی“۔ شایان بول نہ سکا، بس چپ چاپ انہیں دیکھتا رہ گیا۔

”ہماری بھینس تمہارے دم سے جواز ڈھونڈیں گی زندگی کا کھٹے والے نے لکھ دیا ہے مر لیض ہم کو طیب تم کو“

”میں شاید کبھی کسی کو نہ بتا سکوں کہ وہ میرے لئے کیا تھی شاید سانسوں کی طرح تھی جنہیں لئے بغیر گزارہ نہیں ہوتا یا شاید دھڑکن کی طرح جو رک

نہیں بتایا کہ جب کوئی چیز خواہش کے باوجود نہ ملے تو پھر صبر کیسے کرتے ہیں رونا تک نہیں آتا تھا مجھے تو پھر صبر کرنا کیسے آتا کیسے؟“ شایان نے ان کے کپکپاتے ہوئے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔

”تو بس پھر میں نے صبر کیا بھی نہیں آتا جو نہیں تھا جب تک برداشت ہوا کرتا رہا اور جب مجھے اپنی تنہائیوں سے خوف آنے لگا جب شدت سے اس کی خواہش ہونے لگی جب میری صبح وشام کا ہر ہر بل اس کے عکس سے سجے لگا تو میں نے اس کو اپنے اور اس کے بچ سے ہٹا دیا۔“ شایان دم بخود رہ گیا شہریار رائے کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ مزید بڑھ گئی۔

”وہ کسی اور انڈسٹری میں جا ب کرتا تھا“ میں نے حوریہ سے کہہ کر اس کا ٹرانسفر اپنی کمپنی میں کروایا اور ٹرانسفر کے چھ ماہ بعد اسے کیوبا بھیج دیا کبھی واپس نہ آنے کے لئے۔“

”آپ نے اسے مراد دیا پاپا؟“ شایان کی حیرانگی انتہاؤں پر تھی۔

”نہیں لیکن زندہ بھی نہیں رکھا“ حوریہ اس کا دل تھتی میں نے اس سے وہی چھین لی، کیوبا کی بدنام اور گمنام سلاخوں کے پیچھے اسے ہمیشہ کے لئے بے نام کر دیا کبھی سرعام نہ ہونے کے لئے۔“ شایان انہیں دیکھتا رہ گیا۔

”حوریہ؟“ اس نے ہولے سے پوچھا۔

”وہ مجھ سے ہر دوسرے دن اس کے بارے میں پوچھتی ایک ہی سوال وہ کب تک واپس آئے گا؟“ اور میرے پاس ایک ہی جواب ہوتا۔

”جب کام ختم ہو جائے گا“۔ پھر جب اس کی آنکھوں میں انتظار کے ساتھ ساتھ پریشانی اور خوف بھی نظر آنے لگا تو میں نے اپنا جواب بدل دیا۔

”اس کا پلین کرش ہو گیا ہے“۔ میں اس کی طرف دیکھ بھی نہ سکا دیکھتا بھی کیا بے یقینی سے پھیلے دو آنکھیں جو میرے چہرے پر مضبوطی سے گڑھ گئی

جائے تو آنکھیں بند ہو جائیں میرے وجود کے ہر ہر حصے سے اس کے لئے محبت پھوٹی تھی، والہانہ محبت اسے چاہنا میری زندگی کا سب سے اہم کارنامہ تھا۔“
شہر یار رائے کو وہ اس لمحے شدت سے یاد آ رہی تھی آسو ٹوٹ ٹوٹ کر ان کے چہرے پر بہہ رہے تھے شایان انہیں تسلی بھی نہ دے سکا۔
”پھر جب وہ میری محبتوں کی عادی ہونے لگی“
میرے وجود میں گم ہونے لگی اپنی مرضی سے میرے قریب ہونے لگی تو۔“

”تو کیا پایا؟“ وہ بے چین ہو گیا۔

”تو وہ واپس آ گیا۔“

”کون..... عنان؟“

”ہاں جس رات وہ پہلی بار دل سے مسکراتے ہوئے میری بازوؤں میں بکھری وہ اس رات لوٹ آیا۔“ شایان حیرانی کی حدود پر تھا۔
”عجب لڑکا تھا وہ بھی میری توقعات پر پورا نہیں اترتا وہ عمر کے جس حصے میں تھا اس میں لڑکے بڑے Ambitious ہوا کرتے ہیں جیسے تم ہو سب سے زیادہ فکر انہیں کیئریر بنانے کی ہوا کرتی ہے اسے کیوبا بھیجنے سے پہلے میں نے کسی اور کے ذریعے اسے ایک مشہور کمپنی میں ایم ڈی کی سیٹ آفر کی بدلے میں صرف اتنا مانگا کہ وہ حوریہ کی زندگی سے نکل جائے مگر میرے یقین کو ایک لمحے میں چکنا چور کرتے ہوئے اس نے انکار کر دیا، پھر جب اسے کیوبا بھیج دیا تو میرا پکا خیال تھا کہ چند ماہ بعد وہ حوریہ کو بھول جائے گا لیکن اس بار بھی میں غلط ثابت ہوا، ڈیڑھ سال بعد وہ وہاں سے نکلا تو سیدھا حوریہ کی طرف آیا مجھے یقین تھا کہ وہ اس کے پاس جا کر اسے میرے بارے میں گمراہ کرنے کی پوری کوشش کرے گے، مجھے برا بھلا کہے گا“
اس کے سامنے مجھے ہر طرح سے غلط ثابت کرنے کی کوشش کرے گا لیکن میں اس بار بھی درست نہ نکلا، وہ سیدھا میرے پاس آیا، آنکھوں میں قہر بھرے ہوئے

”تمہاری جرأت بھی کیسے ہوئی اسے ہاتھ لگانے کی؟“
”وہ میری بیوی ہے۔“ میری بات پہ وہ ہولے سے مسکرایا۔

”ہاں لیکن اب نہیں رہے گی اس کی محبتوں پر صرف میرا حق ہے۔“ مجھے انگلی اٹھا کر وارننگ دیتا وہ باہر نکل گیا تھا، شہر یار رائے کہتے کہتے چپ ہو گئے۔
”پھر کیا ہوا پایا؟ آپ نے چھوڑ دیا حوریہ کو؟“
شایان نے دھیرے سے پوچھا۔

”نہیں“ میں نے اسے نہیں چھوڑا، عنان نے اسے واپس پانے کی ہر ممکن کوشش کی اس کے سامنے رویا، گڑ گڑایا، اسے اپنی محبت کے واسطے دیئے لیکن حوریہ سے شادی کر کے میں نے اس پر جو احسان کیا تھا وہ اسے بھلا نہ سکی اس کی گردن اور کندھوں پر میری محبتوں کا بوجھ اس قدر شدید ہو گیا تھا کہ وہ سیدھی نہ ہو سکی، مجھ سے ایک بار بھی طلاق کا مطالبہ نہ کر سکی، عنان التجائیں کرتا رہ گیا مگر وہ نہیں مانی اس کا گریز عنان کا پاگل پن بڑھاتا چلا گیا اور پھر ایک دن وہ اسے زبردستی اپنے ساتھ لے گیا۔“
”کہاں؟“ شایان کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”خدا جانے مجھے رات گیارہ بجے اس کی کال آئی ایک ہی ڈیماڈ تھی اس کی حوریہ کو طلاق دے دو۔“

”میں اسے طلاق نہیں دوں گا۔“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا تھا۔

”میں تمہیں آخری بار کہہ رہا ہوں چھوڑ دو اسے ورنہ تمہارے قابل نہیں رہنے دوں گا۔“ حوریہ کی سسکیاں میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔

”جو مرضی کرو لیکن میں حوریہ کو طلاق نہیں دوں گا۔“

”تو پھر آج کی رات تنہا گزارو۔“ انتہائی نفرت سے کہتے ہوئے اس نے موبائل سائیڈ ٹیبل پر پھینکا تھا لحوں میں اس نے اپنی محبت کو گناہ بنالیا، حوریہ کی ٹوٹی

ٹوٹی سسکیاں میرے کانوں میں طوفان چا گئیں۔

”عنان“ وہ رورہی تھی۔

”بہت پیار کرتا ہوں تم سے“ نہیں برداشت کر سکتا تمہیں کسی اور کے ساتھ۔

”اس رات عنان نے مجھ سے ہر بدلہ لے لیا۔“

”لیکن پاپا“۔ شہریار رائے نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کاٹ دی۔

”اس رات کے بعد میں نے عنان کو دوبارہ گم کر دیا“ شاید ہمیشہ کے لئے بھی واپس نہ آنے کے لئے اسے بہت دور بھیج دیا۔

”پاپا آپ اسے“۔ شایان کے ذہن میں بے شمار سوال تھے مگر انہوں نے اس بار بھی اس کی بات کاٹ دی۔

”حوریہ کی آنکھیں خشک ہونے میں جیسے صدیاں لگ گئیں۔

”شہریار مجھے معاف کر دیں پلیز مجھے معاف کر دیں“۔ وہ روتے ہوئے میرے قدموں سے لپٹ جاتی اور میرے پاس اس کی ہر بات کا صرف ایک جواب تھا۔

”میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔“

”میں آئندہ عنان کی شکل بھی نہیں دیکھوں گی“ مجھے نفرت ہے اس کی صورت سے اس کے نام سے اور اس کے وجود سے۔ وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی

اور یہی میں چاہتا تھا۔

”چند ماہ بعد اس نے میری گود میں تمہیں ڈال دیا۔“

”شایان کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا بے یقینی سے وہ شہریار رائے کو دیکھتا رہ گیا۔

”صوفیہ میری ماما نہیں ہیں؟“ وہ ان کی بیوی کا نام لیتے ہوئے بولا۔

”نہیں تم حوریہ کے بیٹے ہو“۔ شایان کے ہاتھوں سے ان کے ہاتھ یکدم چھوٹ گئے۔

”آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔“ اسے شدید دکھ تھا۔

”میری ہمت نہیں ہوئی۔

”تو اب کیسے ہو گئی؟“ اس کے الفاظ سخت ہو گئے۔

”جب پتہ چل جائے کہ آخری وقت قریب ہے تو

یہ ہمت سب میں پیدا ہو جاتی ہے۔“ وہ رورہے تھے۔

”میری اس سے محبت میں اور اضافہ ہو گیا“ وہ

میری محبتوں کو اپنا حق سمجھ کر وصول نہیں کرتی تھی

احسان سمجھ کر کندھوں پر رکھ لیتی تھی میں اسے اپنی

جاہتوں سے جیتنا بھگوتا تھا وہ اتنی ہی میرے آگے

جھکتی چلی گئی وہ اکثر مجھ سے کہتی تھی۔

”شہریار آپ کے بہت احسان ہیں مجھ پر ایک

اس رات کا جس رات آپ مجھے آئس سے گھر چھوڑ

کر آئے تھے ایک اس رات کا جس رات آپ نے

مجھ سے نکاح کیا اور سب سے بڑا احسان اس بات کا

جب عنان نے مجھے گناہ گار کر دیا اور آپ نے کوئی

سرزنش کئے بغیر مجھے اپنا لیا۔“ میں اس کے نزدیک

فرشتہ تھا فرشتہ۔

”مجھے ان کا چہرہ تک یاد نہیں ہے پاپا انہوں نے

مجھے نہیں پالا تھا کیا؟“ شایان نے پوچھا۔

”نہیں وہ تمہاری پیدائش کے سات ماہ بعد مجھے

چھوڑ کر چلی گئی۔“ شایان دم بخود رہ گیا شہریار رائے

کے انکشافات بڑھتے جا رہے تھے۔

”کیوں پاپا؟“ وہ بے چینی سے بولا۔

”کیونکہ شادی کے چار سال بعد اس پہ سچ

آشکار ہو گیا تھا۔“

”کیسا سچ؟“ شایان حد سے زیادہ حیران تھا۔

”میں کبھی باپ نہیں بن سکتا تھا۔“ شایان ایک

دم کھڑا ہو گیا، اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔

”اس نے میری میڈیکل رپورٹ دیکھ لیں اس

کی گود میں کھلکھلاتا سات ماہ کا ننھا سا وجود میرا نہیں

تھا۔“ شایان کی آنکھوں میں مرچیں بھر گئیں۔

مجھ سے صرف ایک سوال پوچھا عنان زندہ ہے یا تم
 نے اسے مراد پایا؟“
 ”زندہ ہے۔“ بس وہ میرے یہ دو الفاظ لے کر
 ہمیشہ کے لئے چلی گئی۔

”اور عنان۔“ شایان دوبارہ ان کے پاس آ بیٹھا۔
 ”میں نے اسی روز اسے ایک بار پھر نکلوا دیا، کیونکہ
 اس لڑکے کے لبوں پر صرف ایک جملہ تھا۔
 ”حوریہ سے کہو مجھے معاف کر دے۔“

”واقعی محبت اس نے کی تھی، میں نے نہیں میں
 نے تو سودا کیا فائدہ اٹھایا خود غرضی دکھائی صرف ظلم
 کیا۔“ وہ بہت زار و قطار رو رہے تھے۔

”مجھے نہیں معلوم وہ دونوں ایک دوسرے سے مل
 سکے یا نہیں لیکن۔“ وہ بات ادھوری چھوڑ کر چپ ہو
 گئے۔

”لیکن کیا پایا؟“ وہ بمشکل انہیں پایا کہہ سکا۔
 ”مجھے کئی بار لگا جیسے وہ واپس آیا ہو، اٹھارہ سال
 کی عمر میں جب تمہارا اثر انسپلاٹ کرنا بہت ضروری ہو
 گیا اور گردہ بیچ اپ نہیں ہوا تو شاید وہی تھا جس نے
 آخری دم پہ تمہاری جان بچائی ڈاکٹرز نے مجھے بتایا
 کے ایک انجان شخص تمہیں اپنا گردہ دے گیا ہے اور
 میرے لئے ایک پیغام چھوڑ گیا۔“

”وہ میرا بیٹا ہے تمہارا نہیں۔“ شایان رو پڑا۔
 ”دو سال پہلے جب تمہارا ایکسڈینٹ ہوا اور
 +ve بلڈ گروپ نہیں مل رہا تھا تو شاید وہی تھا جس
 نے تمہیں خون دیا اور میرے لئے ایک بار پھر وہی
 پیغام چھوڑ گیا، وہ میرا بیٹا ہے تمہارا نہیں۔“ شہریار
 رائے کہتے چلے گئے۔

”تمہاری پرورش میں کبھی کوئی کی نہیں ہونے
 دی میں نے صوفیہ میری فرسٹ کزن تھی صرف تمہاری
 خاطر میں نے اس سے شادی کی تم میری محبت کی واحد
 نشانی ہو مجھے معاف کر دینا بیٹا۔“ وہ شہریار رائے کے
 جڑے ہوئے ہاتھ دیکھ کر ترپ گیا۔

”مجھے صرف ایک بات بتائیں، اتنے عرصے
 بعد عنان کیوں جیل سے چھوٹ گیا؟“
 ”اسے وہاں سے میں نے نکلویا تھا۔“ شہریار
 رائے دھیرے سے بولے۔

”شادی کے چند ماہ بعد مجھے پتا چلا کے میں
 پرفیکٹ نہیں تھا میرے اندر بہت بڑی کمی تھی دنیا
 والوں کو پتہ چلتا تو کیا ہوتا؟ میرے ساتھ، میری
 شہرت، میرا نام، سب کچھ ختم ہو جاتا کیسے سہتا میں
 لوگوں کی نظریں؟ کیسے برداشت کرتا رشتے داروں
 کے طعنے؟ کیا منہ دیکھتا میں حوریہ کو؟ بس اسی لئے
 میں نے جوا ہیلنے کا سوچا عنان اور حوریہ کی محبت میں
 اسے وہاں سے نکلویا میری توقع کے برخلاف وہ
 سیدھا میری طرف آیا، مجھے صرف اس کا غصہ بڑھانا
 تھا سو میں بڑھاتا گیا میرا انکار اسے اشتعال دلاتا چلا
 گیا اور پھر۔“ شایان نے ان کی بات کاٹ دی۔

”اور پھر آپ نے سوچا کے میری ماں کے سر پہ
 ایک اور احسان رکھ دیں میرے باپ کے دکھوں میں
 ایک اور کا اضافہ کر دیں ایک کو گنہگار بنا دیا اور
 دوسرے کو ہمیشہ کے لئے احسان مند بڑا ہی شاندار
 پلان تھا آپ کا شہریار رائے صاحب۔“ شایان کی
 آنکھیں برس گئیں۔

”ہاں پلان ہی تو بنایا تھا میں نے خود کو نجانے کیا
 سمجھ لیا بہت ظلم کیا میں نے۔“ انہیں شدت سے
 احساس ہو رہا تھا۔

”وہ کہاں گئیں آپ کو چھوڑ کر؟“ آنکھیں صاف
 کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”پتہ نہیں اس نے مجھے نہیں بتایا، میری محبتوں کی
 اسے کبھی بھی ضرورت نہیں تھی سولہ لگا اسے ٹھوکر
 مارنے میں جو مجھے چاہیے تھا وہ مجھے ہی دے گئی اپنا بیٹا
 جو دنیا کی نظروں میں شہریار رائے کا اکلوتا وارث تھا
 اپنے ساتھ کچھ بھی نہیں لے کر گئی، سوائے طلاق نامے
 کے جاتے ہوئے اس نے بے تحاشا روتے ہوئے

بہنیں اپنی ماں کے جنازے کے پاس بیٹھی بلک رہی تھیں اسے بہت دیر ہو گئی تھی بہتے آنسوؤں کے ساتھ وہ زمین پر گر گیا۔

”یہ کون ہے؟“ لالتعداد سوال۔

”یہ میری ماں تھیں“۔ وہ روتے ہوئے بولا۔
تھا۔ دونوں بہنوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
”شایان بھائی!“۔ دونوں کے لبوں سے یہ یک وقت نکلا۔

”میرے بابا کہاں ہیں؟“ اس نے بمشکل پوچھا۔
”وہ ماما سے پہلے ہی ہمیں چھوڑ گئے تھے۔“
شایان کے آنسوؤں میں روانی آگئی بمشکل خود کو سنبھال کر وہ جنازے میں شریک ہوا، تدفین سے فارغ ہو کر جب ہسپتال پہنچا تو ایک اور صدمہ اس کا منتظر تھا، شہر یار رائے کو شاید اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ خالی ہاتھ آئے گا سو وہ اس کے آنے سے پہلے ہی چلے گئے۔

”کچھ دیر اور رک جاتے پایا“۔ وہ ان کی لاش سے لپٹ گیا آج پہلی بار اسے اندازہ ہوا کہ تنہا ہو جانا کیا ہوتا ہے۔

☆☆☆☆

ابو ہم دونوں سے بہت پیار کرتے تھے لیکن ہم سے بھی زیادہ انہیں آپ سے محبت تھی، وہ اکثر ہم دونوں سے کہتے تھے کہ تم دونوں بہت خوش قسمت ہو کیونکہ تمہارے پاس میں اور حوریہ دونوں ہیں میرے بیٹے کے پاس تو کوئی بھی نہیں“۔ وہ دودن بعد دوبارہ وہاں آیا تھا رملہ دھیرے دھیرے اسے سب بتاتی چلی گئی۔

”وہ دونوں آپ کو کبھی نہیں بھولے کبھی نہیں وہ اکثر ماما سے کہتے تھے کہ تم نے تو مجھے معاف کر دیا پتہ نہیں میرا بیٹا مجھے معاف کرے گا یا نہیں“۔ شایان کے آنسو رواں ہو گئے۔

”میں انہیں معاف کرنے والا کون ہوتا ہوں بھلا“۔

”نہیں بابا! پلیر ایسے مت کریں“۔ خود بھی رو دیا۔

”آپ اپنے گناہ کا ازالہ کر سکتے تھے بابا! جب حوریہ آپ کو چھوڑ کر گئیں تھیں تب ہی انہیں عنان سے ملوا دیتے کم از کم آپ کو یہ تو پتہ ہوتا کہ وہ کہاں ہیں“۔ شایان درست تھا۔

”شایان جس وقت وہ مجھے چھوڑ کر گئی اس چیز کا ہوش نہیں تھا مجھے صرف یہ احساس تھا کہ میں اس کے بغیر نہیں جی پاؤں گا، میں نے سوچا اگر وہ عنان کو نہیں ڈھونڈ پائی تو شاید میری محبت میں نہ سہی تمہاری محبت میں ہی لوٹ آئے لیکن، شاید اسے پورا یقین تھا کہ عنان اسے مل جائے گا“۔ شہر یار رائے کے الفاظ ٹوٹنے لگے۔

”انہیں ڈھونڈو شایان جب عنان نے تمہیں ڈھونڈ لیا تو تم بھی ڈھونڈ لو گے اسے آخر کو اس کا خون ہو صرف ایک بار مجھے ان دونوں سے ملو اور میں آخری بار ایک دفعہ حوریہ کو دیکھنا چاہتا ہوں عنان سے معافی مانگنا چاہتا ہوں بہت کم ہوتے ہیں اس جیسے لوگ شاید جب دھرتی مجھ جیسے خود غرض اور گھٹیا لوگوں کا بوجھ برداشت کرتے کرتے تھک جاتی ہے؟ تو ہی پروردگار اس پر ترس کھا کر خور یہ اور عنان جیسے مخلص اور سچے انسان پیدا کرتا ہے اسے اپنا وہ بیٹا آج تک یاد ہے جس کا اس نے چہرہ تک نہیں دیکھا“۔ شایان نے ان کے آنسو صاف کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

☆☆☆☆

کہتے ہیں ناں لگن ہونی چاہیے بس پھر کسی چیز کا ملنا ناممکن نہیں ہوتا شایان رائے نے بھی اپنے پیدا کرنے والوں کا سراغ لگا لیا شہر یار رائے اس روز ICU میں تھے جب وہ ان کی آخری خواہش پوری کرنے اندرون لاہور چلا آیا گھر تو مل گیا لیکن جن سے ملنے آیا تھا وہ دونوں ہی نہ ملے اس کی دو چھوٹی

”ماما کو بتائے بغیر انہوں نے آپ کو اپنا گردہ دیا اور خود بیمار ہو گئے وہ ماما سے بھی بہت پیار لرتے تھے آپ کے لئے ماما ایک خط چھوڑ گئی تھیں مجھے کہہ کر گئی تھیں کے اگر شایان آجائے تو اسے دے دینا۔“ رملہ نے ایک لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔

”مجھے اور اپنے باپ کو معاف کر دینا میں نہیں ضرور اپنے ساتھ لے آئی اگر مجھ پر شہریار رائے کی بے تحاشہ محبت کا احسان نہ ہوتا اگر وہ زندہ ہے تو اسے کہنا کے میں نے اور عثمان دونوں نے اسے معاف کر دیا تم بھی اسے معاف کر دینا زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر چناؤ کرنا پڑتا ہے شایان بس وہ چناؤ ٹھیک ہونا چاہیے۔“ اس نے چپ چاپ تہہ کر کے وہ خط جیب میں ڈال لیا وہ سمجھ گیا تھا کہ حور یہ کس چناؤ کا کہہ کر گئی تھیں۔

☆☆☆☆

”آپ سے ایک بات کرنی تھی۔“ رات 10 بجے وہ صوفیہ کے کمرے میں آیا۔

”آؤ شایان۔“ وہ خوش دلی سے بولیں۔

”میں جانتا ہوں میری بات سے آپ کو بہت دکھ ہوگا لیکن شاید جو میں نے سوچا ہے وہی درست ہے۔“ وہ بولا۔

”کیا بات ہے بیٹا؟“ وہ پریشان ہو گئیں۔

”پاپا جو کچھ میرے نام کر کے گئے ہیں، میں وہ سب آپ کے نام کر رہا ہوں۔“ اس نے دھماکا کر دیا۔

”تین کیوں شایان؟“

”کیونکہ اس سب پہ میرا کوئی حق نہیں ہے۔“ آنسوؤں کے بیچ وہ دھیرے دھیرے بولتا چلا گیا۔

”اس ساری جائداد پہ صرف رائے خاندان کا حق ہے میرا نہیں یہ سب آپ کا ہے آپ اسے اپنے خاندان والوں پر خرچ کریں رائے انٹر پرائزز آج سے آپ کی ہے جیسے مرضی چلا میں میں اپنی دونوں بہنوں کو یہاں لا کر اپنے ماں باپ پہ انگلیاں نہیں

اٹھوانا چاہتا، میری ماں بالکل ٹھیک کر گئی ہے میری جگہ شہریار رائے کی سات منزلہ رائے انٹر پرائزز میں نہیں ہے، بلکہ اندرون لاہور حور یہ اور عثمان کے چھوٹے سے گھر میں ہے آپ کو میری کوئی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ آپ کے ساتھ پورا خاندان ہے لیکن میری دو بہنوں کو میری اشد ضرورت ہے بابا نے میرے لیے جو کچھ کیا میں اس کے لئے ہمیشہ احسان مند رہوں گا۔“ صوفیہ چپ چاپ اسے دیکھتیں رہیں۔

”مجھ سے ملنے تو آتے رہو گے ناں؟“ ان کی آنکھیں بھگ گئیں آخر چوبیس سال پالا تھا انہوں نے اسے۔

”کوشش کروں گا۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

”ابھی جا رہے ہو؟“ انہوں نے پوچھا۔

”جی۔“ ہو لے سے کہتے ہوئے اس نے گاڑی کی چابیاں سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیں۔

”پلیز بیٹا! گاڑی تو لے جاؤ، گفت سمجھ کر ہی سہی۔“

”نہیں ماما! میں اپنی گاڑی خود لے لوں گا۔“ آنسو صاف کرتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل آیا دل انتہائی ہلکا پھلکا ہو رہا تھا اسی رات وہ لاہور آ گیا، صبح سفیدی نمودار ہو رہی تھی جب اس نے اپنے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

”کون؟“ رملہ نے بلند آواز میں کہتے ہوئے دروازہ کھولا تھا۔

”تمہارا بھائی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے اسے کندھے سے لگا لیا۔

”ناعمہ شایان بھائی آ گئے۔“ خوشی کے مارے اس کی آواز پھٹ رہی تھی ناعمہ بھاگتی ہوئی اس کے دوسرے کندھے سے لٹک گئی۔

”اب آپ ہمارے ساتھ ہی رہیں گے ناں؟“ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس نے ایک لمبی سانس لی تھی۔

اتنا بھی مشکل نہیں ہو چناؤ کرنا۔

☆☆☆☆





برآمدے میں اس کا آچل تھام لیتا تھا اور سارے آنگن میں اس کے قہقہے گونجنے لگتے تھے۔

دادی مرگئی تھی تو ابانے مکان کے ساتھ ساتھ زمینیں بھی اس کے نام کر دی تھیں۔ وہ تھی ہی ایسی پچھل پہری۔ کسی کو بھی اپنے دس میں کر لیتی تھی یوں چٹکیوں میں کوئی بھی تسخیر ہو جاتا تھا۔

ابا آہستہ آہستہ بیمار ہونے لگا تھا۔ جانے کیوں بیمار رہنے لگا تھا۔ وہ اس وقت ساڑھے نو سال کی تھی جب اس نے سنا کہ اس کے ابا کا دماغ پھر گیا ہے۔

اب تو وہ اسے بھی نہیں پہچانتا تھا۔ جہاں کوئی بتاتا وہ پچھل پہری انہیں دیاں لے جاتی تھی۔ راز یہ کہ کسی کے پاس چھوڑ کر جانی وہ بھی ہمیشہ ساتھ ہی ہوتی تھی۔ وہ ابا کا ہاتھ پکڑ لیتی اور راز یہ اس کا پلو۔

”خالہ صغریٰ تیرا خیال رکھے گی میں تیرے ابا کو اسلام آباد وڈے اسپتال لے کر جا رہی ہوں جانے کتنے دن لگ جائیں تو گھر ہی پر رک۔“ ایک دن اس نے کہا تھا پھر ایک بیک میں ابا اور اپنے کپڑے بھر کر ان کا بازو پکڑ کر نکل گئی۔

اسے نہیں پتا تھا وہ اپنے ابو کو آخری دفعہ دیکھ رہی تھی۔ پورے پانچ دن بعد وہ روتی دھونی گھر واپس آ گئی کی وہ واپسی پر انہیں بس اڈے پر بٹھا کر ٹکٹ لینے گئی تھی مگر آنے تک وہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔ بڑا ڈھونڈا پر ملا نہیں۔

لوگ بڑی باتیں کرتے تھے۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔

”یہ خود اسے کہیں چھوڑ آئی ہے، کہیں پھینک آئی

وہ محض سات سال کی تھی جب اس کی ماں کالے بریقان سے مر گئی تھی۔ دادی بڑی عمر رسیدہ، آج مری اور کل دوسرا دن۔ ابا اسکول میں حساب پڑھا تا تھا۔ اکثر لوگوں نے اسے دوسری شادی کا مشورہ دیا جسے اس نے اپنی گانٹھ سے بھی باندھ لیا تھا۔

ابھی اس کی ماں کی قبر کی مٹی بھی نہ سوکھی ہوگی کہ وہ دوسری عورت بیاہ لایا۔ کوئی بھی عورت اس سے بیاہ کر لیتی کی کوئی نہ تھی، اپنا پکا مکان تھا ڈبل اسٹوری۔ چھ سات کچلے زمین بھی تھی اور اپنی پکی سرکاری نوکری بھی۔ ماں کا کیا تھا بڑی رہتی تھی ایک طرف اور چھوٹی بچی کو اپنے رنگ میں ڈھالنے میں کتنا سے جاتا بھلا۔ نہ کسی تندہ پور کا مٹھا، آزادی والا جیون تھا اور بھلا ایک عورت کیا چاہتی ہوگی اپنی زندگی سے۔

اس نے مکان اور دس تولے زیور اپنے نام لکھوایا تھا حق مہر میں۔ اور ابانے خوشی خوشی لکھ بھی دیا تھا۔

دو ہاجو کو اس عمر میں بھی کیا ایسی عورت ملی ہو بھلا؟ دودھ ملائی جیسی سفید اور اوچی لمبی جو کسی کا بھی خواب ہو سکتی تھی۔

وہ تو جیسے ہواؤں میں اڑتا تھا ان دنوں۔ سات سال کی بچی اس کے ساتھ لگ گئی تھی یا اس نے لگا لیا تھا خدا معلوم۔ وہ خود اس کی انگلی پکڑ کر اسے اسکول چھوڑ کر آتی تھی۔ دادی کی بھی خوب سیوا کرتی تھی۔

”تو میری کسی نیکی کا صلہ ہے۔“ ابا آتے جاتے

ہے۔ بھلا ایک پاگل کو کب تک برداشت کرتی
جوان جہان عورت ہے دوسرے کا سوچ رہی ہو
گی۔

مگر سب اس ایک بات پر متفق تھے۔ راز یہ کے
پاس سوال بے شمار تھے مگر جواب دینے والا کوئی نہ
تھا اور پوچھتی بھی تو کس سے۔

”تو کیا واقعی میرا ابا کو کہیں چھوڑ آئی ہے؟“ اس
نے ہمت کر کے پچھل پھری سے پوچھ ہی لیا تھا۔

اس دن اس نے پہلی اور آخری دفعہ اسے اتنا مارا
تھا کہ خدا کی پناہ۔ وہ مارتے مارتے تھک گئی تھی
مگر وہ مار کھاتے کھاتے نہ تھکی تھی۔ جب تھک گئی تو
خود ہی اسے سینے سے لگا لیا۔

شاید ظالم انسان کے پاس بھی دل ہوتا ہوگا۔
وقت سر کرنے لگا تھا۔ ابا کو کم ہوئے دو سال ہو
گئے تھے جب کچھ انجانے چہرے ان کے گھر آنے
لگے تھے۔ سنا تھا پچھل پیری نے دوسرا بیاہ کر لیا تھا
اور بیاہ کرنے والے کے نام اپنی زمین اور گھر بھی
کر دیا تھا۔

وہ گھر جو راز یہ کا تھا۔ وہ گھر جو اس کے ابا کا تھا۔
وہ اپنے ہی گھر میں اجنبی ہو گئی۔
اس دن جانے کیا ہوا تھا کہ پچھل پیری کے منہ
سے خون بہنے لگا تھا۔ اس نے ننھی راز یہ کو اپنے
پاس بلایا۔

”مجھے معاف کر دینا بیٹی! میں نے جس کے
پیارے گھرانے میں تیرے ابا کو لاوارث چھوڑا تھا،
آج اس نے ہی تھوڑی سی زمین اور مکان کے لالچ
میں مجھے مار ڈالا۔ مکافات عمل شاید اسے ہی کہتے
ہیں۔ بھول بھوک پھولوں کی آرزو نہیں کرتے۔ مجھے
معاف کر دینا، میں نے تیرا حق مارا تھا۔“ وہ گھٹ
گھٹ کر رو رہی تھی۔ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ
رکھے تھے جسے ”حق“ کے معنی بھی نہیں پتا تھے۔

☆.....

پندرہویں



ریحانہ آفتاب

عشقمی دوستی ہمارا پیاری

گزشتہ اقساط کا خلاصہ:
آنسو غریب گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ چار بہنوں میں اس کا نمبر دوسرا تھا۔ وہ سب میں حسین تھی۔ خود سے پہلے اپنے والدین اور بہنوں کی خوشی کا سوچتی تھی۔ کم عمری میں ہی اس نے گھر کی تنگدستی دور کرنے کے لیے



محنت کرنا شروع کر دی تھی۔ اپنے لیے خریدی چیزیں بہنوں کے پسند آجانے پر انہیں دے دیتی تھی۔ وہ اپنی روتی بلکتی زندگی سے عاجز بھی اس نے ٹھان لیا تھا کہ وہ کسی امیر کبیر بندے سے شادی کر کے اپنے گھر والوں کی زندگی سنوارے گی۔ دونوں چھوٹی بہنیں اس پر جان چھڑکتی تھیں۔ اس سے بڑی درخشاں کی آنسوؤں سے ٹھنی رہتی تھی۔ وہ طنز کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی۔ قدوس صاحب جو آنسوؤں کے والد ہیں اولاد پرینہ نہ ہونے پر اپنی بیوی باجرہ کو ساری زندگی باتیں سناتے رہے۔ انہیں آنسوؤں کا کالج جانا پسند نہیں تھا۔ باجرہ، آنسوؤں کے پارلر (جو اس نے گھر میں ہی کھولا ہوا تھا اور میلے کی عورتیں بڑے پارلر میں پیسے بچانے کی خاطر اس کے پاس آتی تھیں کہ وہ کم پیسوں میں بہترین کام کرتی تھی) اور کوچنگ سے ملنے والی آمدنی کے گن گائیں تو قدوس صاحب کی اتا بلبلا جاتی تھی۔ آنسوؤں بھی ان کی ملکی کنی کی زد میں رہتی تھی۔ عرفان ولی جدی پشتی رئیس ہے۔ Perfection اس کی پہچان ہے۔ ذرا بھی نقص اسے برداشت نہیں خواہ وہ چیز اسے کتنی ہی عزیز کیوں نہ ہو۔ وہ اپنے کمرے سے ملحق کمرے کی

فصل نمبر 7



زینت بنادیتا تھا مگر خود سے جدا کرنا گوارا نہیں تھا۔ عریشان ولی وجاہت کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ وہ بے حد ہمدرد دل رکھتا تھا۔ ماہ پارہ بے حد تک چڑھی اور ماؤرن خاتون ہیں۔ عریشان ولی کی والدہ محترمہ، فرہاد صاحب، ماہ پارہ کے مزاج کے بالکل برخلاف بہت اچھے انسان ہیں۔ ماہ پارہ اور فرہاد صاحب کی تین اولادیں ہیں۔ اسارا بڑی بیٹی ہے جو اپنے شوہر راجیل اور تین بچوں کے ساتھ شارجہ میں رہتی ہے۔ راجیل لاپٹی انسان ہے۔ اسارا، ماہ پارہ کی طرح تنگ مزاج ہے۔ اسارا سے چھوٹا شاہ میر ہے۔ جمنی، شاہ میر کی بیوی ہے جسے کم صورتی کے باعث اکثر ماہ پارہ جلی کٹی سٹانی تھیں۔ جمنی کی شادی کو پانچ سال ہو گئے تھے وہ ابھی تک بے اولاد کی کاشکار تھیں۔ جمنی سلجھ مزاج کی لڑکی ہے۔ ماہ پارہ کی بیٹ فریڈ واصلہ کی دو اولاد ہے۔ کاشان اور زویا۔ کاشان بخور اصف انسان ہے۔ فلرٹ اس کا من پسند مشغلہ ہے۔ زویا تک چڑھی لڑکی ہے۔ وہ عریشان ولی کو پسند کرتی ہے۔ اس کی نظر کرم حاصل کرنے کے جتن کرتی رہتی ہے۔ تینوں بچپن سے دوست ہیں۔ آنسور نے زویا سے بڑے جتن کر کے دوستی کی تھی۔ کاشان کی صورت میں محروم زندگی سے چھڑکا حاصل کرنا چاہتی تھی۔ زویا نے کاشان کو چیلنج کیا تھا کہ وہ آنسور سے فلرٹ کر کے دکھائے تو وہ استاد مان لے گی۔ کاشان نے چیلنج قبول کر لیا تھا جلد ہی اس نے آنسور سے دوستی کر لی۔ اسے سوٹ اور سیل فون گفت کیا۔ جدید اسمارٹ فون استعمال کرنا آنسور کو مشکل لگ رہا تھا۔ عریشان ولی، کاشان کو اس کی حرکتوں پر بے نقط کی ناسا رہتا تھا۔ اسے ان لڑکیوں پر غصہ آتا تھا جو کاشان کا شکار بنتی تھیں۔ وہ اپنی محبت اور جذبے اس کے لیے سنبھالے بیٹھا تھا جو صرف اس کی ہوتی۔ ولید عریشان ولی کا بیٹ فریڈ ہے۔ (اب آپ آگے پڑھیں)

☆☆☆

آنسور شاکڈ ہو گئی تھی، وہ بے یقینی کے تاثرات لیے عریشان ولی کو دیکھ رہی تھی، عریشان ولی سنجیدگی سے ا۔ دیکھ رہا تھا۔
 ”آپ ہمیں کمیڈ ہیں، کوئی الگ جنٹ وغیرہ؟“ عریشان ولی کی نظریں اس کے تذبذب بھرے انداز کو بغور د رہی تھیں۔ انگلیاں مروٹی وہ بے ساختہ نفی میں سر ہلا گئی۔
 ”آپ کی خاموشی کو کیا نام دوں؟“ وہ جیسے اس کی خاموشی سے الجھن کا شکار نظر آ رہا تھا۔ اس لمحے ایک عجیب طرح کا ڈر عریشان ولی کے وجہ سے چہرے پر آ گیا تھا۔
 ”سر! ہمارے درمیان کلاس ڈیفرنس۔“ وہ شاکڈ کی کیفیت سے نکلی تو زویا کے زنائے دار تہا جے کی گونج۔ اس کی آواز پست کر دی، چہرے پر سوج تاثرات تھے۔ شاید وہ اس کے حالات سے واقف نہیں تھا۔ جانتا تھا کہ وہ کن تک گلیوں میں رہتی ہے لیکن عریشان ولی نے جو کہا وہ اس کے توقع کے عین برخلاف تھا۔
 ”میں ان پکروں میں الجھنا نہیں چاہتا، رخصت ہو کر آپ کو میرے گھر آتا ہے، میں صرف آپ کی مرضی چاہتا ہوں۔“ عریشان ولی سر جھکائے بیٹھی آنسور کو نظروں کی گرفت میں لیے بیٹھا تھا۔ کئی تانے وہ خاموش نظر آتے اس کے تر دہرے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ عجیب نغمے میں الجھی نظر آ رہی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی کہ وہ کن لفظوں میں اپنا ڈر اس تک منتقل کرے۔ اسے تو اب تک عریشان ولی کا تقاضا کسی خواب سے کم نہیں آ رہا تھا۔ اس کی شادی کی خواہش اسے پریوں کی داستان لگ رہی تھی جیسے پلک جھپکتے ہی سارا سحر ختم ہو جاتا۔
 ”یعنی آپ کا جواب انکار میں ہے۔“ لب بھینچتے ہوئے میر سے اپنا سیل فون اٹھاتا عریشان ولی ایک دم۔ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے جھٹکے سے اٹھنے پر آنسور بھی جیسے اپنی لامتناہی سوچوں سے چونک گئی تھی۔
 ”میں نے انکار تو نہیں کیا۔“ انگلیاں مروٹی وہ جھپکتے ہوئے کہہ گئی۔ عریشان ولی کے اعصاب بھی جیسے ڈھ پڑنے لگے۔

”اتر ابھی نہیں کیا۔“ اس کے لبوں پر جاندار مسکراہٹ آگئی تھی۔ آنسور کے لبوں پر بے ساختہ شرمیلی مسکان اُبھرتی تھی۔

”اپنی ذات کے لیے کسی خاص بندے کی ہاں کتنی معنی رکھتی ہے۔ یہ میں نے آج جانا۔ تمہاری خاموشی نے آواز ہی دیا تھا۔“ عریشان ولی کی جیسے رکی سانس بحال ہوئی تھی۔ چہرے کی بشارت بحال ہوگئی تھی۔ وہ چیئر پر ابارہ بیٹھ گیا۔

”شاید میں نے کچھ زیادہ ہی مشکل سوال کر دیا تھا؟“ وہ اس کی خاموشی پر شریر ہورہا تھا۔ آنسور کو اس کی گہری نظروں کا سامنا کرنا مشکل ترین عمل لگ رہا تھا۔

”تم اتنی ہی شرمیلی ہو یا آج کچھ خاص بات ہے۔“ اس کے جملوں سے آنسور کو اپنی پھٹیلی میں نمی بڑھتی ہوئی دوس ہو رہی تھی۔ یہ یونانی دیوتا جیسا شخص اس سے محبت بھری باتیں کر رہا تھا اسے تو کسی خواب کا گمان ہو رہا تھا۔ ”میں جا رہی ہوں۔“ وہ بے ساختہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی گھبراہٹ پر عریشان ولی بے ساختہ چیئر سے اُبل لگا کر بس پڑا تھا۔ اس قدر خوب صورت مرد انا قہقہہ اس نے پہلی بار سنا تھا۔

☆.....☆

زویا صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے سگریٹ کے کش لگا رہی تھی۔ وہ اس وقت جینز اور شارٹ ٹی شرٹ میں ملبوس تھی۔ صبا کمرے میں داخل ہوئی اس کے پیچھے اس کی ملازمہ لوازمات کی ٹرائی لیے داخل ہوئی۔ صبانے قہر سے زویا کو دھواں اڑاتے دیکھا تھا۔ ملازمہ نے بھی زویا کو دیکھنے کے بعد صبا کو دیکھا تھا۔ صبانے اس کے قہر بھرے انداز کو کوفت سے دیکھا تھا۔

”تم جاؤ اور موما کو بتانے کی ضرورت نہیں۔ سمجھیں۔“ آنکھوں سے زویا کی حرکت کی سمت اشارہ کرتے اس نے تنبیہ نظروں سے اشارہ کیا۔ ملازمہ سر ہلاتی چلی گئی تھی۔ صبا ٹرائی صوفے تک پہنچ کر بیٹھ گئی تھی۔ ”تم نے اسموکنگ کب سے شروع کر دی؟“ وہ حیرانی سے اس کے انداز ملاحظہ کر رہی تھی۔ وہ بڑی مشتاقی سے کش لگا کر دھواں اڑا رہی تھی۔

”کچھ عرصہ ہوا، بڑی پرفیم دہا ہے۔“ دھواں اڑاتے وہ سروریلےج میں گویا تھی۔ ”زویا تم ڈرگز لینے لگی ہو؟“ کوکو سوئگٹے صبانے دھواں کو ہوا میں ہاتھ سے تحلیل کرتے جیسے صدمے سے اسے دیکھا۔ ”تو اس میں برائی کیا ہے؟“ نشے سے چور آنکھیں اس پر جمائے وہ البتا استفسار کر رہی تھی۔ ”اچھائی بھی کوئی نہیں، ختم کرو اس فضول شوق کو۔“ صبانے ناگواری کا اظہار کرتے سمجھایا۔ ”مشکل ہے۔ تم بھی ٹرائی کرو۔“ نفی میں سر ہلاتے زویا نے سگریٹ اس کی طرف بڑھائی۔ صبا بدک کر اُبھری۔

”توبہ کرو۔ میرے پایا آرمی میں ہیں۔ انہیں میری اس حرکت کی بھنک بھی پڑ گئی تو گھر سے نکال دیں گے۔“ زویا کے لبوں پر استہزاء مسکراہٹ آگئی تھی۔

”کیوں اپنی زندگی کے پیچھے پڑ گئی ہو، عریشان کے رنجیکٹ کیے جانے کا افسوس ہے؟“ صبا گہری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے خیال میں زویا کا بی ہرٹ ہوئی ہے تب ہی اس طرف آگئی تھی۔

”لغت بھیج جو اس پر، مجھے کوئی محبت و جنت نہیں بھی اس سے، بس اچھا لگتا ہے۔“ زویا ابانت کے احساس سے لگ گئی۔ رنجیکٹ کیے جانے کا غصہ ایک دم سے عود کر آ گیا۔

”تو پھر یہ کس خوشی میں۔“ صبا کی بات کو زویا کے تیز لہجے نے پورا نہیں ہونے دیا۔

”میں اتنی اسٹوڈنٹس کہ عرفان دلی کے لیے جوگ لے کے بیٹھ جاؤں۔ لائف انجوائے کر رہی ہوں۔ سوچا کچھ وقت تمہارے گھر میں اپنے گھر کے رگڑے گا مگر شاید میں نے یہاں آکر تمہیں تکلیف دی۔ اگر تمہیں پریشانی ہو رہے میری ایکٹیوٹی سے تو چلی جاتی ہوں۔“ اتنا سوال و جواب زویا کو بھی پسند نہیں رہا تھا۔ وہ اپنی مرضی کی مالک گھر کا ماحول ایسا تھا کہ کسی قسم کی روک ٹوک نہیں تھی۔ سب کی الگ دنیا تھی اور اس دنیا میں کوئی کسی کو روکتا تو کتنا بڑا تھا۔ زویا زور دے انداز میں جانے کے لیے اٹھنے لگی تو صبا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بٹھا دیا۔

”دوست ہوں۔ اس لیے سمجھا رہی ہوں۔“

”میں سمجھنا نہیں چاہتی۔“ زویا ناگواری سے سر جھٹک کے رہ گئی۔ صبا نے اب کے کچھ بھی کہنے سے احترا کیا۔ وہ بنیادی سے دھواں اڑاتی زویا کو دیکھنے لگی تھی۔

☆.....☆

بیلز پر اوندھی پڑی حمنی زار و قطار رو رہی تھی ماہ پارہ کمرے سے جا چکی تھیں۔ شاہ میر قدموں تلے رپورٹر دیکھتے بے ساختہ جھک کر پیپر اٹھانے لگا تھا۔ پیپر اٹھا کر اس نے چند ٹائپے ان پر نظریں جمائے رکھیں پھر ا کے قدم حمنی کی طرف اٹھنے لگے تھے۔

”پلیز نمٹنی روٹا بند کرو۔“ وہ بیلز پر بیٹھے ہوئے تادم لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”تم نے محبت کرنے کی بہت اچھی سزا دی ہے مجھے۔ شاہ میر! میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی تم مجھے دھوکا دو گے جھٹکے سے سراٹھاتے وہ روٹے ہوئے دھبی لہجے میں کہہ رہی تھی۔

”فاراڈ سیک یار! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ پرانی کلاس فیلو تھی، سر راہ مل گئی۔“ شاہ میر نے اپنی پوزیشن کا کرنے کی سعی کی۔

”سر راہ مل گئی اور تم نے اسے لٹچ آفر کر دیا۔ تمہارے میرڈ ہونے پر اسے حیرانی کیوں ہوئی؟ کیوں چھپایا نے یہ پتہ؟“ وہ غصہ تھی۔

”مانتا ہوں کہ غلطی ہو گئی، نہ اس نے پوچھا نہ میں نے بتایا مگر میں نے اسے صرف دوست ہی سمجھا ہے۔“ اپنی کوتاہی کا اعتراف کرتے ہوئے سچ بھی بتا رہا تھا۔

”تمہارے دل میں چور نہیں تھا تو تم نے مجھ سے فون پر جھوٹ کیوں کہا؟“ وہ بدگمانی سے جرح کر رہی تھی۔

”کیا کہتا۔ ایک فرینڈ کے ساتھ لٹچ کر رہا ہوں اور تم چپ کر کے بیٹھ جاتیں، ابھی نہیں، تم نے سوال کر کر۔“ میری جان ہلکان کر دینی تھی۔ مجھے پتا ہے تم میرے لیے کتنی پوزیسیو ہو۔“ شاہ میر نے سچائی سے اسے آگاہ کیا۔

”اور تم اسی کا فائدہ اٹھاتے ہو۔ جانتے ہونا میں تمہارے بنارہ نہیں سکتی۔“ وہ محبت کی ماری تھی، شکایت اسی سے کر رہی تھی۔

”BLEAVE ME صرف تمہیں ٹینشن اور فضول سوچوں سے بچانے کے لیے کہا تھا لیکن کیا خبر اس سے بڑی برائی لگے پڑ جائے گی۔“ وہ لا چاری سے کہہ رہا تھا۔

”میری مجبوری ہے کہ مجھے تمہارے ہر لفظ پر اعتبار کرنے کی عادت ہے۔“ حمنی آنسو بونچھتے محبت سے آ رہی تھی اسے خبر تھی اس کی کمی نے اسے زور و زور بنا دیا تھا۔ وہ اکثر اوقات شاہ میر کے ساتھ لٹچ کر جاتی تھی۔ کبھی دوست یا لڑکی کی وجہ سے ناراض ہو جاتی تھی جس کی وجہ سے شاہ میر کو جھوٹ بولنا پڑا تھا۔

”واقعی ورنہ ابھی تمہاری جگہ کوئی اور ہوتی تو الماری کھولے کپڑے نکال کر سوٹ کیس پیک کر کے ابا کے گھر ہانے کا سین کری ایٹ کر رہی ہوتی۔“ اس کے چپ ہو جانے پر شاہ میر نے سکون کا سانس لیتے ہنستے ہوئے کہا۔

”میں میدان چھوڑ کر بھاگنے والوں میں سے نہیں ہوں۔“ اس نے جتا دیا۔
 ”اسی لیے تو مسز شاہ میر ہو۔“ وہ اسے ساتھ لگا گیا تھا۔

☆.....☆

رات نے اپنے پر پھیلا لیے تھے۔ چھت کی منڈ پر پر کھنی ٹکائے ہاتھ کے پیالے میں چہرہ ٹکائے وہ آسمان نے روشن سینے پر جھکتے چاند کو دیکھ رہی تھی۔ بے یقینی اور خود فراموشی کی کیفیت میں مبتلا وہ کب سے خود کو یقین دلا رہی تھی کہ عرفشان ولی نے جو کچھ کہا وہ محض خواب و خیال نہیں تھا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ عرفشان ولی جیسا ہزارہ اس کا متمنی ہوگا۔ زویا اور کا شان کے واقعے کے بعد سے اس نے اپنے ہر خواب کو پس پشت ڈال کر یقین سے سمجھوتا کر کے خود کو بار کر دیا تھا کہ جاگتی آنکھوں سے دیکھے خواب بھی پورے نہیں ہوتے اور اب اس نے اپنے تلخ حقائق سے بھا کر لیا تھا تو عرفشان ولی اس کی زندگی میں آ گیا جیسے دیکھ کر اس کی دھڑکن اب پل کو رکی ضرور تھی لیکن اس نے اپنے ہر خیال کو ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ اسے خبر تھی وہ زمین کی دھول اور آسمان ولی عرش کا شاہزادہ ہے جسے وہ حسرت سے دیکھ تو سکتی تھی مگر اسے اپنے سر کا تاج نہیں بنا سکتی۔ اس لیے اب عرفشان ولی نے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو وہ شاکد رہ گئی تھی۔ اسے کاتب تقدیر پر یوٹ کے پیارا آیا تھا۔
 ”سچ ہے قسمت پر زور نہیں۔ میں اپنی قسمت خود بنانے چلی تھی۔ ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور منہ کی کھائی اور اب جب میں نے اپنے حالات سے سمجھوتا کر لیا تو عرفشان ولی سامنے آ گیا۔ تو بہت بے نیاز ہے مولا۔“
 اس کا ہر عضو بے عزت کی بارگاہ میں شکر گزار تھا۔ اس کی نظریں آسمان پر تھیں لیوں پر آسودہ مسکراہٹ تھی۔
 حالات خود بخود عرفشان ولی کی طرف مڑ گئے تھے۔

☆.....☆

کھڑکی سے شانہ لگائے اس کے لیوں پر پر کشش مسکراہٹ تھی۔
 ”عرفشان ولی! بڑا زعم تھا اپنے مضبوط اعصاب پر آج کیسے فلمی کھل گئی۔ آنسوؤں کی خاموشی پر کیسے زمین و مان لگا ہوں میں گھوم گئے تھے۔ ایک سیکنڈ میں چیزیں ریجنٹ کرتے ہو اگر جو آج آنسوؤں کا کارکردی تو.....“
 لب دانتوں تلے دباے نفی میں سر ہلاتے شانے اچکا کر تھکی سانس خارج کر گیا تھا۔
 ”میں کسی صورت اسے کھڑ نہیں سکتا، وہ کمیڈ ہوئی تو شاید میں خود کو مٹا دیتا۔ خود کو اتنا ہی بے اختیار محسوس رہا ہوں اس معاملے میں۔ پہلی نظر میں ہی احساس ہوا وہ میرے وجود کا حصہ ہے۔“
 ”I CANT LEVE WITHOUT HER!“ اس اعتراف نے اس کے لیوں پر بے ساختہ لہر اٹھ بکھیر دی تھی۔

”چپک کروں ہماری نیند اڑا کر مجھے مہ خواب خرگوش کے مزے تو نہیں لے رہیں۔“ سیل فون اٹھاتے اس لیوں پر معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ اس وقت وہ بلیک بنیان اور بلیک ٹراؤزر میں ملبوس تھا۔ بالوں میں نہ پھیرتے اس نے بے ساختہ آنسوؤں کا نمبر ملایا تھا۔
 سیل فون کی بجتی رنگ ٹون نے آنسوؤں کو بے ساختہ خیالی دنیا سے چونکنے پر مجبور کر گئی تھی۔ اجنبی نمبر کو حیرانی

سے دیکھتے اس نے کال ریسیو کی تھی۔

”عرشان ولی۔“ اپنے بے ساختہ نکلے لفظ پر وہ ساختہ لب دانتوں تلے دبائی تھی۔ اس کی سوچوں، خیالوں میں بسا نام بے اختیاری کی صورت لبوں سے ادا ہو گیا تھا۔ عرشان ولی نے سیل فون بے ساختہ کان سے ہٹا کر اسکرین کو دیکھا تھا۔

”کیا VOICE CALL میں میری تصویر بھی آرہی ہے۔“ سیل فون کان سے لگاتے اس نے مسکرا۔ ہوئے حیرانی سے دریافت کیا تھا۔

”جی آپ کون؟“ آنسو اس بے تکلف انداز پر کچھ جھل سی ہو گئی تھی۔

”ابھی بے اختیاری میں آپ کے لبوں سے جو نام نکلا وہی خاکسار ہوں۔“ اس نے دھیرے سے کہا۔

”عرشان ولی؟“ آنسو کو جیسے اپنی سماعت پر دھوکے کا گمان ہوا۔ تب ہی اس کی آواز میں خیر کارنگ پھلکنے لگا۔ ”یقین کرو آج سے پہلے کبھی اپنا نام اتنا معتبر نہیں لگا، لیتی رہو میرا نام، اچھا لگ رہا ہے خوشی ہوئی یہ جان کہ تم بھی مجھے ہی سوچ رہی تھیں۔“ درتے بچے سے ہٹ کر وہ بیڈنک آ گیا تھا۔

”نہیں تو۔“ لٹ کان کے پیچھے کرتی وہ جھل سی ہو گئی تھی۔

تم لاکھ چھپاؤ چہرے سے احساس ہماری چاہت کا!

دل جب بھی تمہارا دھڑکا ہے آواز یہاں تک آئی ہے

”واؤ! میں تو شاعر بن گیا۔ جانے کب یہ شعر پڑھا تھا اور کیا برکل ادا لگتی ہوئی ہے۔ VELDONE

عرشان ولی۔ KEEP IT UP۔“ نیم دراز ہونے کا اس کا انداز بے حد دلچسپ تھا۔

”آپ خود سے بھی باتیں کرتے ہیں۔“ وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

”آج سے پہلے تو ایسی اسٹوپڈ حرکت نہیں ہوئی تھی۔ ابتداء ایسی ہے جانے انتہا کیا ہوگی۔“ وہ جیسے خود ہنس رہا تھا۔

”آپ نے میرا نمبر کس سے لیا؟“ اس نے اپنی حیرانی کو زبان دی۔

”بہت ٹین ایجر والی حرکت کی ہے۔ اس قصے کو رپے ہی دو۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔

”پھر بھی!“ آنسو نے اصرار کیا۔

”تمہاری C.V سے۔“ اس نے مسکراتے لہجے میں سر کھجاتے ہوئے دھیرے سے کہا۔ آنسو کی ہنسی ساختہ تھی۔

”تو یہ ہے۔“ اس کی ہنسی قابو میں نہیں آرہی تھی۔ عرشان ولی جیسا بندہ اس قسم کی حرکت کا مرتکب ہو، ا۔ یقین نہیں آ رہا تھا۔

”تم ہنسنے کا شوق پورا کر لو۔ باتیں بعد میں کر لیں گے۔“ جھوٹی خفگی دکھاتے اس نے منہ بنایا۔

”ایک بزنس ٹائیکون جب ایسی حرکت کرے تو ہنسنا تو بنتا ہے۔“ ہنسی روکتے ہوئے اس نے مزالیا۔

”ہنسو..... ویسے بھی تم ہنسی اچھی لگتی ہو۔ لو میں پھر سے لظم پڑھنے لگا۔ یہ مجھے ہو کیا گیا ہے۔“ سر کے بالوں مٹھی میں جکڑتے وہ اپنی بے اختیاری پر خود حیرت زدہ تھا۔ آنسو ایک بار پھر ہنسنے لگی تھی۔ عرشان ولی کا یہ رد، اس کے لیے بہت اچھوتا اور پیارا تھا۔

☆.....☆

”کیا ہوا آپ ناشتے کے لیے باہر نہیں آ رہے؟“ راجیل سر پکڑے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات تھے۔ اسمارانے داخل ہو کر اسے اس پوز میں دیکھا تو استفسار کرنے لگی۔

”نما کا ایس ایم ایس پڑھ لو۔ وہ گھر چھوڑ کر جا چکی ہے۔“ راجیل نے اپنا سیل فون اسے تھمایا۔ اسمارانے ایس ایم ایس پڑھا اور اس کے چہرے پر بھی لکیریں ابھرنے لگیں لیکن یہ ناگواری کی لکیریں تھیں۔

”وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔“ راجیل کا انداز تھکا ہوا تھا۔

”چار بجے تو وہ کچن میں کافی بنا رہی تھی۔“ اسمارانے حیرانی سے اسے دیکھا۔

”اور دروازہ میں نے خود لاک کیا تھا۔“ وہ حیران تھی کیونکہ چابی اس کے پاس ہوتی تھی۔

”تمہارا کیا خیال ہے ڈومیلکٹ چابی بنوانا کون سا مشکل کام ہے۔“ راجیل چڑ گیا۔

”پھر اب.....“ اسمارا کو اس کے سوگ والے انداز پر غصہ آ رہا تھا۔ اب وہ کوئی دودھ پیتی پچی تو تھی نہیں،

پنجاب کے کسی پسماندہ علاقے میں تو موجود نہیں تھی جس پر سختی کر کے وہ اسے اس نیکرے شادی کرنے سے روک لیتی۔ اس کے جانے کا سن کر اسمارانے سکون کا سانس لیا۔ بلاوجہ کی چوکیداری سے تو جان چھوٹی تھی۔

”اب کیا.....! نکل گیا جنازہ عزت کا۔ مہینوں نظر رکھنا کام نہ آیا۔“ راجیل افسوس سے ہاتھ مل رہا تھا۔ حظلہ چلتا ہوا اسمارا تک آیا، اسمارانے اسے اٹھا کر گود میں بٹھالیا۔

”کیا ہو جاتا جو تم عرشان کو منالیتیں۔ لیکن تم نے ذرا کوشش نہ کی التناج بتا کر میری عزت دو کوڑی کی کردی۔ بھرم نہیں رکھ سکیں میاں کا۔“ راجیل غصے سے گھوڑنے لگا۔

”آپ کا شمار احسان فراموش لوگوں میں ہوتا ہے۔ کروڑوں آپ نے بینک سے نکلوا لیے مگر پھر بھی میری فیملی اور مجھ سے آپ کو شکایت ہی ہے۔“ اسمارا فوراً بھڑک گئی تھی۔

”لوٹا دوں گا تمہارے باپ کا پیسہ کھا کے مر نہیں جاؤں گا اور آئندہ باپ کے پیسوں کا رعب مت جھاڑنا۔“ راجیل غصے سے واک آؤٹ کر گیا۔

”خود کی بہن نیکرے کے پیچھے پھل ہے اور مہینوں سے جان میری مشکل میں پھنسی ہوئی ہے۔ اچھا ہوا بھاگ مئی جان چھوٹی..... میری بھائی بننے کے لائق تھی وہ کلو پری۔ شہزادہ جیسا میرا بھائی اور کہاں وہ جمہورانی جیسی شکل والی۔ ہونہہ!“ اسمارا بڑبڑاتی ہوئی حظلہ کے کپڑے تبدیل کرنے لگی۔

☆.....☆

خدیجہ ہاتھ میں تسبیح لیے پڑھ رہی تھیں۔ آصف کلانی میں بندھی گھڑی دیکھتے کچن کی طرف بھی نظر ڈال رہا تھا۔ ”درخشاں لے بھی آؤ ناشتا اور کتنا نام لگاؤ گی۔“ آصف پہلو بدلتے کچن کی طرف منہ کر کے آواز لگا رہا تھا۔ تک سب سے تیار درخشاں لان کا نپا سوٹ پہنے ناشتے کی ٹرے تھامے کچن سے نکلی۔ پیروں میں اچھی چپل کے باوجود گھٹیت گھٹیت کے پیر چلائی ٹرے پھینکنے کے انداز میں پلنگ پر رکھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ ٹرے میں موجود آؤتر چھاپا پڑھا اور آلیٹ کے نام پرائڈوں کا ملیدہ تھا۔

”یہ آلیٹ بتایا ہے تم نے؟“ آصف شدید بھوک اور دیری کے باوجود ایسا ناشتا دیکھ کر صدمے میں گھر گیا۔ ”کیوں آلیٹ کی بجائے چکن لگ رہی ہے؟“ درخشاں نے تڑخ کے کہا۔ آصف بے چارگی سے خدیجہ کو دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے بھی ناشتے کے نام پر لوازمات دیکھ کر درخشاں کی طرف دیکھا۔

”بیٹا کتنی بار سمجھایا ہے آلیٹ ایک طرف سے اچھی طرح پک جائے تب پلٹنا۔ پھر نہیں ٹوٹے گا۔“ خدیجہ

نے ملاحظت سے سمجھایا۔
 ”پیس رننے دیں، مجھ سے انڈے ایسے ہی بنتے ہیں۔“ ہاتھ جھلاتے ہوئے درخشاں نے بدتمیزی سے کہا۔
 خدیجہ چٹکی ہو گئی۔ آصف، خدیجہ کی طرف شکایتی نظروں سے دیکھنے لگا۔
 ”آپ ہی نے سلیقہ شعاری اور لذیذ کھانوں کا ڈھنڈورا پیٹ رکھا تھا۔ دیکھ لیا۔“ آصف نے چڑکے خدیجہ بیگم کو دیکھا۔

”ماں سے کیوں بات کر رہے ہو مجھ سے کرو۔ میرے گھر میں کھانا آنسو ہی پکاتی تھی۔ جب بھی تمہاری ماں آئیں اور اتنا ہی آنسو کے کھانوں کا ذائقہ یاد آ رہا ہے تو جاؤ جا کے کھالو میرے باپ کے گھر۔ آؤ بھگت کرنے کو تیار بیٹھی ہوگی آنسو، ویسے بھی اسے لوگوں کے آگے بچھنے کا شوق ہے۔“ وہ جل کے کھری کھری سنار ہی تھی۔
 ”بہن کے لیے تو اچھا بول لیا کرو جس کے کھانوں نے تمہاری شادی کروانے میں اہم کردار ادا کیا، ورنہ تمہیں کون پوچھتا۔“ تاسف سے کہتے آخر میں آصف نے تلخ سچائی سے کہا۔
 ”کیوں میں لولی لنگڑی ہوں۔ ہزاروں رشتے آئے تھے میرے۔ بس قسمت یہاں پھوٹا تھی۔ سر درد سے پھنسا جا رہا ہے مگر کسی کو میری کوئی فکر نہیں ہے۔“ وہ غصے میں آگئی۔

”تم آرام کرو..... ہانڈی روٹی میں کرلوں گی۔“ خدیجہ نے نرم لہجے میں کہا۔ آصف شکایتی نظروں سے خدیجہ کو دیکھنے لگا تھا۔ درخشاں بجائے اس محبت کا مان رکھنے کے تنگ کے کمرے میں جانے لگی۔ پھر ایک دم سے پلیٹ آئی۔

”آتے ہوئے میرے لیے تین چار لان کے اچھے پرنٹ کے سوٹ لیتے آنا۔ بہت گرمی ہو گئی ہے۔“
 ”ابھی پچھلے مہینے تو دو سوٹ لاکر دیئے تھے۔“ آصف حیرت سے اس کی شکل دیکھنے لگا۔
 ”ہاں تو نظر نہیں آ رہا، یہ پہن رکھا ہے سوٹ، اب کیا دو سوٹ پر ساری زندگی کاٹ دوں۔ ہر بار گھر نیا سوٹ پہن کر جاتی ہوں۔ تمہاری تعریفوں کے جھوٹے پل بھی تو باندھتی ہوں۔ یاد سے لیتے آنا۔“ درخشاں کے آگے اچھے اچھوں نے ہار مانی بھی یہ تو بے چارے معصوم سے لوگ تھے۔

”روز ناشتے کی وجہ سے اسٹال لگانے میں دیر ہو جاتی ہے۔ کل سے آپ میرا ناشتا بنا دیجیے گا۔ ایسے عجیب و غریب بد ذائقہ کھانے کھا کر معدہ خراب نہیں کرنا ہے مجھے۔“ ناشتا کی ٹرے سائیڈ پر رکھ کر آصف جوتے پہننے لگا۔ خدیجہ کو افسوس ہو رہا تھا۔

”کاش میں نے آنسو کا انتخاب کیا ہوتا۔ کسی ہیروں سی بچی ہے۔ صورت و سیرت میں یکتا۔“ خدیجہ ٹرے کچن میں لے گئی۔ وہ تاسف کا شکار ہو گئی تھیں۔ بھرا گدا کچن ان کی نفاست پسند طبیعت پر گراں گزرا تھا۔ وہ کچن کی حالت بدلنے لگیں اور درخشاں اپنے کمرے میں آرام سے دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگی۔

☆.....☆

”پاپے تو لے لو، خالی چائے پی رہی ہو۔ ڈھنگ سے ناشتا کیا کرو۔ صبح کی نکلی منہ اندھیرے گھر آتی ہو۔“
 آنسو آفس کے لیے جلدی جلدی تیاری کر کے چائے پی رہی تھی۔ ہاجرہ فکر مندی سے پاپے کی پلیٹ اس کے سامنے رکھ گئی تھیں۔

”دیر ہو رہی ہے۔ وین آنے والی ہوگی۔“ وہ غلت بھرے انداز میں گرم چائے حلق سے اتار رہی تھی۔
 ”صحت برباد ہو جائے گی۔ ویسے کون سا دودھ، دہی، مکھن روز کھا رہی ہو۔“ ہاجرہ افسردگی سے گویا تھیں۔

”میں ٹھیک ہوں اماں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے ان کی فکر دور کرنا چاہی۔
 ”دوپہر میں آفس والے کھانا تو ڈھنگ سے دیتے ہیں ناں؟“ ہاجرہ نے آفس کا ذکر کیا تھا اور اس کے تصور کے پردوں پر عریشانِ ولی چلا آیا تھا۔ اس کے لبوں پر بے ساختہ دھیمی مسکان پھیل گئی تھی۔ رات کی ساری گفتگو یاد آنے لگی تھی۔

”جی بہت اچھا آفس ہے۔ بہت خیال رکھتے ہیں۔ تمام ورکرز کو اپنی پسند کا کھانا آرڈر کرنے کی اجازت ہے۔“ اس نے سچائی سے کہا۔ ہاجرہ کے چہرے پر اطمینان پھیل گیا۔ انہوں نے لڑکی ذات کو نوکری کی اجازت تو دے دی تھی حالات سے مجبور ہو کر مگر وہ پہلو میں ماں کا فکر مند دل بھی رکھتی تھیں۔
 ”چلو شکر ہے آنسو رو نہ تنخواہ کب تک ملے گی؟“ شکر یہ کلمات ادا کر کے وہ جھجکتی ہوئی آنسو رو دیکھ کر رہ گئیں۔ وہ بے ساختہ سر پر ہاتھ مار کے پرس میں ہاتھ ڈالنے لگی۔

”تنخواہ تو کل ہی مل گئی تھی۔ میں رات آپ کو دینا بھول گئی۔ اچھا ہوا آپ نے یاد دلایا۔“ پرس سے لفافہ نکال کر اس نے ہاجرہ کے ہاتھ میں دیا تھا۔ ہاجرہ کے چہرے پر چمک سی آگئی تھی۔ اسی لمحے دین کا ہارن بجا۔
 ”وین آگئی اماں، اچھا میں جا رہی ہوں اللہ حافظ۔“ آنسو پر اس اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھی۔ ہاجرہ اسے چھوڑنے دروازے تک گئی تھی۔

”اللہ حافظ!“ وین گئی تو وہ بھی دروازہ بند کر کے پلنگ پر آ گئیں۔ لفافہ کھول کر ہاتھ اندر ڈالا اور جب ہاتھ باہر آیا تو اس میں کڑکڑاتے ہزار ہزار کے نوٹ تھے۔ ہاجرہ کے چہرے سے خوشی صاف ظاہر تھی۔ وہ نوٹوں کو گننے لگیں۔

”کتنے عرصے بعد ایک ساتھ پندرہ ہزار کی رقم دیکھی ہے۔ شاید زندگی میں دوسری یا پہلی بار۔“ وہ یادداشت کھنگالنے لگیں۔ مگر باوجود کوشش کے انہیں یاد نہ آ سکا کہ اتنی بڑی رقم انہوں نے پہلے کب دیکھی تھی۔ رقم واپس لفافے میں رکھتے وہ ٹھٹھک گئی تھیں۔ پھر تردد کے تاثرات کے ساتھ انہوں نے ہزار کا نوٹ کھینچ کے نکالا۔ یوں جیسے وہ ان پیسوں کو خرچ نہ کرنا چاہ رہی ہوں۔“

”پہلے سعدیہ کا ادھار تو چکا دوں۔“ لفافہ سنبھال کر رکھتے وہ ہزار کا نوٹ دبا کر دروازے کی طرف بڑھیں۔

☆.....☆

”میرے کچھ گیسٹ آر ہے ہیں ڈنر پر۔ اچھی آرہجنٹ کروادینا لان میں۔“ ماہ پارہ لاؤنج میں براہمان مودب کھڑے ملازم کو ہدایت کر رہی تھیں اور ملازم سر ہل رہا تھا۔
 ”جاؤ اور شیف کو بھیجیو۔ میں اسے میو سمجھاؤں۔“ ملازم حکم کی تعمیل کو چل دیا تھا۔ ماہ پارہ کا فون بجنے لگا۔ اسارا کا لنگ دیکھ کر اس نے کال پک کر لی۔

”کیسی ہو، بچے کیسے ہیں؟“ وہ بے ساختہ گفتگو کا آغاز کر بیٹھیں۔
 ”سب خیریت سے ہیں۔“

”اور راجیل؟“ ماہ پارہ کو اس کی طرف سے ہمیشہ دھڑکا ہی لگا رہتا تھا۔ ”صدے میں ہیں!“ اسارا کا لہجہ استہزائیہ تھا۔

”کیوں..... کیا ہوا؟“ انہیں حیرانی ہوئی۔

”نمر اکھر سے بھاگ گئی۔ شادی کرنے نیکرو سے۔“ اس کا لہجہ بے زاری لیے ہوئے تھا۔

”اوہ!“ ماہ پارہ نے بے ساختہ ہونٹ سکڑ لیے۔
 ”جانے کب نکلی گھر سے۔ میں نے خود لاک کیا تھا گیٹ۔“
 ”دفع کرو، تمہیں کوئی ضرورت نہیں ہے ٹینشن لینے کی۔“ ماہ پارہ نے ناگواری سے قصہ مختصر کیا۔
 ”میں کیوں ٹینشن لینے لگی۔ مجھے تو خوشی ہے مگرانی سے تو جان چھوٹی۔ میں تو نمر کی وجہ سے گھر قید ہو کر رہ گئی تھی۔ ہر وقت رکھوالی کرو۔“ وہ منہ ہٹا کے رہ گئی۔
 ”تم نے راجیل کو زیادہ ڈھیل دے رکھی ہے۔ حمی سے سبق سیکھو نہ شکل نہ صورت شاہ میر کو الو بنا رکھا ہے۔“ ماہ پارہ جو ان کے جھگڑے پر خوش تھیں انہیں دوبارہ ایک ہوتا دیکھ کر بل کھا کے رہ گئی تھیں۔
 ”جانے کہاں سے آتے ہیں عورتوں کو ایسے گرجھے تو آج تک نہ آئے۔ دفع کریں سب کو یہ بتائیں عریشان اور زویا کی بات کب طے کر رہی ہیں۔“ اس نے موضوع گفتگو تبدیل کیا۔
 ”کیا خاک طے کروں۔ عریشان نے ریجیکٹ کر دیا زویا کو۔“ ماہ پارہ پہلے ہی اس قصے کو لے کر پریشان تھیں۔
 جل گئیں۔

”ارے! لیکن کیوں اتنی توجہی ہے۔“ اسارا کو حیرانی ہوئی۔
 ”کہتا ہے میرے ٹائپ کی نہیں۔ اب عریشان کو کون سمجھائے واصفا لگ مجھ سے ناراض ہو گئی ہے۔“ ماہ پارہ نے اپنا کھڑا رویا۔
 ”دھیان رکھیں، کہیں عریشان بھی شاہ میر کی طرح کوئی چاند نہ چڑھا لے اور آپ کو حمی جیسی ایک اور کم صورت بہو گھر لانا پڑے۔“ اسارا انہیں ہوشیار خبردار کر رہی تھی۔
 ”عریشان کی پسند جانتی ہوں، وہ کم تر چیزوں کی طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔ تم تسلی رکھو۔“ ماہ پارہ کو اس سائیڈ سے اطمینان تھا۔
 ”دیکھ لیں۔ مجھے تو اس کے انکار کی کوئی وجہ لگ رہی ہے۔“ اسارا کے تنبیہی لہجے پر ماہ پارہ بھی چونک گئیں۔
 اس طرف تو ان کا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔
 ”تم تو مجھے بھی ہولارہی ہو۔ میں کرتی ہوں فائل بات عریشان سے۔“ وہ بھی سوچ میں پڑ گئی تھیں۔ اسارا کی باتوں نے ان پر سوچ کا نیا در کھول دیا تھا۔
 ”او کے ماما، حظلہ اٹھ گیا ہے شاید آواز آرہی اس کی، پھر بات کرتی ہوں۔“ آواز پر لگا لگاتے اسارا نے اجازت چاہی۔
 ”چلو ٹھیک ہے، خیال رکھنا اپنا۔“
 ”جی اللہ حافظ!“ اسارا کی کال کٹ چکی تھی۔ صوفے سے ٹیک لگاتی ماہ پارہ پر سوچ انداز میں غیر مرئی نقطے کو گھور رہی تھیں۔

☆.....☆

”لنچ ساتھ کرتے ہیں۔ ٹائم ہے تمہارے پاس؟“ عریشان ولید کے آفس آیا ہوا تھا۔ لنچ ٹائم تھا تب ہی ولید نے خواہش ظاہر کی۔
 ”نہیں بس نکلوں گا۔“ جوس پیتے اس نے باباں بازو موڑ کر مضبوط کلائی میں بندھی ROLEX میں ٹائم دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

”ویسے آنسو کے آنے سے ایک فائدہ تو ہوا، تم آفس روز آنے لگے ہو۔“ ولید مسکراتے ہوئے اسے دیکھنے لگا۔ مسکراہٹ چھپانے کے لیے اس نے گلاس لبوں سے لگا لیا تھا۔

”گلد سائن..... جو کام میں مہینوں نہ کروا سکا وہ آنسو بھابی نے بن کئے کروا لیا۔“ وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔
 ”سدرہ جاؤ۔“ عریشان دلی نے جھپٹتے ہوئے میز پر نظر دوڑائیں کارڈز دیکھ کر اس کی نظریں ٹھٹھک گئیں۔
 ”یہ کس کے کارڈز ہیں؟“

”مجھت نہیں ہوگئی ہے اور حواس باختہ میں ہو گیا ہوں۔ شادی کے کارڈز ہیں۔“ ولید نے چونکتے ہوئے خود کو سرزنش کی۔

”کس کی شادی ہو رہی ہے؟“ وہ حیرت سے دریافت کر رہا تھا۔

”مابدولت کی۔“ کارڈ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے مسکرایا۔

”ریشمی!“ کارڈ کھول کر دیکھتے وہ بے یقینی کا شکار تھا۔ ولید جمل سا گیا۔

”تم عشق کر سکتے ہو اور میں سیدھے شرافت سے شادی بھی نہیں کر سکتا؟“ اتنا حیران کیوں میرے بھائی؟“ وہ تیکسی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”اچانک ہوا تو حیرانی ہو رہی ہے۔“

”چاچو کو ہارٹ اٹیک کیا ہوا، وہی ہو گئے ایک ہفتے میں۔ بابا اور چاچو نے سب طے کر لیا۔ میں نے مشرقی لڑکے کی طرح قبول کر لیا۔“ ولید کے چہرے سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔

”اتنے ہی تو فرماں بردار ہو تم۔ یہ بولو نا لاٹری نکل آئی۔“ عریشان دلی نے جھوٹی خفگی سے دیکھا۔ ولید ڈھٹائی سے مسکرا رہا تھا۔

”تمہارا کارڈ دینے گھر آؤں؟“ وہ استفسار کر رہا تھا۔

”میں نے اپنا کارڈ لے لیا۔ FORMALITY کی ضرورت نہیں ہے ڈیئر۔ ہاں میرے لائق کوئی کام ہو تو حاضر ہوں۔“ وہ ایسا ہی تھا۔ ولید کو خبر تھی وہ ادوروں سے بے حد مختلف تھا۔

”بس آپ اتنا کیچھے گا شادی کی تقریبات میں شامل ہو جائیے گا۔“

”کوشش پوری ہوگی۔“ اس نے جیسے یقین دلایا۔

”آنسو بھی آئے گی؟“ ولید نے شرارت سے اسے دیکھا۔

”پھر تو پکا!“ اس نے جاندار مسکراہٹ سے کہا۔ ولید اسے مصنوعی خفگی سے گھورنے لگا۔

☆.....☆

ہاجرہ سلائی مشین پر جھکی سلائی میں جتی ہوئی تھیں۔ قدوس صاحب بے زاری سے کروٹ بدل رہے تھے۔

”بند کرو اس منحوس مشین کو۔ اس کی آواز نے سر میں درد کر دیا ہے۔“ وہ اٹھتے ہوئے چڑکے دھاڑے تھے۔

”بس تھوڑی سی سلائی رہ گئی ہے تھوڑی دیر میں زینت آجائے گی سوٹ لینے ارجنٹ ہے۔“ مشین کی رفتار

آہستہ کرتے ہاجرہ نے دھیمے لہجے میں کہا۔

”بند کر دے ورنہ دو ٹکڑے کر دوں گا اس مشین کے۔ دوپل آرام کرنے نہیں دے رہی۔“ قدوس صاحب

آگ بگولہ ہو گئے اپنی بات رائیگاں جاتے دیکھ کر۔

”کہاں جا کے کروں سلائی۔ صحن میں دھوپ بھری پڑی ہے۔ کہا بھی ہے تھوڑا برداشت کر لو۔“ ہاجرہ بھی چڑ

کے بولیں۔

”اپنی بیٹیوں کے کمرے میں جا کے کر سلائی۔ اٹھا یہاں سے۔“ وہ غصے سے گھور رہے تھے۔
”روبی سوئی اسکول سے آ کر سو رہی ہیں۔ بچیوں کی نیند خراب ہوگی۔ رات بھر لائٹ نہیں تھی۔ بچیاں گرم سے بلبلارہی ہیں کمرے میں۔ چھت پر سونے کی اجازت جو نہیں آپ کی پھر صبح اسکول چلی گئیں۔ اب دو گھڑی سکون سے سو رہی ہیں تو سونے دو۔ تم تو جاگ رہے ہو۔“ ہاجرہ متا سے مجبور تھیں۔
”بیٹیوں کے سکون کی بڑی فکر ہے۔ میں انسان نہیں ہوں؟ میں نے بھی رات گرم کمرے میں گزاری ہے۔“
وہ یاد دلانے لگے۔ ہاجرہ کو غصہ تو بہت آیا مگر ضبط کر گئیں۔

”آپ کی تکلیف خود ساختہ ہے۔ چھت کی سہولت ہونے کے باوجود گرم کمرے میں خود سوتے ہیں اور بچیوں کو بھی سونے پر مجبور کرتے ہیں۔ کھلی ہوا میں بندہ سکون سے سو تو سکتا ہے۔ رات رات بھر تو لائٹ نہیں ہوتی یہاں۔“ قدوس صاحب کے غم پر وہ پہلے ہی بھری بیٹھی ہوئی تھیں۔ مگر نظر انداز کر کے صبر کرتی تھیں کہ جھکڑا نہ ہو مگر قدوس صاحب موقع ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے تھے۔

”تم جیسی بے وقوف عورت کو ہزار دفعہ سمجھا چکا ہوں جو ان بچیاں کھلی چھت پر سوئیں مجھے گوارا نہیں آس پاس کون کیسا ہے کیا تو سب کی گواہی دے گی۔“ وہ امی پر چڑھ دوڑے۔

”ساتھ والی چھت تو سعدیہ کی ہے۔ اس طرف سے تو آپ مطمئن رہیں کہ اس کے گھر جو ان لڑکے نہیں۔“ ہاجرہ انہیں سمجھانے کی سعی کر رہی تھیں مگر قدوس صاحب ہی کیا جو سمجھ جاتے۔
”باقی بیٹیوں ساٹ تیرے چاچا، ماما، خالو بستے ہیں نا؟“ وہ بری طرح گھور رہے تھے۔ ہاجرہ تھک سی گئیں۔

بات کہاں سے کہاں جانکلی تھی۔

”کیا ہو گیا درخشاں کے ابا، کیوں بلا وجہ بات کا بیٹنگز بنا رہے ہو۔ دو پیسوں کے لیے ہی کمر، گردن ایک کر رہی ہوں نا۔ تم تو سارا دن گھر میں بڑے ہو، نوکری کیا چھوٹی تم نے تو بھولے پھٹکے نوکری ڈھونڈنے کی کوشش ہی نہیں کی۔“ وہ خود بھری بیٹھی تھیں ان کی موجودگی سے ویسے ہی گھر میں فساد ہوتا رہتا تھا۔ بچیاں الگ ان کے نشانے پر ہوتی تھیں زبان کو آرام جو نہیں تھا۔

”تو ڈھونڈ کر لا دے نوکری۔ بہت کھل رہا ہے میرا امت کی روٹی توڑنا۔“

بچیاں بڑی ہو گئی تھیں تب ہی وہ صرف لفظوں اور نظروں سے کام چلاتے تھے ورنہ دل تو ان کا اب بھی چاہ رہا تھا ہاجرہ کی ہڈیوں کا سرمہ بنا دپس مگر اب انہیں نصیحت ہو گئی تھی۔ ہاجرہ کی مار لگاتے جب وہ بیٹیوں ماں کو بچانے کو آئیں تھیں تو ان کے ٹھڈے بھی انہیں پیچھے پٹنے پر مجبور نہ کر سکے۔ وہ بیٹیوں ہاجرہ کی ڈھال بنی مار کھاتی رہی تھیں۔

درخشاں دور سے یہ نظارہ دیکھتی رہی تھی۔ وہ خود ہی تھک کر پیچھے ہٹ گئے تھے۔ تب سے ہاجرہ کی زبان بھی زیادہ کھلنے لگی تھی۔ مگر وہ غلط تھی نہیں بولتی تھیں لیکن قدوس صاحب کو گوارا کب تھا کہ ان کی سلطنت میں کوئی کچھ بولے۔

”جو لوگ نوکری کر رہے ہیں سب کو ان کی بیویوں نے نوکری ڈھونڈ کر دی ہے۔ ابھی تو شکر ہے روشنی کی نوکری لگ گئی۔ آدھی سے زیادہ خواہ کرایہ، راشن اور ادھار میں ختم ہوگئی۔ چوتین چار ہزار بچے ہیں اس میں پورا مہینہ گھر کیسے چلانا ہے یہ میں ہی جانتی ہوں۔“ وہ افسوس سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔

”بھڑا میں جاؤ تم لوگ۔ ہر وقت پیسے کا رونا۔ آنا نہیں ہے، چینی ختم۔ یہ ہی باتیں ہیں اس گھر میں۔ میں ہی گھر سے چلا جاتا ہوں۔“ قدوس صاحب تن فن کرتے چپل اڑس کر کمرے سے نکل گئے۔

”بے ضمیر بے حس شخص نے بھی کسی کی تکلیف کا احساس نہیں کیا۔“ ہاجرہ دکھ و افسوس سے بڑبڑاتے متشین کی رفتار تیز کر گئی تھیں۔



”ANY PROBLEM.“ ”آؤ نور اپنے کام میں منہمک تھی ولید کے روم سے نکلنے عرشان کی نظر بے اختیار اس پر پڑی تھیں۔ وہ چہرے پر ابجھن لیے سسٹم پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ وہ بے ساختہ کھینچتا چلا آیا تھا اور بے ساختہ سوال کر گیا۔

”NO SIR!“ وہ چونک گئی تھی۔ ہمیشہ کی طرح وہ WELL DRESSED اپنی وجاہت کے ساتھ موجود تھا۔ وہ ایک ٹائیپ کو بول کھلا گئی۔

”DON'T CALL ME SIR!“ جب سے ہاتھ نکالتے اس نے انگلی اٹھا کر وارن کیا۔

”مجبوری ہے۔ میں کوئی اسکینڈل افورڈ نہیں کر سکتی۔ آفس میں اور بھی لوگ ہیں۔“

”ابھی یہاں میرے اور تمہارے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ میرا نام لیا کرو۔ تم جب میرا نام لیتی ہو تو مجھے بہت خوش ہوتی ہے۔“

بظاہر دیکھ کر کوئی عرشان ولی کی پرسنالٹی پر کمٹ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اتنا رومٹک بھی ہو سکتا ہے۔ وہ سر جھکا گئی تھی۔ اس کی نظریں اسی پر گڑی تھیں اور وہ ان کا سامنا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھی۔

”آپ پلیز چائیں۔ شازیہ آنے والی ہوگی۔“ وہ ارد گرد نظر دوڑاتی متشکر لہجے میں بولی۔

”آنے دو۔“ وہ نڈر تھا۔

”ڈر لگتا ہے بدنام ہونے سے؟ وہ کیا ہے نا کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے بدنام جو ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا لو پھر سے مصرعے۔ تم مجھے شاعر بنا کر چھوڑو گی۔“ اس کا انداز بیان بہت دلچسپ ہوتا تھا۔ وہ ارد گرد سے غافل ہو کر خوش رنگ وادی میں جا پہنچی تھی لیکن ایک واقعے نے اسے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔

”آپ کی پوزیشن مجھ سے کہیں زیادہ STRONG ہے۔ آپ کا اسٹینس، آپ کو ڈر نہیں لگتا کہ آپ کے آفس کے لوگ ایک معمولی ریسیپنٹ سے آپ کا نام جوڑیں گے۔“ وہ خود بھی اسی ابجھن میں تھی۔ عرشان ولی جیسے بندے سے وہ فلرٹ کی امید نہیں رکھتی تھی۔ لیکن کہیں نہ کوہ ڈری ہوئی تھی۔

”نہیں کیونکہ تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔“ اس کی آنکھوں میں بغور دیکھتے وہ دھیرے سے بولا تھا۔ ”آؤ نور کئی ٹائیپ اسے دیکھتی رہی۔

”یہ خواب ہے تو میں دعا کروں گی کبھی نہ ٹوٹے۔“ عرشان ولی کے چہرے پر پھیلی سچائی نے اس کے شکوک و شبہات کو چھینے پر مجبور کر دیا۔

”بہت جلد، یہ خواب حقیقت کا روپ دھار لے گا۔ TRUST ME!“ وہ نگاہوں میں محبت بھرے اس کے آنچل سے یقین باندھ رہا تھا۔

”آپ کے لفظوں سے ہی میں نے اپنی ایک الگ دنیا بسالی ہے۔ ڈر ہے کھونہ جاؤں۔“ اس کے لہجے میں ڈر بھی دبا ہوا تھا۔

”میں تمہیں کھونے نہیں دوں گا۔“ اس کے لہجے میں یقین تھا۔ وہ بے ساختہ اسے دیکھنے لگی تھی۔



”یہ کیا حالت بنا رکھی ہے زویا۔ رنگ دیکھ لیتا۔“ واصفہ ماہ پارہ کی کال ریسی نہیں کر رہی تھیں۔ وہ ناراض ہو گئی تھیں۔ ماہ پارہ ان کے گھر چلی آئی تھیں۔ زویا بھی اپنے کمرے سے نکل آئی تھی۔ تینوں لاؤنج میں براجمان تھیں۔ ماہ پارہ کو زویا بہت آزرده لگی تھی۔

”ٹھیک ہوں آنٹی۔“ وہ نروٹھے انداز سے مسکرائی تھی۔

”کیا لوگ کافی یا جوس؟“ واصفہ مہمان نوازی بن جا رہی تھیں۔

”کچھ بھی نہیں، میں تو صرف اپنی زویا سے ملنے آئی ہوں۔ تم نے ملنا کیوں چھوڑ دیا زویا۔“ ماہ پارہ لگاوٹ

سے گلہ کر رہی تھیں۔

”کیا کروں آنٹی آکے۔“ عثمان نے میری بہت انسلٹ کی ہے۔“ زویا نے غصے سے کہا۔

”تم لوگ فریڈ ہو، ایک دوسرے کو سمجھتے ہو۔“ ماہ پارہ اسے منانا چاہ رہی تھیں۔

”یہ بات عثمان کو سوچنی چاہیے۔ وہ نہ جانے کس کی آس میں مجھے ریجنکٹ کر رہا ہے۔ صاف کہہ دیا کوئی

رابطہ نہ رکھوں۔“ زویا کا منہ بڑا ہوا تھا۔ انداز میں ناگواری تھی۔

”تم فکر نہ کرو۔ جلد ہی تھک کر تم تک ہی آئے گا۔ ماہ پارہ نے آس دلائی۔

”مجھے تو نہیں لگتا۔ یہ طفل تسلیاں نہ ہوں۔“ واصفہ نے ناگواری سے کہا۔

”واصفہ تم ناحق مجھ سے خفا ہو۔ یقیناً جانو میری برسوں کی خواہش ہے زویا، عثمان کی دلہن بنے۔“ ماہ پارہ

ان کی خفگی دور کرنا چاہ رہی تھیں۔

”لیکن ایسا ہوتا نظر تو نہیں آ رہا۔“ واصفہ نے شیکھے لہجے میں چوٹ کی۔ ماہ پارہ کو ان کا لب و لہجہ چبھ رہا تھا لیکن

وہ خود کو کنٹرول کر رہی تھیں۔

”تم لالچ چھوٹا نہ کرو۔ میں فرہاد سے بات کرتی ہوں۔ وہی عثمان کو سمجھائیں گے۔“ ماہ پارہ اپنی بات پر بضد

تھیں۔

”تم اپنی ہر خواہش پوری کر لو۔“ واصفہ نے جل کے کہا۔ ماہ پارہ چپ ہی رہ گئی تھیں۔

☆.....☆

”گرلز، یہ میری شادی کا کارڈ ہے اور آپ لوگوں نے لازماً آنا ہے۔“ ولید کارڈز ہاتھ میں لیے ان کے کاؤنٹر

تک آیا۔ کارڈ باری باری دونوں کو دکھایا تھا۔

”مبارک ہو سر!“ شازیہ نے خوش دلی سے مبارک باد دی۔ آنسو ر خاموشی سے کارڈ کو دیکھ رہی تھی۔

”آپ وٹن نہیں کریں گی؟“ ولید، آنسو ر کو شرارت سے دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”بہت مبارک ہو۔“ اس کی نظروں سے گھبرائی وہ جلدی سے بولی۔

ولید مسکرا دیا۔ وہ اسے اب عثمان ولی کی نسبت سے ہی دیکھتا تھا۔ ایپلاز کے ناتے وہ پہلے بھی عزت کرتا تھا

اب اس میں اضافہ ہو گیا تھا۔

”آفس کے تقریباً تمام لوگ آئیں گے اور ایک اینڈ ڈراپ کا الیٹو ہو تو آپ لوگ آرام سے کہہ سکتی ہیں۔“

”اوکے سر!“ شازیہ کو یک اینڈ ڈراپ کا سن کر تسلی ہوئی۔ ورنہ شرکت مشکوک تھی۔

”میری غیر موجودگی میں عثمان ولی آفس کو دیکھیں گے۔ آپ لوگوں کو کوئی بھی پرابلم نہیں ہوگی۔“ آنسو ر پہلو

بدل کر بے ساختہ سر جھکا گئی تھی۔

”کوئی پرابلم مس آنسور؟“ ولید نے چھیڑتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں..... نہیں سر۔ آپ دونوں ہمارے لیے قابل محترم ہیں۔“

وہ گھبراتے ہوئے جلدی سے بولی تھی۔ اسے ولید کے انداز پر بے حد شرم محسوس ہو رہی تھی۔ اسی اثناء میں بیون ریڈ پھولوں کا بکے لیے داخل ہوا۔ سب کی نظریں پھولوں پر تھیں۔

”سر یہ مس آنسور کے لیے بھیجا گیا ہے۔“ بیون نے دانت دکھاتے ہوئے کہا۔

”آہم.....!“ ولید کو بے ساختہ کھاسی شروع ہو گئی۔ آنسور الگ شٹنا گئی۔ دونوں ہی جان گئے تھے یہ عریشان ولی کی کیوٹی حرکت ہے۔

”تو دے دو انہیں۔“ ولید، بیون سے کہتا شرارتی نظروں سے آنسور کو دیکھتا پلٹ گیا تھا۔ بیون، آنسور کو بڑا سا بکے تھما کر چلا گیا۔

”آج تمہاری برتھ ڈے ہے؟“ شاز یہ حیرانی سے پھولوں کو دیکھتی استفسار کر رہی تھی۔ آنسور پھولوں کو دیکھتی نفی میں سر ہلا رہی تھی۔

”نام بھی کوئی نہیں اس میں، بھر بھیجا کس نے ہے؟“ شاز یہ تھیرے بکے کو دیکھ رہی تھی۔

”معلوم نہیں!“ آنسور اپنے تاثرات چھپا کے بکے کو سامنے رکھ گئی تھی۔ گاہے بگاہے اس کی نظریں پھولوں پر پڑ رہی تھیں۔ عریشان ولی کا تصور اسے مسکراتے پر مجبور کر رہا تھا۔

☆.....☆

عریشان ولی اپنی کارڈ رائیو کر رہا تھا۔ ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ سنبھال کر وہ سیل فون سے نمبر ڈائل کر کے بلیو ٹوٹھ آن کر گیا تھا۔ آنسور کا آف ہو چکا تھا وہ کارڈور سے نکل رہی تھی۔ شوڈر پر بیگ لٹکا ہوا تھا جس کا اسٹریپ اس نے ہاتھ سے پکڑا ہوا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں سیل فون اور بکے تھا۔ وہ آفس کے Exit کی طرف چل رہی تھی۔ جب اس کے نمبر پر عریشان ولی کی کال آنے لگی۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”السلام علیکم!“ اس نے کال Pick کر کے سیل فون کان سے لگا لیا۔

”علیکم السلام! جیتی رہو خوش رہو۔ میرے ساتھ۔“ اس کا موڈ بہت خوشگوار تھا۔

”بکے بزنس میں ہیں دعا بھی اپنے مطلب کی دی ہے۔“ وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

”اچھا کہاں ہوا بھی؟“ وہ محظوظ ہوتے ہوئے استفسار کر رہا تھا۔

”وین کی طرف جا رہی ہوں۔“

”میں ڈراپ کر دوں؟“ وہ کچھ بل ساتھ بتانے کا خواہش مند نظر آ رہا تھا۔

”نہیں کسی نے دیکھ لیا تو بلا وجہ ایسٹوین جانے گا میرے لیے۔“ وہ سچائی سے آگاہ کر گئی۔

”اوکے!“ اس نے اصرار نہیں کیا وہ اس کے انداز کی وجہ سمجھ گیا تھا۔

”بکے کی کیا ضرورت تھی۔“ بکے پر ایک نظر ڈالتے اس کے منہ سے نکل گیا۔

”پھولوں پر نظر پڑی تو تمہارا خیال آیا۔ اس لیے پھولوں کو پھولوں کے پاس بھیج دیا۔ برا لگا؟“ دھیسے لہجے

میں کہتے آخر میں استفسار کیا۔ آنسور اس کے لہجے کی تنبیہ تاکہ آگے کچھ بول نہ سکی۔

”نہیں لیکن شاز یہ بہت پریشان رہی سارا وقت۔ پوچھ پوچھ کے تھک گئی اور اوپر سے سر ولید آپ کا نام لے لے کر چھیڑتے ہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے اپنی پریشانی بتائی۔ عریشان ولی کا قبضہ بے ساختہ تھا۔ ”کہو تو

دونوں کو دیوار میں چنوا دوں؟“

اس کے شرارتی انداز پر آنسو کی ہنسی بے ساختہ تھی۔
 ”تو بے! اچھا میں دین تک پہنچ گئی ہوں پھر بات ہوگی۔“ دین میں بیٹھنے سے قبل وہ رک گئی۔ دین میں اور بھی لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں وہ کوئی اسکینڈل نہیں بنانا چاہتی تھی۔
 ”اوکے۔“ خیال رکھنا چاہتا۔“ عریشان ولی نے سر جھٹک کر کال بند کر دی تھی۔ آنسو کو ایک دم سے اپنا وجود بہت معتبر لگا کوئی اس کے لیے فکر مند تھا۔ یہ احساس ہی بہت خوش کن تھا۔



”کب تک آرہے ہیں آپ؟“ ماہ پارہ فرہاد صاحب سے کال پر استفسار کر رہی تھیں۔
 ”نیکسٹ منٹھ۔ کیوں خیریت ہے؟“ فرہاد صاحب سے وہ کئی بار استفسار کر چکی تھیں جس پر انہیں چونکنا پڑا۔
 ”مجھے عریشان کے سلسلے میں آپ سے بات کرنی تھی۔“ جمنی کسی کام سے گزر رہی تھی چلتے چلتے لفظ اس کے کان میں پڑے تو اس کے قدم ٹھٹھک گئے۔
 ”کیوں اسے کیا ہوا۔ تھوڑی دیر پہلے ہی اس کی کال آئی تھی۔ بات ہوئی ہے میری۔“ فرہاد صاحب چونک گئے کہ انہیں کس سلسلے میں بات کرنی ہے۔
 ”آپ اسے سمجھائیں۔“ ماہ پارہ کا ہجر بے زاری لیے تھا۔
 ”ماشاء اللہ آل ریڈی بہت سمجھ دار اور ذمہ دار ہے اب اور کیا سمجھانا ہے اسے؟“ انہیں سمجھ نہیں آرہی تھی۔
 ”ایک تو آپ بھی پوری بات نہیں سنتے۔“ وہ چڑ گئیں۔
 ”اوکے نہیں بولتا اب۔“ حکم کریں بیگم۔“ فرہاد صاحب نے شرارت سے کہا۔
 ”میں عریشان کی شادی کرنا چاہ رہی ہوں لیکن عریشان اس موضوع کی طرف آتا ہی نہیں۔“ ماہ پارہ نے اپنا کھڑا رویا۔
 ”تمہاری نظر میں کوئی لڑکی ہے؟“ فرہاد صاحب کی آواز پرسوج تھی۔
 ”ہاں اپنی زویا، بچپن سے آتا جاتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو انڈر اسٹینڈ کرتے ہیں۔“ ماہ پارہ نئے سرے سے مقدمہ پیش کر رہی تھیں۔
 ”لیکن عریشان تو زویا کو انکار کر چکا ہے۔ اس نے بتایا ہے مجھے۔“ ماہ پارہ کو حیرانی ہوئی کہ فرہاد صاحب اس حقیقت سے آگاہ ہیں۔

”ہاں یہ ہی تو رویا ہے۔ میں چاہتی ہوں آپ اسے زویا کے لیے منائیں۔“ ماہ پارہ ہر حال میں عریشان کو زویا کے لیے منانا چاہ رہی تھیں۔
 ”کیا بچوں جیسی باتیں کر رہی ہو ماہ پارہ، عریشان کوئی دودھ پیتا بچہ ہے۔ لائف پارٹنر کے لیے اس کی کوئی آئیڈیل ہوگی۔ زویا اسے پسند نہیں ہے۔“ فرہاد صاحب کو ان کی بات بے سرو پا لگی۔
 ”آپ بھی اس کی سائیڈ لے رہے ہیں۔“ ماہ پارہ کا منہ بن گیا۔
 ”سائیڈ نہیں لے رہا۔ تمہیں حقیقت بتا رہا ہوں۔“ وہ مصر تھے۔
 ”لیکن میری شدید خواہش ہے زویا ہی اس گھر کی بہو بنے۔“ ماہ پارہ کسی طور اپنے مطالبے سے پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھیں۔

”تم عریشان کو مجبور نہیں کر سکتیں۔ وہ کبھی ناپسندیدہ چیزیں نہیں اپناتا۔ مجھے اپنے بیٹے کا مزاج پتا ہے۔“ فرہاد

صاحب اچھی طرح اس کی عادات سے واقف تھے۔ واقف تو ماہ پارہ بھی تھیں مگر ضد پراڑی ہوئی تھیں۔
 ”کرتی ہوں اس سے بات۔ دیکھتی ہوں کیسے انکار کرتا ہے۔“ وہ چڑ کے ہٹ دھرمی سے کہہ رہی تھیں۔
 ”کرلو شوق پورا۔“ فرہاد صاحب کو خبر بھی انہیں سمجھنا دنیا کا مشکل ترین عمل ہے تب ہی ہاتھ جھاڑ لیے کہ
 عریشان ولی کے مزاج سے بھی واقف تھے وہ کبھی کسی کی پسند نہیں اپناتا تھا۔
 ”ایسا کیا کروں کہ عریشان زویا کے لیے مان جائے۔ اس غم میں کیسی کملائی گئی ہے زویا۔“
 کال ڈسکنکٹ کر کے ماہ پارہ پر سوچ تاثرات سے بڑبڑا رہی تھیں۔

☆.....☆

سونی صبح کے لیے اسکول یونیفارم استری کر رہی تھی۔ روبی، ولید کی شادی کا کارڈ لیے بیٹھی تھی۔ آنسو رگید
 ہاتھ دوپٹے سے خشک کرتی داخل ہوئی۔

”دھل گئے برتن؟“ سونی نے اس کے پسینے سے ترچرے کو دکھتے ہوئے استفسار کیا۔
 ”ہاں بچن بھی سیٹ لیا۔ سنڈے کو بچن کی اچھی طرح صفائی کروں گی۔ کیبنٹ وغیرہ گندے ہو رہے
 ہیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے پلنگ پر بیٹھ گئی تھی۔

”ایک دن ملتا ہے آرام کا۔ اس میں بھی تم کام ڈھونڈ نکالتی ہو، آفرین ہے تم پر۔“ اسے کپڑے بھی دے دو صبح
 کے لیے استری کر دیتی ہوں۔“ سونی کے آفر کرنے پر آنسو سر ہلاتی الماری کی طرف بڑھی۔
 ”بہت شکریہ، بالکل ہمت نہیں تھی استری کی۔“ وہ خوش ہو گئی تھی۔

”آپنی کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ کے پاس سے آپ کی شادی ہو جاتی۔“ روبی سوچتی ہوئی کہہ رہی تھی۔ آنسو
 کپڑے نکالتی حیرت سے پلٹی۔
 ”یہ خیال کیونکر آیا تمہیں؟“ کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آ گئی تھی۔

”میں نے درخشاں باجی سے چوری ان کے رسالے سے کتنی ہی کہانیاں پڑھی تھیں۔ اس میں تو پاس سے
 لڑکی کی شادی ہو جاتی ہے۔“ روبی پر جوش ہو گئی تھی۔

”آپ کی بھی ولید سر سے ہو جاتی تو کتنا اچھا ہوتا؟“ روبی افسوس بھرے انداز سے تاکید چاہ رہی تھی۔
 ”سر ولید بہت اچھے ہیں۔ بالکل بھائیوں جیسے ایسی فضول باتیں مت سوچو۔“ وہ کپڑے نکال کر الماری
 میں بند کر کے سونی کو کپڑے تھمانے لگی۔
 ”پھر بھی ہو جاتی تو کتنا اچھا ہوتا۔“ وہ افسردہ تھی۔

”ویسے ہمارے آفس میں دو باس ہیں اور ایک تو ابھی کنوارے ہیں۔“ اس کا غم غلط کرنے کے لیے اس نے
 شرارت سے کہا۔ عریشان ولی چہم سے تصور کے پردوں میں آ گیا۔

”اچھا کیسے ہیں؟ ہینڈ سمس..... ویل ابجو کیٹ..... ناول کے ہیرو کی طرح نا؟“ روبی دوبارہ سے پر جوش ہو
 گئی۔ اس کے انداز پر آنسو کو اس یونانی دیوتا کی شان میں کہنے کے لیے لفظ ڈھونڈنے سے بھی نہ ملے۔

”اس سے بھی کہیں زیادہ دیکھ لینا۔“ اس کے منہ سے بے اختیاری میں نکل گیا۔
 ”دیکھ لینا، مطلب؟ کیا وہ ہمارے گھر آ رہے ہیں؟“ ان دونوں کی گفتگو سنی سونی کپڑے استری کرنے کے
 ساتھ ان کی طرف بھی متوجہ تھی۔ وہ حیرت سے آنسو کو دیکھ رہی تھی۔ اپنی بے اختیاری پر وہ سر پیٹ کے رہ گئی۔

”میرا مطلب ہے کسی تقریب وغیرہ میں۔ ابھی سر ولید کی شادی میں آئیں گے نا؟“ اس نے سنہیلے ہوئے

بات بنائی۔ دونوں سر ہلانے لگیں۔
 ”ہوش کے ناخن میں آنسو رچی! صرف عریشان وہی نہیں، آپ بھی ۱۰۱۰ بات دہری ہیں محبت کے دریا میں
 سفر کرتے ہوئے۔“ اس نے دل ہی دل میں خود کو سرزنش کی۔
 ”تم کو رس کی کتابیں چھوڑ کر ناولز پڑھ رہی ہو۔ کرنی ہوں بچہ سے نکالت۔“ سونی نے روبی کی خبر لی۔
 ”ایک ہی ناول پڑھا تھا۔“ روبی منمنانے لگی۔ اس کے بہانے پر آنسو مسکرا دی۔
 ”یہ سوٹ پہن کر جاؤ گی آفس۔ دھل دھل کر ریگ کتنا پھیکا پڑ گیا ہے۔“ یونیفارم سے فری ہو کر سونی ناقدا نہ
 نظروں سے آنسو کے پرانے سے سوٹ کو دیکھ رہی تھی۔
 ”ٹھیک تو ہیں۔ میرے پاس زیادہ کپڑے نہیں ہیں۔“ اس نے لا چاری ظاہر کی۔
 ”میرا پنک والا سوٹ پہن لو۔ رکو میں ویسی استری کر دیتی ہوں۔“ سونی اپنا سوٹ نکالنے الماری کی طرف
 بڑھی اور اس کا سوٹ واپس الماری میں رکھ دیا۔

”ٹھیک تو تھا وہ سوٹ۔“
 ”کوئی نہیں ڈھنگ سے تیار ہو کر آفس جایا کرو۔ آخر کو اک باس کنوارا بھی ہے، کیوں روبی۔“ سونی نے
 شرارتی مسکان سے کہتے روبی کو ہمنوا کیا۔
 ”اور نہیں تو کیا!“ روبی نے بھی جھٹ ہاں میں ہاں ملائی۔ آنسو بے ساختہ ہنس پڑی تھی۔

☆.....☆

آج ولید کی مایوں تھی۔ لان روشنیوں سے جگمگا رہا تھا عورتیں ٹولیوں کی شکل میں براجمان تھے۔ لڑکیاں لڈی
 ڈال رہی تھیں۔ بچے بچیاں دوڑنے میں مصروف تھے۔ آنسو، شازیہ کے ساتھ داخل ہوئی تھی۔ ولید کا بگلہ دیکھ کر
 دونوں مرعوب ہوئی تھیں۔ اندازہ تو تھا مگر آنکھیں خیرہ ہو گئی تھیں۔ ہائی کلاس کی خواتین فیشن کے نام پر بغیر
 آستینوں والی شرٹس اور دوپٹے سے بے نیاز بے فکری سے قہقہے لگا رہی تھیں۔
 ”شازیہ! یہاں کا تو رنگ ہی الگ ہے۔ کہیں ہم نے آکر غلطی تو نہیں کر دی؟“ وہ گھبراتے ہوئے شازیہ کے
 کان میں منمناتی تھی۔

”ارے نہیں CONFIDANCE لو ز نہ کرو، تم بہت اچھی لگ رہی ہو اور وہ سامنے دیکھو وہ حضرت
 صرف تمہیں ہی دیکھ رہے ہیں۔“ شازیہ نے قدرے دور کھڑے ایک شخص کی طرف اشارہ کیا جو ان پر ہی
 نظرس جمائے کھڑا تھا۔
 ”کہیں اور چلو!“ اس شخص کو ناگواری سے دیکھتے ہوئے وہ آگے بڑھ گئی تھی۔ ولید لوگوں سے ملتا ان تک آیا تھا۔
 ”خیریت سے ہیں آپ لوگ۔ آنے میں تکلیف تو نہیں ہوئی نا!“ وہ انہایت سے پوچھ رہا تھا۔
 ”نوسر!“ شازیہ ہی اس کے حصے کا جواب بھی اکثر دے دیا کرتی تھی۔ ولید کے سامنے وہ تھوڑی کانٹش ہو
 جاتی تھی۔ یہ سوچ کر کہ وہ حقیقت سے آگاہ ہے۔

”گڈ!“ آپ لوگ کچھ لیں۔ پلیز ویئر۔“ ولید نے ویٹر کو آواز دی وہ جس کی ٹرے لیے چلا آیا۔
 ”کسی چیز کی ضرورت نہ ہو تو بتائیے گا۔“ ولید مہمان نوازی نبھا رہا تھا۔
 ”آپ ٹینشن نہ لیں سر، آپ کی مایوں ہے۔ انجوائے کریں۔“ شازیہ کے خوش دل سے کہنے پر وہ مسکراتا ہوا
 پلٹ گیا تھا۔ آنسو بار بار لوگوں کے جھوم میں نظر ڈال رہی تھی۔

”کسی کو ڈھونڈ رہی ہو؟“ شازیہ کو اس کی نظروں کی بے قراری محسوس ہوئی تھی۔
 ”نہیں تو!“ وہ سنبھلی اور گڑبڑا کر دوپٹا ٹھیک کرنے لگی۔ اس وقت شازیہ کے نمبر پر کال آنے لگی تھی۔ اس نے کال پک کی مگر ساؤنڈ سسٹم کی آواز تیز ہو چکی تھی جس کی وجہ سے اسے دوسری طرف کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

”میں کال سن کے آتی ہوں۔“ شازیہ اسے اشارہ کرتی دور چلی گئی تھی۔ اسٹیج پر رسم شروع ہونے لگی تھی وہ دلچسپی سے اسٹیج کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ اسی وقت لائسنس آف ہو گئیں صرف اسٹیج پر ہلکی روشنی تھی۔ ولید اور اس کی منگیتری پر فائرنس شروع ہو گئی تھی۔ اس لمحے اس کی تھیلی کو کسی نے نرمی سے تھام لیا تھا۔ وہ بے طرح چونک کر گردن موڑ کر دیکھنے لگی تھی۔ عرفان ولی اس کے بے حد قریب اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

”بس اسی طرح تمہارا ہاتھ تھامے کھڑا رہوں اور زندگی گزر جائے۔“ دھیرے سے کہتے اس نے اس کی انگلیوں پر نرمی سے دباؤ ڈالا تھا۔ آنسوؤں کا حوالہ نہ کیا اور عرفان ولی کے لمس سے جیسے کٹی جا رہی تھی۔
 ”تم بن سنو کر کچھ اور حواس باختہ کر رہی ہو۔“ سرگوشی کرتے وہ شریر مسکراہٹ سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جھجکتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ کھینچا تھا۔

”چھوڑنے کے لیے تھوڑی نہ پکڑا ہے۔“ اس کی کنفیوژن کو انجوائے کرتے اس نے گرفت پر دباؤ بڑھایا۔
 ”شازیہ آجائے گی، کوئی دیکھ لے گا۔“ سب اسٹیج پر ہوتی پر فائرنس اور میوزک میں کھوئے ہوئے تھے۔ وہ گھبرا کر ارد گرد دیکھ رہی تھی۔

”میرے ہوتے ہوئے تمہیں کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ واقعی ایسا شجر تھا جس کے سائے میں آکر ہر خوف زائل ہو جاتا تھا۔

شازیہ تیزی سے ان کی طرف آ رہی تھی۔ آنسوؤں نے تیزی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا تھا۔

”السلام علیکم سر۔“ وہ کچھ بدحواس لگ رہی تھی۔

”والسلام! سب خیریت ہے؟“ عرفان کو وہ کچھ پریشان سی لگی۔

”نہیں سر۔“

”آنسوؤں میں جا رہی ہوں۔ ابو کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔“

آنسوؤں بھی فکر مند ہو گئی تھی۔

”زیادہ سیریس بات تو نہیں۔ میں ڈراپ کروادوں؟“ وہ انسانیت کے تاتے فکر مندی کا مظاہرہ کر گیا۔
 ”تھینکس سر، نہیں قریبی اسپتال میں ابو کو لے کر آئے ہیں۔ بھائی پک کرنے آ رہا ہے۔“ وہ بمشکل مسکرائی۔

”بی بریوشازیہ! آپ اسپتال جائیں کوئی ٹینشن والی بات ہو تو مجھے کال کر دیجیے گا۔“

”I’LL BE THERE!“ وہ اپنائیت سے گویا تھا۔

”تھینکس سر!“ شازیہ کو اس اپنائیت سے ڈھارس ہوئی۔

”اچھا آنسو!“ شازیہ اس سے ٹھٹھل رہی تھی۔ شازیہ کی آنکھوں میں غمی محسوس ہوئی تھی۔

”فکر نہ کرو۔“ انکل کو کچھ نہیں ہوگا۔“ آنسوؤں نے گرجوٹی سے ساتھ لگا کر تسلی دی۔ یہ لفظ اور یہ لمس کتنا معنی رکھتے ہیں یہ کوئی اس وقت شازیہ سے پوچھتا۔

(جاری ہے)

بیات اور

ہے، ڈاکٹر صاحب یوں پائیہ تک پہنچاتے ہیں جیسے وہ کوئی آسان کام ہو۔ کچھ لوگ مانتے ہیں کہ مرض ڈرتا ہے ڈاکٹر صاحب کے نام سے۔ لوگ عقیدہ رکھتے ہیں کہ مرض ڈاکٹر کو دیکھ کر سر پٹ بھاگ لیتے ہیں اور ایسا بھاگتا ہے کہ پھر بھی پلٹ کر نہیں آتا۔ انہیں جادوگر مان لیا گیا ہے۔ ایک ایسا جادوگر جو اپنی انگلیوں کی پوروں سے بدن کے سب سے نازک حصے سے لپٹی بیماری کو الگ کر کے وہاں شفا بھر دیتا ہے۔ ایسا ساحر جو اپنے پیٹھے لفظوں سے برسوں کے مریض کو کھلکھلا اٹھنے پر مجبو کر دیتا ہے۔ ہاں ہاں وہی ڈاکٹر ہیں یہ۔

ایک لمبی بے تماشائی لائن ہے ان کے مریضوں کی جو شفا پا چکے اور اس لائن سے دس گنا لمبی لائن ہے ان مریضوں کی جو ان سے مل کر شفا پا لینا چاہتے ہیں۔ جن کو ڈاکٹر صاحب سے ملنے کے لیے چھ چھ ماہ بعد کی تاریخ ملتی ہے۔ ایسے بھی ہیں جن کو شفا پانے کی آرزو میں موت کو گلے لگانا پڑ جاتا ہے۔ بہت ہیں ایسے بھی جو حسرت سے ڈاکٹر صاحب کے نام کو پڑھتے پڑھتے ہمیشہ کے لیے دنیا چھوڑ جاتے ہیں۔ روز کے کئی مریضوں کو دیکھنے کے بعد بھی اس لمبی لائن میں کوئی کمی نہیں آتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی صبح سے آدھی رات ان ہی اسپتالوں، آئی سی یو رومز، ملکی وغیرہ ملکی سیمینارز، لیکچرز اور دوروں میں ہو جاتی ہے۔

یہ قصہ بھی ان کے استنبول کے دورے کا ہے۔ تین دن کی کانفرنس کے لیے وہ استنبول آئے

کہتے ہیں ایک ڈاکٹر کا اپنی زندگی پر کوئی حق نہیں ہوتا۔ اپنے وقت پر بھی نہیں۔ ڈاکٹر عبدالرحمن ہاشمی کی زندگی پر ایک نظر ڈالتے ہی اس مقولے کی سچائی پر یقین آ جاتا ہے۔ ان کی روٹین، ان کا وقت اور ان کی زندگی اس بات پر مہر ثبت کر دیتی ہے کہ واقعی ایک ڈاکٹر پر سب سے زیادہ حق انسانیت کا ہوتا ہے اور ایک ڈاکٹر اپنی تئیں اسی حق کو ادا بھی کرتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی پچاس سالہ زندگی اور پچیس سالہ لمبے کیریئر میں بہت تھوڑے سے پل اپنے ہیں کہ جو صرف ان کے اپنے ہیں۔ ان کے ذاتی، اپنے یا ان کی فیملی کے ان کے اور ان کی بیوی بچوں کے۔ حالانکہ خاندان کوئی ایسا لمبا چوڑا بھی نہیں ہے۔ ایک بیٹا، دو بیٹیاں اور بیوی۔ بس یہ ہے کہ ان کی مصروفیات بے تماشائی ہیں۔

اور مصروفیات بے بہا ہونے کی بھی کئی وجوہات ہیں۔ ڈاکٹر عبدالرحمن ہاشمی کی مسیحتی کا ایک زمانہ گواہ ہے ایک عالم ہے جو ان کا نام سنتے ہی ادب سے آنکھیں جھکا کر مسکراتا ہے۔ ایک جہوم ہے انسانیت کا جو ان سے صرف ایک بار ملنا چاہتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالرحمن ہاشمی نیوروسرجن ہیں۔ دماغ کی نازک سے نازک پیچیدہ سے پیچیدہ بیماری کو وہ لمحوں میں پکڑ لیتے ہیں اور ایسے ہی لمحوں میں اس مرض کا توڑ بھی جان لیتے ہیں۔ بڑے سے بڑا سرجن جس نیوروسرجری کو ہاتھ لگانے سے گھبراتا



تھے۔ 27 سے 29 رمضان المبارک کی تاریخوں میں کئی لیکچررز دیئے۔ مختلف بیماریوں کے بارے میں نیوروسرجری کے جدید طریقے وغیرہ وغیرہ۔

29 رمضان المبارک کو وہ سب دھندوں سے فارغ تھے۔ شام کے 4 بجے وہ ہال سے نکلے تھے۔ رات کے 7 بجے ان کی لاہور کے لیے فلائٹ تھی۔

”پاپا آپ نے برامس کیا تھا آپ عید کے دن میرے ساتھ ہوں گے۔“ چھوٹی بیٹی فون پر دل گرفتہ تھی۔

وہ مسکرائے۔ ”پاپا کی جان میں اپنا برامس پورا کروں گا۔ بس اڑ کر آپ تک پہنچ جاؤں گا۔“

سات بجتے میں پندرہ منٹ تھے جب وہ پلین میں اپنی سیٹ پر تھے۔ افطار ہو چکی تھی۔ عین ممکن تھا کہ آج عید کا چاند نظر آجائے۔ کل عید ممکن تھی۔ وہ بھی ٹیکسی سے ملنے کو بے تاب تھے۔

7 بجے فلائٹ روانہ ہوئی۔

7 بج کر 25 منٹ پر عملے میں کچھ غیر معمولی گڑبڑ محسوس ہوئی۔

7 بج کر 30 منٹ پر اعلان ہو گیا۔

”ہم بے حد معذرت خواہ ہیں، موسم کی خرابی کے پیش نظر فلائٹ واپس روانہ ہو رہی ہے۔“

باہر موسم واقعی تباہ کن تھا۔ بجلی کی چمک، بادلوں کی بے تحاشا گرج اور تیز آندھیاں۔

7 بج کر 35 منٹ پر دوسرا اعلان ہوا۔

”موسم کی شدت میں اضافہ ہوا ہے۔ ہمیں فوراً لینڈنگ کرنی ہوگی۔ ہم لینڈنگ کر رہے ہیں۔“

سب پریشان ہو گئے۔

ابھی آدھا گھنٹہ قبل سب ٹھیک تھا نہ کوئی پیش گوئی کہ موسم بدل سکتا ہے اور نہ ہی ایسے خراب اثرات۔

7 بج کر 45 منٹ پر ایمر جنسی لینڈنگ ہو گئی۔ کوئی جزیرہ تھا۔ پائلٹ نام تک نہیں جانتا تھا۔ روڈ پر لینڈنگ ہوئی تھی۔

باہر موسم تباہی مچانے پر تلا ہوا تھا۔

ہوا ایسے چل رہی تھی گویا درختوں کو اکھیڑا لے گی۔ دور کہیں سمندر کی لہروں کا شور سنائی دے رہا تھا۔

”یہاں نزدیکی ہوٹل میں چلتے ہیں رات گزارنی تو ہے۔“

وہاں موجود مسافروں میں سے کوئی اس علاقے سے واقف تھا۔ ایک ٹیکسی لے کر ڈاکٹر صاحب بھی ہوٹل کی تلاش میں نکلے۔ بیٹھے ہی سیل چیک کیا۔

سات بجپس پر بیٹی کا ایس ایم ایس آیا تھا۔

”عید مبارک!“

ڈاکٹر صاحب نے لمبی سانس بھری گویا چاند نظر آ گیا۔

ابھی ٹیکسی بمشکل دو منٹ چلی ہوگی کہ رکنا پڑا۔

”کیا ہوا؟“

”موسم بہت خراب ہے جی۔ دو دفعہ یہ سانس روڈ پر بجلی نے زمین کو چھوا ہے آگے جانا خطرے سے خالی نہیں۔“

”کچھ نہیں ہوتا ہمت کرو۔“

انہوں نے ڈرائیور کو حوصلہ دیا۔ بمشکل ایک

منٹ ٹیکسی چلی اور ڈاکٹر صاحب نے خود دیکھا۔

کرکڑاتی بجلی نے آسمان سے زمین تک سفر کیا

اور روڈ کو چھوا۔ پاس کھڑا سوکھا درخت بھڑبھڑ جل اٹھا۔

آندھی کا ایسا مرغولا اٹھا ٹیکسی کئی قدم پیچھے چلی

آئی اور ساتھ ہی بارش شروع ہو گئی۔ بے تحاشا

طوفانی بارش۔

”میں آگے نہیں جاسکتا۔“ ڈرائیور نے ہاتھ

جوڑ دیئے۔

ڈاکٹر صاحب پریشان ہو گئے۔

”بلکہ یہاں بیٹھے رہنا ٹھیک نہیں، آئیں نیچے اتریں ہم نزدیک پناہ دیکھتے ہیں۔“
اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

وہ ڈرائیور کے ساتھ کسی پناہ گاہ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ عجیب کچا سا علاقہ تھا۔ پسماندہ سا۔ مٹی کے ٹیلے جو اس طوفانی بارش میں کچڑ کی پہاڑیاں بن چکے تھے۔ چلتے چلتے بھیگتے ہوئے وہ اس جھونپڑی نما دروازے پر جا پہنچے۔ دستک دی، صدا آئی۔ ”کون۔“

ڈاکٹر صاحب نے اپنا مدعا عرض کیا۔ کچھ دیر خاموش رہی اور دروازہ کھل گیا۔
”آ جاؤ۔“

اسی اجاڑ پسماندہ علاقے میں وہ ایسے ہی گھر کی توقع کر سکتے تھے۔ کچی چھت، کچا فرش اور کچی دیواریں۔ ایک ہی کمرہ تھا جس کی چھت ٹیک رہی تھی۔ چند ضرورت اشیاء ایک طرف بچھی چٹائی پر نو دس سیال کا بچہ سو رہا تھا۔ اسی کے پاس جائے نماز چھپی تھی۔ یوں جیسے ابھی بھی ابھی کوئی نماز پڑھ کر اٹھا ہو۔ ڈاکٹر صاحب اور ڈرائیور کو اندر لانے والی بوڑھی اماں اب ایک چارپائی بچھا چکی تھیں۔

”بیٹھیں جی۔“

”کھانا وغیرہ؟“

”نہیں جی شکریہ۔“

چند مختصر باتیں۔

اماں جائے نماز پر جا بیٹھیں۔ ڈاکٹر صاحب ادھر ادھر دیکھتے رہے جب بچہ اچانک رونے لگا سر پکڑے بے تحاشا چلاتے ہوئے۔ اماں انہیں اور بچے کو بانہوں میں بھر لیا۔ تسلیاں دیتے چپ کروانے لگیں۔ بچہ روتا رہا۔ روتا رہا، تھک کر

چپ ہو گیا اور سو گیا۔

لحے سرکتے گئے۔ کچھ گھنٹے گزرے بچہ سوتے سوتے پھر اٹھ بیٹھا۔ ویسے ہی سر پکڑے روتے ہوئے۔

”بس میرا بچہ بس، ابھی آرام آ جائے گا۔“

تسلیاں..... دلا سے..... بچہ سو گیا۔

اب باہر موسم بھی جسے غدر چا چا کر تھک چکا تھا۔ بارش رک چکی تھی۔ بجلی بھی کافی دیر سے نہیں چمکی تھی۔ تیز آندھی ہلکی سی ہوا میں بدل چکی تھی۔ ڈاکٹر صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ اجازت طلب کی۔ روایتی احتیاطی جملے بہت شکریہ آپ کی مدد کے لیے وغیرہ وغیرہ۔

دروازے پر پہنچ کر ڈاکٹر صاحب رکے اور اماں سے سوال کیا۔

”اماں جی یہ بچہ کون ہے؟ کیا ہوا ہے اسے؟“

اماں ابدیدہ ہوئیں۔

”پوتا ہے میرا۔ ماں باپ مر گئے ہیں۔ کافی دیر ہو گئی۔ بیمار ہے اپنی بساط سے بڑھ کر میں اسے اسپتالوں میں لیے پھری۔ بہت سے ڈاکٹروں کو دکھایا ہے، کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ کل ایک اسپتال گئی، بہت بڑا اسپتال، کئی ہزار فیس، وہاں کے بڑے ڈاکٹر کو سمجھ نہیں آئی بیماری کی۔ کہتے ہیں اماں یہ لا علاج ہے۔ بس ایک امید ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیا۔“

”کہتے ہیں ایک بڑے ڈاکٹر ہیں، بڑا نام ہے ان کا بڑے مریض شفیایاب ہوئے ان کے۔ انہیں دکھاؤ تو امید ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”کہاں ملیں گے؟“

”ملنا ہی تو مشکل ہے۔ بڑے مصروف ہیں۔ مریضوں کو سال سال بعد کی تاریخیں ملتی ہیں۔ ہزاروں کی فیس الگ۔ میں تو لڑکھڑا گئی۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہاں سے واپس آئی تو جائے نماز بچھا

لی۔“ اماں کی آواز بھینگے لگی۔

میں یہاں لے آیا۔
لیکن وہ یہ سب نہ کہہ سکے بس ہچکیوں سے
روتے چلے گئے۔
”کچھ بتا تو سہی بیٹا۔“ اماں بولیں۔
”میں..... میرا نام ڈاکٹر..... ڈاکٹر عبدالرحمن
ہاشمی ہے۔“ وہ ہچکیوں کے درمیان بمشکل
بولے۔

☆.....☆

نہ جانے کتنی عیدیں آئیں، گزر گئیں، کئی چاند
راتیں..... لیکن وہ اس چاند رات، اس عید کو نہ
بھول سکے۔ کئی سالوں بعد وہ پھر سے استنبول
آئے۔ اپنے لیکچر کے دوران انہوں نے یہ قصہ
پھر سے دہرایا۔

”میں اپنی زندگی میں کبھی نہیں ڈرا۔ بڑی سے
بڑی سرجری کے دوران بھی نہیں۔ میری انگلیاں
کبھی نہیں لرزیں لیکن میں تب ڈرا، تب کا پنا جب
آئی سی یو میں میرے سامنے وہ بچہ تھا۔ وہ مریض
میرے پاس اللہ نے بھیجا تھا۔ میں اسے نہ بچا سکتا
تو میں اس کے سامنے کھڑا نہ ہو پاتا۔ میں پھر بھی
جی نہ پاتا اور یہ بھی سچ ہے کہ مجھے اتنی بے تحاشا
خوشی کبھی کسی مریض کے شفا یاب ہونے سے نہیں
ہوئی جتنی اس بچے کے صحت یاب ہونے نے
دی۔“

لیکچر ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔
کسی پوچھنے والے نے پوچھا بابا جی سے۔ ”بابا
جی! کیا واقعی قسمت اٹل ہے؟ ہم ہمارے مقدر کو
بدل نہیں سکتے۔ کیا واقعی جو لکھا چاکا ہے وہی ہو
گا۔“

بابا جی مسکراتے ہوئے بولے۔ ”اگر ایسا ہوتا تو
کلام الہی دعاؤں سے بھرا نہ ہوتا۔“

☆.....☆

”میں نے کہا عرضی ڈال دوں، ڈاکٹر سے
پہلے اس اوپر والے کے دربار میں۔ اسے کہتی
ہوں کہ مولیٰ میں نہانی، مجھے کسی مسئلے پر قدرت
نہیں۔ میں تو تیری مرضی کے بغیر زبان بھی نہ ہلا
سکوں۔ مگر تو نہ چاہے تو آنکھیں نہ چھپک سکوں۔
پر تو..... تو قادر المطلق ہے۔ تو تو بادشاہ ہے۔
تیرے تو جہاں سارے ہیں۔ تیرے سامنے کسی کی
مجال سال بعد کی تاریخ دے یا دے ہی ناں۔ تو
بس اسی قادر سے کہا کہ مولیٰ اپنی قدرت سے مجھے
اسی ڈاکٹر کے دروازے پر لے جایا اسے میرے
دروازے پر لے آ۔
ہوا کے جھونکے ڈاکٹر صاحب کو ہوش میں
لائے۔“

”اماں جی نام کیا ہے ان ڈاکٹر کا۔“
اماں نے یادداشت کھنگالی۔ کچھ سوچا
اور بولیں۔ ”ڈاکٹر عبدالرحمن ہاشمی۔“
ڈاکٹر صاحب ایسے پھوٹ کر روئے کہ ایسے تو
بچے بھی نہیں روتے۔ روتے چلے گئے۔ زار زار
موسلا دھار۔ اماں پریشان۔

”کیا ہوا بیٹا؟“
ڈاکٹر صاحب بول نہ سکے۔ کہہ نہ سکے
اماں بوڑھی اماں، پیاری اماں۔ تیری دعا تیرے
لبوں سے نکلی اور لحوں سے پہلے اس کے دربار میں
پہنچ گئی۔ وہاں جا کر ادب سے ہاتھ باندھے۔ نظر
جھکا سوالی ہو گئی۔ اس دربار کے شہنشاہ نے لحوں
سے پہلے تیری دعا کو قبولیت کا چوہہ عطا کر دیا۔
تیری دعا موسلا دھار بارش، کڑکڑانی بجلی گرجتے
بادل لیے میرے سامنے آگئی۔ اس اوپر والے
نے میرے راستے موڑ دیئے اور مجھے تیرے
راستے لے آیا۔ وہ آندھی، وہ طوفان وہ سب
میرے سامنے دیوار بن گیا اور مجھے آن کی آن

مرحمتیں و نصیحتیں لکھنا

تو تیس چالیس سال تک کسی مذہبی مدرسے کی انچارج رہ چکی ہوں خیر آج کل تو زمانہ پھرست رنگی ہو گیا ہے تب کیا تھا جب آپ کی کتابوں کے ہر صفحے میں گلاب کے پھول اور بیگ سے لولیسٹر برآمد ہوتے تھے مشہور ہونے میں آپ نے ساحر لودھی اور سلٹی آغا کو بھی مات دے دی تھی۔ سونی بمباری میں پیش پیش تھی گھر میں وہ واحد بھی جو دادی سے ہر بات کی مخالفت دلیری سے کرتی تھی۔

”دیکھ سونی! میرا میٹر گھوم گیا تو تیرے سارے کس بل نکال دوں گی۔“ دادی اس کی زبان سے نکلنے والی گولہ باری کی تاب نہ لاتے ہوئے بے حد تپ چکی تھیں انہوں نے اسے جو تادیکھا جیسے دیکھ کر سونی پروفیسر کے پیچھے مین گیٹ سے باہر نکلی۔

”پتہ نہیں کون سی منوس گھڑی تھی جب یہ شہشاہ برائے نام ہمارا کرائے دار آن کھڑا ہوا اور سے چار سوئیس والا چشمہ بھی مکاری تو دیکھو کالے چشمے کی آڑ میں یہ نہیں کیا کیا دیکھنے کی خواہشات پوری ہوتی ہوں گی۔“ وہ اس کے ہمراہ چلتی ہوئی اسے کئی تمنغات سے نوازتی رہی۔ سڑک کے دونوں اطراف میں لمبے اور برف سے ڈھکے درخت کھڑے تھے فٹ پاتھ پر لگی سبز گھاس برف کی سفید چادر اوڑھ چکی تھی مری میں سردیوں میں پہلی برف باری پچھلے دو دن سے جاری تھی اب وہ دونوں سنسان سڑک پر پیدل چل رہے تھے یہاں سے ان کا گزر تقریباً روز ہوتا تھا اس کے ہمراہ چلتے ہوئے اسے تھوڑے فاصلے پر آکس کریم کی چھوٹی سی دکان دکھائی دی وہ بھاگ کر اس

اس نے ہلکے گلابی رنگ کی لپ اسٹک ہونٹوں پر بڑی مہارت سے لگائی آئینے سے پیچھے ہٹ کر بڑے اسٹاکل سے اپنا عکس دیکھا بالوں میں لگی پونی کو تھوڑا ماسٹ کیا کالج کے سفید یونیفارم کے ساتھ گرین دوپٹہ کندھوں کے گرد پھیلا یا اور ایک چھوٹا بیگ لٹکایا پھر آخری دفعہ سرسری سی نگاہ ڈال کر خود کو آئینے میں دیکھا۔

”بھئی کالج کا پہلا دن ہے ذرا ہٹ کے لگنا چاہئے۔“ وہ منہ میں بڑبڑاتی۔

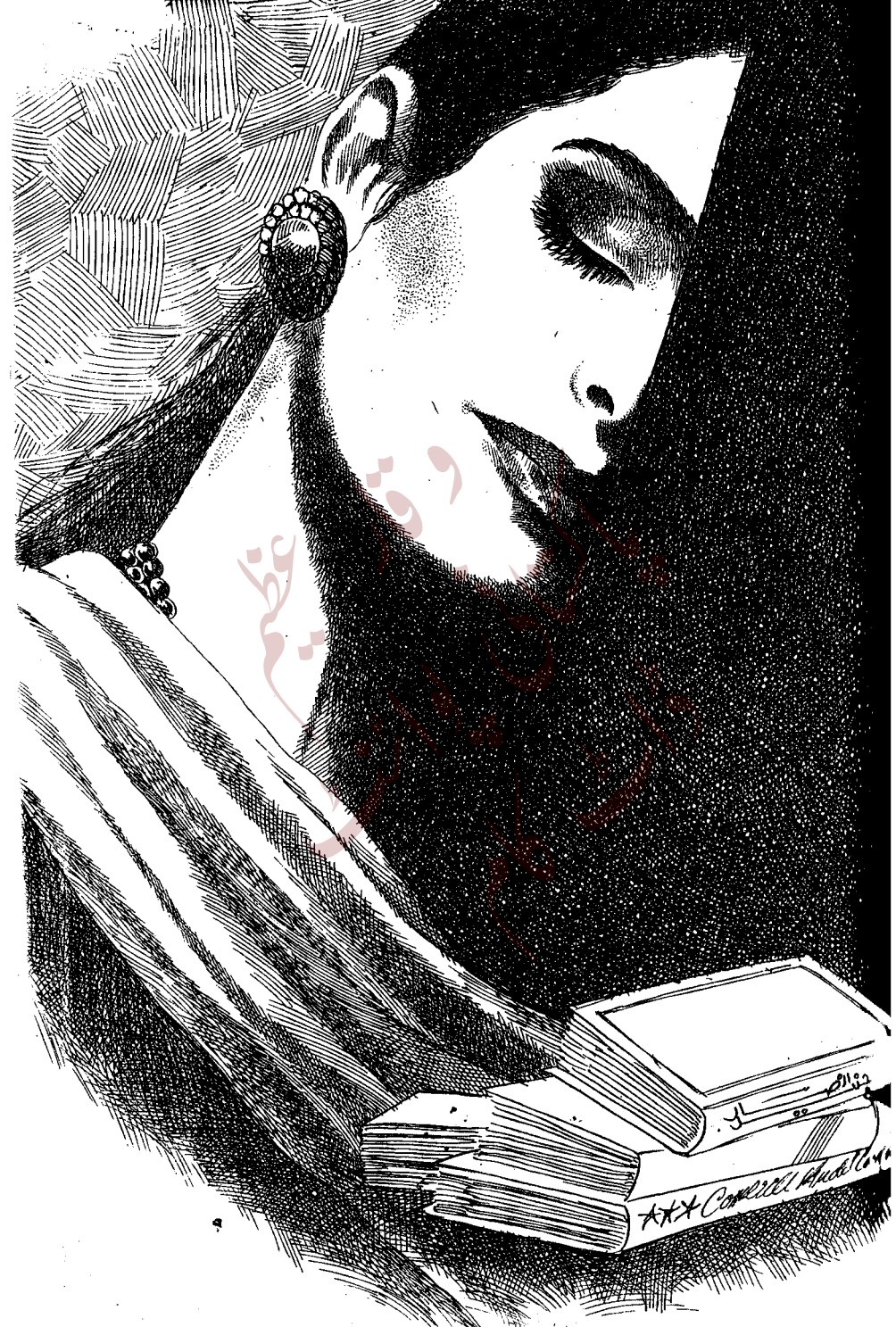
”ارے سونی جلدی مردیر ہو رہی ہے۔“ دادی کی آواز پر اگلے پل وہ ان کے سامنے کھڑی تھی۔

”سونی! آج تیری وین نہیں آئے گی میں نے وہ اپنے پروفیسر سے کہہ دیا ہے وہ آج تجھے بھی جاتے ہوئے کالج چھوڑ جائے گا۔“ دادی نے

تفصیل سے بتاتے ہوئے سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیا پھر چشمہ درست کرتے ہوئے اپنی بہو سے مخاطب ہوئیں۔

”بہو بیگم! ذرا بیٹی کے لچھن دیکھو کالج جانے کی کم اور دلے کی زیادہ لگ رہی ہے میں کہتی ہوں بیٹی ہاتھ سے نکلے جا رہی ہے اتنی ڈھیل نہ دو پکے آسمانی طرح کسی کی جھولی میں جا گرے گی ہائے آج کل کی لڑکیاں کالج یونیورسٹی بجلیاں گرانے جاتی ہیں ایسی اولادیں ہوتی ہیں جن کے والدین کے نام تاریخ میں سیاہ لفظوں سے لکھے جاتے ہیں۔“ ہمیشہ کی طرح دادی نے اپنی بہو کو نشانہ بنایا۔

”واہ دادی! آپ باتیں تو ایسی کرتی ہیں جیسے خود



دکان میں گئی۔

حماد اس کے ساتھ شفٹ ہو گیا تھا۔

ان دونوں کی اشفاق صاحب کے گھر والوں سے خوب بنتی تھی البتہ سونیا اشفاق کی ان دونوں سے کبھی نہ بن سکی وہ ہمیشہ ان سے خار کھاتی جہاں وہ دونوں پائے جاتے وہاں سونیا اپنا سایہ بھی نہ پڑنے دیتی مگر بے خبر سونیا میٹرک کے بعد پروفیسر ارسل اور حماد کے کالج میں ایڈمیشن لے چکی تھی اس پر یہ انکشاف تب ہوا جب پروفیسر ارسل ان کی کلاس لینے عین سونیا کے سامنے ٹھہرا تھا پروفیسر اس سے جنگ کی تیاری کر کے آیا تھا وہ اس سے اگلے پچھلے سارے حساب برابر کرنے آیا تھا۔

”اف یہ کمینہ یہاں بھی پہنچ گیا اب پورا سال سر پر سوار رہے گا“۔ سونیا نے اپنے سامنے ٹھہرے پروفیسر کو دیکھا اور منہ پھیرتے ہوئے نفرت سے کہا۔ اس کے اس عمل سے پروفیسر نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بھری کلاس میں اس سے دودھ ہاتھ کئے وہ غصے سے لال ہوئی کلاس سے باہر نکل آئی۔

☆☆☆☆

”پروفیسر کے نام پر اپنی تیز ترین تلوار جیسی زبان کے جوہر دکھانے جاتا ہے“۔ سونیا نے گھر کے دروازے سے انٹر ہوتے ہی اپنا بیگ برآمدے میں بڑی چار پائی پر ڈے مارا اور بڑبڑاتی ہوئی پانی پینے مچن میں داخل ہوئی۔

”ارے سونی! تو کیوں مرچیں چپا رہی ہے“۔ اماں نے کھانے کی ٹرے تھاے پیشانی پر بل ڈالے اس سے اس کے غصے کی وجہ پوچھی۔

”اماں بتائے دے رہی ہوں ایسے پروفیسر کی نو انٹری کا بورڈ محلے میں لگا دو ورنہ سرخ ہتی دیکھا جائے گا“۔

”ارے سونی! آہستہ بولو پیچے وہ دونوں پروفیسر آئے بیٹھے ہیں کیا سوچیں گے کیسی منہ

”بھائی! یہ دو کون آکس کریم دینا“۔ اس نے جلدی سے دکاندار کو آڑ دیا۔

”دو کون آکس کریم کا آرڈر سن کر پروفیسر نے پہلے تو اسے غصے سے دیکھا پھر بولا۔

”میں نہیں کھاتا آکس کریم اور اس برقی برف میں کوئی پاگل ہوگا جو آکس کریم کھانے کی خواہش رکھتا ہوگا“۔

”ہوں تمہیں دے کون رہا ہے“ آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے یہ دو کون آکس کریم میں نے اپنے لئے لی ہیں“۔ سونیا نے شانے اچکائے اور بے نیازی سے کہا اس بار وہ شرم سے پانی پانی ہوا اس نے آکس کریم کے کون پکڑے اور الٹا اسی تکیے لہجے میں دکاندار سے بولی۔

”اس کبجوس پروفیسر سے پیسے پکڑ لینا“۔ اس نے کہا اور اس کے قریب سے گزر گئی ارسل اسے جاتا دیکھتا رہا اس نے سونیا کے منہ سے اپنے لئے نکلے گئے لفظ با آسانی سنے تھے وہ غصے سے سرخ ہوتا وہاں سے چلا آیا۔ وہ سونیا پر برسنے کے بجائے خود پر ضبط کر گیا۔ سارے راستے اس نے پروفیسر کو تپانے کا کوئی موقع نہ جانے دیا کالج کے قریب پہنچتے ہی پروفیسر کی سانس بحال ہوئی اگلے لمحے اس کا سارا سکون غارت ہوا جب اس پر ہم پھٹا کہ سونیا بھی اسی کالج کی نیو اسٹوڈنٹ ہے

جہاں وہ اپنی پروفیسری کے جوہر دکھاتا ہے وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سونیا کو دیکھ رہا تھا وہ بخوبی جانتا تھا سونیا کا کالج میں ہونا اس کے لئے کسی آفت سے کم نہیں پروفیسر ارسل متھس کی ڈگری لینے کے بعد مری میں گورنمنٹ ڈگری کالج میں پروفیسر کے عہدے پر فائز تھا وہ ایک سال سے سونیا کے والد صاحب کے مکان کے اوپر والے پورشن میں مقیم تھا ارسل کے چند ماہ بعد ارسل کا دوست اور کولیگ

پھٹ لڑکی ہے۔ اماں نے راز دارانہ انداز میں اسے سمجھایا۔

”اماں! میں نہیں ڈرنے والی ان لنگٹوں سے کہا بھی تھا نکال باہر کر دو۔“ اس نے منہ کے مختلف زاویے بنائے اماں کی بات پر وہ مزید بگڑ گئی تھی۔ اب وہ بچن سے نکل کر برآمدے میں کھڑی تھی برآمدے سے صحن کا نظارہ بہت خوبصورت دکھائی دے رہا تھا صحن میں لگے پودے اور درخت برف سے ڈھکے تھے اس نے برآمدے سے صحن کی طرف قدم بڑھایا، جاگرز اور اوور کوٹ پہنے صحن میں پڑی برف سے کھیلنے لگی وہ برف کے گولے بنائی اور آسمان کی طرف اچھال دیتی برف کے چھوٹے چھوٹے ذرات واپس اس کے بالوں پر ٹھہر جاتے۔ سردی سے سرخ ہوتی ناک اور چہرہ اس وقت وہ بلا کی خوبصورت لگ رہی تھی برآمدے میں کھڑا ارسل ستون سے ٹیک لگائے کوٹ کے جیب میں ہاتھ ڈالے دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا، ارسل کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار تھی وہ اسے ہر روپ میں دل و جان سے پیاری لگتی تھی وہ اس کے لئے دل کے تار کئی بار نیچے محسوس کر چکا تھا، اچانک سونی کو خود پر کسی کی پڑنی لگا ہوں کی پیش محسوس ہوئی اس نے ایک جھٹکے سے پیچھے مڑ کر دیکھا سامنے برآمدے میں کھڑے ارسل کو پایا جو جانے کب سے اسے اپنی نظروں میں جکڑے ہوئے تھا سونی نے اپنے ہاتھ میں بنا برف کا گولا ارسل کو مارا اور اپنے کمرے کی جانب بھاگی اس کا غصہ مزید بڑھ چکا تھا وہ کافی دیر تک کمرے میں ٹہکتی رہی پھر آف موڈ کے ساتھ بیڈ پر سونے کے لئے لیٹی پہلو بدلتے ہی وہ نیند کی وادیوں میں جا چکی تھی۔

☆☆☆☆

شام کو آنکھ کھلتے ہی بیڈ کے قریب کھڑی اماں پر نظر پڑی جو اسے کڑی نگاہ سے گھور رہی تھیں۔

”کیا ہوا اماں! اب کیا ہو گیا مجھ سے؟“ وہ آنکھیں مستحکم ہوئی اٹھ بیٹھی۔

”سونی اس کو نہ لکارو ورنہ وہ تلوار اٹھائے میدان میں کوو پڑے گا۔“

”ہائے کاش اماں! میں کسی کی ایسی عزت افزائی کر سکتی تو میری حسرتوں کا باقاعدہ آغاز ہو جاتا۔“ سونی نے اماں کے غصے کی پرواہ کئے بغیر پروفیسر کا چہرہ تصور میں لاتے ہوئے چبا چبا کر اماں کو جواب پیش کیا۔

اماں ابرو حیرت سے سکڑتے ہوئے اس کے قریب بیٹھیں اور انتہائی غصے سے بولتی چلی گئیں۔

”تو اس گل خان سے پروفیسر کے نام پر قرض پکڑتی رہی ہے تیری وجہ سے گل خان نے اس کی اچھی خاصی عزت افزائی کی ہے آج وہ بچہ اس گل خان سے دودو ہاتھ کرنے میں دیر نہ کرتا اگر تیرے ابا مومن واردات پر نہ پہنچتے سارا زمانہ ایک بار پھر تیرے جوہر لئے بیٹھا ہے لوگوں سے تیرے ابا کو اعزاز میں تیری الٹی سیدھی حرکتیں سننے کو مل رہی ہیں ہائے سونی۔“ اماں سر پکڑنے بیٹھی تھیں۔

”تو کب عقل کی پٹری پر سر رکھے گی اور میرے کلیجے پر ٹھنڈ پڑے گی۔“ اماں کی اشتعال انگیزی دیکھتے ہوئے اس نے آنکھیں چرائیں اور جلدی سے پاؤں میں سلیپرز انکائے اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ وہ اپنی غلطی پکڑے جانے پر ہمیشہ مصلحتاً خاموشی اختیار کر لیتی آج بھی اس نے کچھ یوں ہی کیا تھا۔

☆☆☆☆

کانچ کا دوسرا دن بھی کچھ اچھا نہ گزرا وہ پروفیسر ارسل کی وجہ سے کافی بے زار ہو چکی تھی اس وقت بھی اس نے کانچ کے کوریڈور میں بیٹھی لڑکیوں کے بننے گروپ میں دھماکے دار انٹری ڈالی۔

”اوسنی لیونی کدھر چلی آرہی ہو؟“ گروپ کی

ایک لڑکی آسمہ نے اسے غصے سے سنی لیونی کا خطاب دینا جس پر وہ بھڑک کر کمر پر ہاتھ رکھے لڑائی کے موڈ میں اٹھ کھڑی ہوئی اس نے ایک قدم آگے بڑھایا اور کہا۔

”سونی کہو لیونی ٹھپے نہ لگاؤ ورنہ ایسا آئٹم دکھاؤں گی کہ تانی کی بھی تانی یاد آجائے گی۔“ اس نے مزید ایک قدم اور آگے بڑھایا پھر یاد آنے پر بولی۔

”کیوں بہنوں یہاں آنا ممنوع ہے آسمہ عرف اجڑا چمن میرے جیسی خوبصورت لڑکیوں کی انٹری منع ہے۔“ اس نے ماتھے پر آئی لٹ سلجھائی اور اتراتے ہوئے آسمہ کے ہم پٹھے بالوں کا مذاق اڑایا جس پر آسمہ کے تن بدن میں چنگاریاں اٹھنے لگیں۔

”ہم چاند جیسی لڑکیوں کا بھلا کس سے مقابلہ۔“ آسمہ کے ساتھ بیٹھی ایک لڑکی نے کمنٹ پاس کیا اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولی۔

”چلو پھر انتظار کرو چاند کو گرہن لگنے کا بہت جلد یہ سونی اپنا آئٹم دکھانے والی ہے۔“ اس نے کہا اور جانے کے لئے قدم بڑھایا۔

”جاؤ جاؤ ہم سے مقابلہ کرو گی تو منہ کی کھاؤ گی یہاں تمہاری دال گلنے والی نہیں۔“ آسمہ نے اسے جاتا دیکھ کر بلند آواز میں کہا۔

☆☆☆☆

وہ کمرے کے دروازے کی چوکھٹ سے سر ٹیکے بیٹھو کو کندھے پر بٹھائے مزے سے چاکلیٹ کھا رہی تھی کہ اللہ دتے کو باہر کے گیٹ سے انٹر ہوئے دیکھ کر اسے دادی کے انداز میں بیٹھنے کی دعوت دی دادی نے اسے گھورا جس کا اثر اس پر ہمیشہ کی طرح نہ ہوا اس نے زوردار قہقہہ لگایا اللہ دتے کو دیکھتے ہی اس کی ہنسی اکثر چھوٹ جاتی تھی کبھی اس کے تیل میں ڈوبے بالوں پر تو کبھی اس کی پتلی مونچھ پر۔

”تو جانی ہے یا میں جوتا اٹھاؤں؟“ دادی نے

اسے بھگانے کے لئے جوتا اٹھایا تھوڑی دیر بعد وہ دوبارہ نمودار ہوئی اب دادی کے پاس اللہ دتے کے ساتھ ساتھ دونوں پروفیسرز بھی بیٹھے تھے جو کالج کے بعد کھانا کھانے سے شام کی چائے تک یہیں براجمان رہتے اور دادی تینوں کو اپنی برادری کے بارے میں بتاتی رہتیں۔

”ارے بیٹا! تم دونوں کو میں زینت اور فریج سے ملواؤں گی ایسی سکھڑ بچیاں ہیں تم دونوں ان کے بارے میں سوچنا۔“ اس نے دادی سے اپنی زرقا پھسکی بیٹیوں کے بارے میں کہتے سنا اور سنتے ہی ان کے سر پر دوبارہ جا کر کھڑی ہوئی۔

”ہاں جی تم دونوں سوچنا اور پھر سوچتے ہی رہنا سوچ سے آگے انشاء اللہ نہیں جاسکو گے دعویٰ ہے میرا۔“ اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا۔

”جانتے ہو بھوت کی دوسری قسم ہیں دونوں بہنیں ان کے بارے میں دادی نے اللہ دتے جلیبی والے کو بھی کچھ ایسی ہی ہدایت دی تھی بیچارہ اب تک سوچ ہی رہا ہے۔“

”ارے سونی! تجھے نہیں پتہ کہ لڑکیاں ایسے مردوں کے سامنے منہ پھاڑ کے نہیں بولتیں جو منہ میں آ رہا ہے بکے جا رہی ہو۔“ دادی نے غصے سے لال ہوتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے بھائیو تم لوگ سوچو زینب اور فریج کے بارے میں۔“ اس نے کہا اور کچن کی طرف جانے لگی۔

”اور ہاں۔“ پھر رک کر بولی۔

”ایسے ہی سوچنا جیسے ہماری قوم لائٹ جانے کے بعد آنے کا سوچتی ہے۔“ یہ کہتی ہوئی باہر نکل گئی۔

☆☆☆☆

اگلے دن دادی نے پروفیسر حماد اور اسل سے ملوانے کے لئے فریج اور زینب کو بلوایا ہوا تھا دونوں

دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے زینے اتر رہے تھے اگلے لمحے زینہ ب اور فریج کو دیکھتے ہی چہرے کا رنگ فق ہو گیا، سونی کی کل والی باتیں، تہوڑے کی طرح سر پر لگ رہی تھیں اس نے دونوں کے لٹکے منہ دیکھ کر ایک چمکتے پھاڑ قبہتہ لگایا دونوں نے بمشکل دادی سے جان چھڑائی۔

”یا ہو کچھ لوگوں کے اربانوں پر پانی پھر گیا ہائے پھارے۔“ اس نے طنزیہ مسکراہٹ دونوں کی طرف اچھالی اور بلند آواز میں لفظوں کے تیر برسائے۔

”مجھتی کیا ہو تم خود کو جو ہم دونوں کے پیچھے نہا دھو کر پڑی ہو۔“ حماد غصے میں ہمیشہ کی طرح اس سے لڑائی میں پیش پیش تھا۔

”سر پھرا۔“ سونی نے جیوگم چباتے ہوئے تیزی سے حماد کو نہ ہضم ہونے والا نام پیش دیا۔

”اور تم نے ابھی خود کو دیکھا ہے آئینے میں۔“ ”روز دیکھتی ہوں صاف تمہوں اپنے کالج کی۔“

سونی نے اترتے ہوئے کہا۔

”ہاں تب ہی گھر کے سارے شے تمہاری خوف ناک شکل کی وجہ سے ٹوٹ گئے ہیں۔“ حماد نے ہڑتے ہوئے کہا۔

”او مسٹر! شیتے میری خوبصورتی کو دیکھ کر جھک جاتے ہیں شیتے تم دونوں کی لوٹے جیسی شکل کی وجہ سے ٹوٹتے ہیں جاؤ منہ دھو آؤ ورنہ لوگ ڈر جائیں گے۔“ سونی نے حماد کی خوب بے عزتی کی جس پر حماد

کا لہجہ آسمان کو چھو رہا تھا، وہ اس کی طرف بڑھائی تھا لہذا اسل اسے پیچ کر زبردستی باہر کی طرف لے گیا،

وہ بغیر کسی پشیمانی کے ہمیشہ کی طرح پرسکون تھی،

ماد اور اسل سے لڑائی اس کا روز کا معمول بن چکا تھا، وہ ان پر روز چلاتی اماں اور دادی کے سبھانے

ہاں باز نہ آئی۔ سردیاں گرمیوں میں بہار خزاں میں بدلہ موسم بدلے وقت بدلا ہر چیز نے رنگ

اپ بدل نہیں بدلی تو سونی بدلی نہیں بدلی اس کا شوخ

پن چنچل ادا میں بے نیازی میں بے مثال ابا کی جان اس کا زندگی گزارنے کا ایک الگ انداز تھا کبھی بروفسر کے کمرے کی کھڑکی سے محلے کے مشہور چھٹی والے اللہ دتے کی جلیبیاں چراتے ہوئے اسل اور حماد کے ہاتھوں پکڑے جانے پر دادی کی مار کھانے کے بعد بھی نہ سدھرنے کی اس نے قسم کھا رکھی تھی۔

”دادی۔“ وہ زینہ تیزی سے اترتی دادی کو آواز میں دے رہی تھی۔

”دادی میں پچھلے دومنٹ میں کوئی ہزار دفعہ آپ کو پکار چکی ہوں ابھی تک میری آواز مبارک پچھلے

محلے کی سرین پروین کے کانوں کے پردے بھی پھاڑ چکی ہوگی دادی آپ کی آنکھوں میں موتیا آیا ہے

کان کے پردوں کی ڈیٹ ایکسا پر نہیں ہوتی جو میری آواز آپ تک نہ پہنچے۔“ وہ بغیر سانس لئے دادی سے کہہ رہی تھی۔

”کیا ہے سونی صبح صبح پورے محلے کو اٹھانے کا ٹھیکا تجھے دیا ہوا ہے جو تم بھٹے ڈھول کی طرح گلا پھاڑ

ہے جارہی ہو۔“ دادی سونی کی پکار پر سس سے مس نہ ہوئیں اب چار پائی سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”دادی مجھے ہزار کا نوٹ چاہئے آپ یہ ہزار لیں مجھے پانچ سو کے دو دے دیں۔“ اس نے دادی کے غصے کی پرواہ کئے بغیر ہزار کا نوٹ دادی کی طرف

بڑھایا اور جلدی سے دادی کا والٹ بٹکے کے نیچے سے اٹھایا۔

”جل ہٹ میری بد قسمتی ہے جو عمر سے پہلے آنکھ میں موتیا آ گیا ہے تو مجھے بے وقوف نہ بنا پچھلے

ہفتے تیرے بھروسے پہ تجھے ہزار کا کھلا دیا تھا اور تو مجھے ان کی جگہ عید مبارک والا نوٹ دے گئی آج نہیں

دوں گی۔“ دادی نے اس سے والٹ واپس لینے کی ناکام کوشش کی اس نے والٹ سے دو کڑک نوٹ

نکالے اور بولی۔

”دادی! آپ کا یہ لکچر کالج سے واپس آ کر سن لوں گی ابھی میں چلتی ہوں۔“

”ارے سن سونی! بچے آتے ہوئے میرے لئے دہی بھلے لیتی آتا بڑے دن ہو گئے نہیں کھائے۔“ دادی تھکتے ہی اس پر پھول برسائے کوئیں فٹ سے اپنا آرڈر لکھوا دیا۔

”دادی میں ٹھیک لگانے نہیں بلکہ کالج جا رہی ہوں اپنے اس رنگ رنگیلے اللہ دتہ جلیبی والے سے کہہ دیں کم بخت لا دے گا دہی بھلے۔“ اس نے رک کر کہا اور چھپاک سے باہر کی طرف بھاگی۔

”بچال ہے جو میری بات کی اہمیت ہو میری بات کا تو اثر اس لڑکی پر نہیں ہوتا میرے اکلوتے بیٹے کی نافرمان اولاد اور تیز کی لکیر سے کوسوں دور۔“ دادی نے شکست خوردہ انداز میں کہا تھا۔

شام میں دادی سونی کے کارناموں کی فہرست پروفیسر ارسل کے سامنے کھولے ہوئے تھیں وہ چشمہ لگائے سونی کا دیا ہوا نوٹ پار بار بغور دیکھ رہی تھیں پروفیسر نے پاپ کارن کھائی سونی کو گھورا پھر اٹھ کر اس کے رو برو جا کھڑا ہوا پھر پاپ کارن کا باؤل اس کے ہاتھ سے چھینا اور اس کی کلائی کو مضبوطی سے دبوچا پھر اسے گھسیٹتے ہوئے دادی کے قدموں میں لا کر پھینک دیا اور بولا۔

”دادی سے معافی مانگو تم دادی سمیت کسی کو خاطر میں نہیں لاتیں کیا چاہتی ہو؟ تمہاری ہر غلطی کو بخش دیا جائے تو ایسا نہیں ہوگا۔“ وہ اس پر برس رہا تھا وہ پروفیسر کے اچانک حملے کے لئے بالکل تیار نہیں تھی اس کی کبھی ہوئی تھیں اب الجھ رہی تھیں سارے بال کھل کر اس کے کندھوں کو ڈھانپ رہے تھے وہ تاؤ کھائی پروفیسر کے رو برو کھڑی تھی آنکھوں میں شدید غصہ لئے اس سے بولی۔

”میں چاہتی ہوں کہ تم بلا اجازت میرے معاملات میں دخل دینا چھوڑ دو تم ہوتے کون ہو

تمہاری حیثیت کیا ہے جو بار بار میرے نہ چاہنے بھی میری زندگی میں کود پڑتے ہو کیوں؟“ وہ چپا تھی اگلے لمحے اس کی آنکھیں ڈب ڈبائیں آنکھوں سے اپنے کمرے کی جانب بڑھی وہ چاہتی تھی مگر لفظ جیسے ٹوٹ چکے تھے پہلی بار کسی سامنے اس کی آنکھوں سے آنسو چھلکے تھے پرا نے اس کی نم آنکھیں دیکھ لی تھیں اسے اپنی حرکت شرمندگی کا احساس ہوا تھا وہ اس خوبصورت لڑکی دکھانے کی نیت کبھی نہیں رکھتا تھا اگلے کئی روز تا اس کا سامنا نہیں کر سکا تھا۔

☆☆☆☆

پروفیسر ارسل کلاس کے لئے اسٹاف روم نکلنے والے تھے جب اس کی نظر نوٹس کے اوپر لفافے پر پڑی وہ دوبارہ اپنی نشست پر براجمار اس نے خاکی لفافہ اٹھا کر اسے بغور دیکھا اور کھو اسے پڑھنا شروع کیا پڑھتے ہوئے اسے غصہ آ رہا تھا وہ غصے سے اٹھا اور خط ہاتھ میں تیزی سے کلاس روم کی جانب گیا کلاس میں ہوتے ہی اس نے غصے سے آسمہ کو پکارا آسمہ مو انداز میں اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی ارسل اس کی خوب کلاس لی بھری کلاس میں خط لہر لہرا کر کی بے عزتی کی آسمہ شکوہ گئی وہ شاکی نظر سے پروفیسر کو دیکھ رہی تھی آسمہ اپنی صفائی میں بولنا چاہتی تھی مگر پروفیسر نے بغیر کچھ سنے خط نکلے کئے اور آسمہ کے منہ پر دے مارے وہ کچھوڑ کر باہر نکل آیا۔ آسمہ کسی مجرم کی طرح کھڑا رہی تھی اس کی فرینڈز اس پر سوالیہ نگاہیں گاڑ کھڑی تھیں۔

”ہمارے بڑے کہتے ہیں کہ مقابلے میں اس سے کرو جس کی توپیں رنگ آلود نظر آئیں بدلہ لینے سے قاصر ہوں تاکہ حریف دشمن ہر آ ساتھ کئی وار کر کے دشمن کی کمر پست کر دے تب

ہے دشمن کی گردن مٹھی میں تو بہنو آج کے لئے اتنا مل کافی ہے۔“ آسمہ عرف اجڑا چن اگر غبارے میں ہوا زیادہ بھر جائے تو پھٹ جاتا ہے۔ سونی نے ادا دارانہ انداز میں کہا۔

”آئندہ مجھ سے بچنا نہ لینا۔“ وہ اپنے انداز میں ان کے گرد گھومتی انہیں زبان کے ٹیروں سے مار رہی تھی۔ اس نے اپنی بات مکمل کی اور دھیسے سے آداب کہہ کر گنگنائی ہوئی کلاس روم سے باہر نکل۔

☆☆☆☆

”پھول جہاں کھلتے ہیں لوگ جہاں ملتے ہیں آؤ وہاں چلیں۔“ گذشتہ دنوں اس نے آسمہ سے ادا رسل سے ہونے والی بے عزتی کا بدلہ کچھ یوں لیا ہے کہ خبر آسمہ کی جانب سے محبت بھرا خط ارسال کے ام لکھ دیا پھر صبح کالج پہنچتے ہی وہ خط ٹوٹس کے اوپر لکھ کر خود رنو چکر ہو گئی اس نے جو چھکا مارا تھا سو فیصد اس کے بننے پلان کے مطابق بال وہاں جا گری وہاں سے واپس لانا ناممکن تھا اس خوبصورت اور پلٹ لڑکی کا ہر دن نیا اور خوشیوں سے بھرا ہوتا مری لی خوبصورت دھوپ سے نکلتا اور آسمان پر بجے اداوں میں ڈھکے چاند کی شام یہ اختتام ہوتا کبھی اکی زندگی میں خوشیاں بنا دستک دیئے داخل وہاں ہیں جن کا تصور ہم کبھی نہیں کر سکتے سونی کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔

☆☆☆☆

”اماں اس کی اتنی مجال کہ وہ میرے لئے رشتہ الے میرے ہاتھوں اس کی موت آئی ہے۔“ وہ لرے میں کھولتی ہوئی پروفیسر پر پہاڑ توڑ رہی تھی اماں نے اسے آکر پروفیسر ارسل کے پر پوزل لگا دی تھی۔

”اماں! آپ نے مجھ سے پوچھے بغیر ہاں بھی روی اور تو اور مٹکی کی ڈیٹ بھی دے ڈالی تم سے

اماں اس بے بسی کے عالم میں میرا دل کرتا ہے میں پروفیسر کا خون کردوں اماں میں نہیں کرنے والی اس پشیمش سے شادی۔“

”بیٹا شادی تو تمہارا باپ بھی کرے گا۔“ اماں نے اسے سختی سے کہا۔

”تو ٹھیک ہے کرا دیں ابا کی شادی مجھے کوئی اعتراض نہیں بلکہ آپ اپنا اجازت نامہ ابا کو لاہور بھجوا دیں وہ پہلے اپنا ولیمہ کھائیں گے بعد میں آپ کو حیرانگی کی کال دیں گے۔“ اس نے بے پروائی سے کہا تھا۔

”نہ اس میں برائی کیا ہے؟ اور آج تک ہمارے خاندان میں ایسی کون سی لڑکی ہے جس کے لئے کسی پروفیسر نے دستک دی ہو سونی ناشکری کی حد ہوتی ہے بچے پوری تسلی کے بعد ہی پروفیسر کی ماں کو بلایا ہے وہ شام کو آ رہی ہیں۔“ اماں سکون سے اسے بتا رہی تھیں۔

”کیا؟ اماں آپ نے پروفیسر کی ماں کو بھی بلوالیا؟“ سونی سنتے ہی پچھد کر بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ہاں سونی!“

”بیٹا کچی عمر کے سب فیصلے بھی کئے ہوتے ہیں جانتی ہوں تیرا فیصلہ ٹوٹنے میں گھڑی کی سوئیاں نہیں گنتی پڑیں گی۔“ اماں نے اپنی بات پر آخری مہر لگائی اور اسے سوچتا چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گئیں۔

☆☆☆☆

مری کی خوبصورت شام آنے کو تھی جہاں بلکے بادل تھے ساتھ تھنڈی ہوا مزہ دو بالا کر رہی تھی صحن میں لگے درختوں پر جگنوؤں کی مدھم سی روشنی دکھائی ہو الا ان کی گھاس کو چھیڑ رہی تھی چاند کی آنکھ بچولی بھی جاری تھی سورج کی آنکھ بند ہوتے ہی بادلوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے ایسے خوشگوار موسم کو وہ ہمیشہ

”جو بھی ہے مسٹر اپنا پر پوزل واپس لو اور
”ہو۔ اس نے چکی بجاتے ہوئے تیزی سے حکم
جاری کیا۔

”انکار کرنے کا آپشن تمہارے پاس موجود
پھر مجھے کیوں کہہ رہی ہو۔“ پروفیسر نے پیشانی
ڈالتے ہوئے کہا۔

”دیکھ لوں گی۔“ وہ جانے کے لئے واپس مڑ
”یہی تو میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے دیکھو۔ ا
جاتا دیکھ کر اس نے اس کی کلائی دبوچ کر چہرہ

رخ اپنی جانب موڑا اسے اپنے نزدیک کیا۔

”ان نظروں سے جن سے تمہیں تمہارا دل با

اکساتا ہے دل کے کسی گوشے میں جذبوں کو ابھر

سے پہلے چل دینے سے جذبات ڈھٹ ہو جاتے

یہ جذبات بہت صحن سفر طے کر کے کسی کے دل

آ کر رہتے ہیں دل کی پہیلیاں تم کیا بوجھو گی۔“

کے دل کے تار بجے سانس بے ترتیب ہوئیں ا

نظروں کا خوار اور جذبوں کی مہر کار نے اسے مر

کر دیا، وہ گنگ رہ گئی تھی ایک لمحے میں دل یوں ا

گواہ بن گیا اسے اپنی کلائی پر اس کے ہاتھ کی گر

محسوس ہوئی اس نے اپنی کلائی آزاد کرائی اور

کچھ کہے وہاں سے چل آئی وہ اسے جاتا دیکھتے

وہ جانتا تھا یہ بے ترتیب محبت سونی کے دل

گوشے میں سر اٹھائے گی مگر محبت زندگی سے

مانس نہیں ہو سکتی۔

وہ ارسل کی دہن بنی اسٹیج پر رکھے خوبصو

صوفے پر بیٹھی مسلسل مسکرا رہی تھی ارسل کے ا

محبت نے اسے سرشار کر دیا تھا ارسل کی محبت نے

کی بے مروتی کو مٹا دیا تھا اس نے ارسل کا ہاتھ

تھا مابجب اس کی محبت پر یقین قائم ہوا۔

☆.....☆.....☆

☆.....☆

☆

گھوم پھر کر گزرتی تھی روز دوپہر سے شام تک
باغات چھان مارتی، وہ جاگزیں پہنے مال روڈ، کشمیر
پوائنٹ، تنہا گلی، چھانگلی وہاں کے پہاڑ اسے اپنے
قدموں تلے محسوس ہوتے وہ چھتری سر پر رکھے مری
کا چپہ چپہ چھان مارتی، مگر آج وہ غصہ ناک پر
بٹھائے صحن میں بیٹھی تھی اس نے انکار کرنے کی کئی بار
جسارت کی تھی مگر گھر میں اباسمیت کوئی اس کے انکار کو
اہمیت نہیں دے رہا تھا، کھانے کی ہڑتال وہ رات
سے کئے بیٹھی تھی۔

”ارے اس پروفیسر کا سر کیوں نہ پھوڑوں جو

اس سارے فساد کی جڑ ہے بڑا آیا مٹفنی کرنے

والا۔“ اسے اچانک ارسل کا خیال آیا وہ بڑبڑاتے

ہوئے پروفیسر کے کمرے کی طرف بڑھی۔

”وحید مراد کی فلموں کے گانے سن رہا ہے۔“

اسے ارسل کے کمرے سے گانوں کی آواز سنائی دی

جس پر اس کا غصہ مزید بڑھ گیا۔

وہ ناول سے بالوں کو خشک کرتا ہوا داش روم سے

نکلنا تھا جب وہ اندر داخل ہوئی چند لمحے چوکھٹ میں

کھڑے ہو کر غصے پر قابو پایا پھر تیز آواز میں بولتی

ہوئی آگے بڑھی۔

”جس انسان کے لئے دل کے گوشے میں

نفرتوں کے پہاڑ کھڑے ہوں اس انسان کے ساتھ

زندگی کا سفر طے کرنا تو دور کی بات ہے یہاں کشمیر

پوائنٹ سے مال روڈ تک کا سفر طے کرنا محال ہو جاتا

ہے، مسٹر ارسل۔“ اب وہ اس کے رو برو آنکھوں میں

آنکھیں ڈالے بولی۔

”اماں! با! دادی کے سامنے تم نے شرافتوں کے

ریکارڈ توڑ دیے ہیں انہیں تو تم نے اپنی ظاہری

شرافت سے متاثر کر ہی لیا مگر مجھے کیسے کرو گے؟“

”میں تمہیں متاثر کرنے کی کوئی خواہش دل میں

رکھتا بھی نہیں ہوں۔“ ارسل نے انتہائی پرسکون لہجے

میں مختصر جواب دیا سونی کی آنکھوں میں غصہ عود آیا۔

مریم فاطمہ

خالی ماہ

فرزانہ اور راشد ٹرین میں سفر کر رہے تھے۔
فرزانہ راشد کی بیوی تھی۔ فرزانہ ایک نہایت
خوبصورت عورت تھی جبکہ راشد عام شکل و صورت کا
آدمی تھا۔ ان دونوں نے پسند سے شادی کی تھی، وہ
گاؤں کے رہنے والے تھے اور وہاں اتنی جہالت تھی
کہ پسند سے شادی کرنے پر لڑکا اور لڑکی کو جان سے



مار دیتے تھے۔ ان دونوں کے خاندان کا بھی یہی دستور تھا۔ راشد فرزانہ کو پسند کرتا تھا، وہ اسے روز چپکے چپکے دیکھا کرتا تھا۔ وہ کنویں سے پانی بھرنے آتی تھی۔ راشد کھیتوں پر کام کرنے کا بہانہ بنا کر پہلے فرزانہ کو دیکھنے جاتا تھا۔

ایک روز ایسے ہی راشد اپنے باپ سے کھیتوں میں کام کرنے کا بہانہ بنا کر چلا گیا۔ وہاں فرزانہ کنویں میں سے پانی بھر رہی تھی۔ راشد نے آج اسے اکیلا دیکھ کر سوچا کہ دل کی بات کہہ ہی دی جائے۔ وہ چلتا ہوا اس کے پاس آئے لگا، اچانک سے فرزانہ نے گھوم کر دیکھا تب ہی تیز ہوا کا جھونکا آیا اور فرزانہ نے جو چادر سر پر اوڑھ رکھی تھی وہ اڑ گئی اور اڑ کر راشد کے ہاتھوں میں آ گئی۔ راشد نے فوراً ہی چادر کو پکڑ لیا، جبکہ بری طرح شرمائی اور بھاگ کر جانے لگی مگر راشد نے آگے بڑھ کر اس کی کلائی اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھام لی اور بولا۔

”شرماتی کیا ہو، میں تو روز تمہیں دیکھتا ہوں۔“ اس نے اس کی چادر اسے تھمائی، فرزانہ نے جلدی سے سر پر چادر اوڑھ لی۔

”وہ تو مجھے بھی پتا ہے کہ تم روز مجھے دیکھتے ہو، مگر آج اکیلے میں دیکھ کر فائدہ اٹھانے پہنچ گئے۔“

”نہ بی بی توبہ توبہ میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔“ راشد نے صفائی پیش کی۔

”اچھا چل پھر جا یہاں سے اور تھوڑی حیا کر، گاؤں کی کڑی ہوں، اگر میرے بیو کو پتا چل گیا ناں کہ تو یہاں روز مجھے دیکھتا ہے تو وہ تجھے زندہ ہی جلا دے گا۔“

”چل بس رہنے دے مینوں نڈرا، میں ویسے بھی اتنی چھوٹی موٹی باتوں سے نہیں ڈرتا۔“ راشد بولا۔

”دیکھو دے راشد! تو آخر چاہتا کیا ہے، ابھی چیخ کر پورے گاؤں کو کٹھا (اکٹھا) کر لوں۔“ فرزانہ کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر بولی تو راشد نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا پھر بولا۔

”زیادہ ٹانگ کیا ناں تو اس کنویں میں پھینک دوں گا اٹھا کر۔“

”ہائے ربا میں مر گئی۔“ فرزانہ چیخ پڑی کیونکہ راشد نے اسے اپنے بازوؤں میں اٹھالیا تھا اور اب وہ اسے لے کر کنویں کی طرف بڑھ رہا تھا۔

”اب بول کر نی ہے مجھ سے شادی یا پھر؟“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”ہاں ہاں کر نی ہے۔“ فرزانہ گھبرا کر بولی تو راشد نے اسے نیچے اتار دیا اور مسکرانے لگا۔ فرزانہ نے اس کے سر پر دھیرے سے ایک چپت لگائی۔

”اس پورے گاؤں میں تو سب سے پگلا منڈا ہے۔“ اور ہنستی چلی گئی۔ راشد اسے دور تک جاتے ہوئے دیکھتا رہا اور پھر کھیتوں میں کام کرنے چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

اس کے بعد ان دونوں نے اس گاؤں کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے چھپ کر نکاح کیا اور پھر گاؤں سے بھاگ کر ٹرین میں بیٹھ کر لاہور چلے گئے۔

وہاں پہنچ کر راشد نے اپنا جائے کا ہوٹل کھول لیا اس طرح انہیں دو وقت کی روٹی نصیب ہو جاتی۔

فرزانہ کو بچپن سے ہی سلائی کڑھائی آتی تھی۔ اس نے کپڑے سینے وغیرہ کا کام شروع کر دیا۔ اس طرح چند پیسے وہاں سے بھی مل جاتے۔

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ ان کی شادی کو ایک سال ہو گیا تھا مگر ابھی تک ان کے یہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ فرزانہ اس بارے میں سوچ کر بہت اداس

تھی اور فکر مند بھی۔ انہوں نے ہر ڈاکٹر سے اپنا معائنہ کرایا لیکن ڈاکٹر نے انہیں صاف جواب دے دیا کہ فرزانہ میں کچھ کمی ہے اس لئے آپ کے یہاں بچہ نہیں ہو سکتا۔ یہ بتا گئے ہی کہ وہ کبھی ماں نہیں بن سکے گی فرزانہ بالکل ٹوٹ گئی۔ راشد اسے تسلیاں دیتا رہا لیکن فرزانہ کے ذہن میں کچھ اور ہی چل رہا تھا جس کی خبر ابھی راشد کو نہیں تھی۔

فرزانہ اندر رہی اندر کچھ سوچ رہی تھی اور پھر ایک دن اس نے کسی پارک میں سے کسی کی گود کی بچی کو اغوا کر لیا۔ بچی کے چہرے پر نہایت بھولپن تھا، وہ بہت خوبصورت تھی۔ فرزانہ اسے لے کر گھر بھاگی، اس نے رکشہ پکڑا اور رکشے میں بیٹھ کر سیدھی اپنے گھر پہنچی۔ راستے بھر وہ بچی کو چومتی رہی۔ شام کو جب راشد گھر آیا تو اس نے گھر میں کسی بچے کے رونے کی آواز سنی، وہ بڑا حیران ہوا کہ اس گھر میں کون آ گیا۔ یہاں تو انہیں کوئی جانتا ہی نہیں۔ اس لئے مہمانوں کے آنے کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا، وہ جلدی سے آواز کی سمت آیا تو دیکھا کہ فرزانہ ایک پیاری سی شیرخوار بچی کو چپ کر رہی ہے۔

”فرزانہ یہ بچی کس کی ہے؟“ راشد نے پوچھا۔ اسے بچی پر بڑا پیار آ رہا تھا اور ساتھ ہی یہ جاننے کا تجسس بھی ہو رہا تھا کہ بچی کس کی ہے۔

”آہستہ بولو، یہ بچی میں اغوا کر کے لائی ہوں آج ریس کو رس پارک میں سے، اب ہمارے پاس بھی اولاد ہوگی، ہمیں اب اولاد کے لئے ترسنا نہیں پڑے گا۔“ فرزانہ چپکتے ہوئے بولی۔ اچانک ہی سے راشد کا سیدھا ہاتھ اٹھا اور پوری قوت سے فرزانہ کے بائیں رخسار پر پڑا۔ فرزانہ ہل کر رہ گئی، اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، اس نے راشد کو پہلے کبھی اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا، وہ بری طرح سہم گئی۔

”بدذات عورت یہ کس کی بچی اٹھا کر لے آئی، تجھے ذرا شرم نہیں آئی کسی کی بچی اغوا کرتے ہوئے۔“ راشد! یہ تو کیسی باتیں کرنے لگ گیا، میں اسے بالکل ماں کا پیار دوں گی، کدی کسی ماں نے اپنی بیٹی کو اتنا پیار نہیں دیا ہو گا جتنا (جتنا) میں اینوں دیواں (دوں) گی۔“

”چپ کر پاگل عورت، ذرا سوچ اپنی عقل سے نا معلوم کس غریب کی بچی تو نے اٹھا لی ہے، ان کے گھر پر کیسی قیامت ٹوٹی پڑ رہی ہو گی۔“ راشد غصے سے کا پیتی آواز میں بولا۔

”میں تو بس اس کو اپنی بیٹی بنا کر لائی تھی، راشد ایسی گل نہیں ہے کہ میں کوئی ظالم عورت ہوں۔“ فرزانہ آنکھوں میں آنسو لئے بولی۔

”اپنی بکواس بند کر، میں تجھے ابھی اسی وقت طلاق دیتا ہوں، تیرے نال پیار کیا تھا اس لئے اتنا احسان کر رہا ہوں کہ تجھے اس گھر سے نہیں نکال رہا، بس خود میتوں چھڈ کے جا رہا ہوں۔“ اس کے بعد راشد نے مزید دو بار اسے طلاق دی اور فرزانہ حیرت سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے راشد کو جاتا ہوا دیکھتی رہ گئی۔ اس لئے وہ جیسے پتھر کی بن گئی تھی۔ جب ہوش آیا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ راشد ہمیشہ کے لئے اسے چھوڑ کر جا چکا تھا۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی پھر اچانک ہی اس کی نظر ایک طرف چار پائی پر لینے اس ننھے وجود پر پڑی۔ بچی بری طرح دروہی تھی، اسے دیکھ کر وہ اپنا رونا بھول گئی اور لپک کر بچی کو گود میں اٹھا لیا۔ اسے تو بچی کا نام تک معلوم نہیں تھا، اس نے اپنے آنسو پونچھے اور بچی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

”آج سے تیرا نام شاملہ ہے۔“ شاملہ لگا تار روے جا رہی تھی۔ اسے اچانک ہی خیال آیا تو اس نے بچی کا فیڈ رٹلے کر اس کے منہ سے لگا دیا۔ وہ خوشی

روتے ہیں۔ لیکن شائلہ بڑی بہادر بچی تھی۔ وہ تو پہلے دن ہی وہاں دوسرے بچوں کے ساتھ گھل مل گئی۔ یہ دیکھ کر فرزانہ کو بڑی خوشی ہوئی۔ اس نے شائلہ سے یہی کہہ رکھا تھا کہ تمہارے ابو کا رازیکسٹنٹ میں مر گئے تھے لیکن شائلہ کو بڑا تعجب ہوتا تھا کہ آخر بھلا اس کی ماں کے پاس اس کے باپ کی کوئی تصویر یا کوئی نشانی کیوں نہیں ہے۔ وہ اسے ہمیشہ ٹال دیتی، کبھی کہتی تمہارے ابو کو تصویر کھینچوانے کا شوق نہیں تھا۔

”لیکن پھر بھی امی آپ کے پاس ان کی کوئی تو چیز ہوگی، جیسے کہ کوئی کپڑے یا جوتے یا گھڑی وغیرہ“۔ شائلہ نے ضدی لہجے میں پوچھا۔

”بس کہہ دیا ناں نہیں ہے میرے پاس تمہارے باپ کی کوئی چیز، اب خاموش ہو کر بیٹھ جاؤ“۔ فرزانہ نے اسے ڈانٹ دیا۔

”ٹھیک ہے تو پھر اب سے میں خاموش ہی رہوں گی، آپ سے کوئی بات ہی نہیں کروں گی“۔ شائلہ بری طرح رو ہانسی ہوتے ہوئے بولی۔

”اوہ کم آں سوٹ ہارٹ میں تمہیں دکھا دوں گی تمہارے ابو کی چیزیں مگر ٹل، ابھی بہت رات ہوگئی ہے سو جاؤ“۔ یہ سنتے ہی شائلہ اپنی ماں سے لپٹ گئی۔

”آپ واقعی دنیا کی سب سے عظیم ماں ہیں“۔ اس کے بعد شائلہ سونے لیٹ گئی۔

اگلے دن فرزانہ نے بازار سے چند ریڈی میڈ مردانہ کپڑے اور جوتے لئے اور وہ لے جا کر شائلہ کو دکھا دیئے۔ شائلہ انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور بڑی دیر تک اپنے ساتھ لگائے بیٹھی رہی۔

فرزانہ نے شائلہ کو یہ بات بتائی تھی کہ وہ کراچی میں رہتی تھی وہاں پر یونیورسٹی میں اس کے ساتھ اس کے ابو بھی پڑھتے تھے تو بس وہ دونوں ایک دوسرے کو چاہنے لگے مگر ہمارے ماں باپ ذرا پرانے خیالات

خوش دودھ پینے لگی، وہ واقعی بہت بھوکی تھی، فرزانہ سوچنے لگی کہ اب اسے ہی اس بچی کو سنبھالنا ہے، اس کی پرورش کرنی ہے، اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ لوگوں کے کپڑے ہی کر اس بچی کو پڑھائے لکھائے گی۔

اب تک وہ گاؤں میں رہتی تھی پر اب شہر میں رہنے کے طور طریقے سیکھے گی اس لئے اس نے کسی عورت کے گھر جا کر اس سے انگریزی سیکھنا شروع کر دی۔ فرزانہ ویسے تو بالکل اُن پڑھ بھی مگر انگریزی اس نے بڑی محنت سے سیکھی اور بہت جلد انگریزی لہجے میں انگلش فر فریو لے لگی۔ اس نے اپنے اوڑھنے پہننے کا انداز تک بدل لیا۔ گاؤں والوں کا سادہ لباس پہننے کے بجائے اس نے نہایت فینسی اور ماڈرن کپڑے پہننا شروع کر دیئے۔ اس کو دیکھ کر کہیں سے ایسا نہیں لگتا تھا کہ وہ ایک گاؤں کی رہنے والی عورت ہے۔ اس کا رنگ بھی گورا تھا اور شائلہ بھی خوب چوری چہنی تھی سو اسے دیکھ کر یہی لگتا تھا کہ وہ اس کی سگی ماں ہے۔ پھر فرزانہ نے فیشن ڈیزائننگ کا کورس بھی کر لیا شہر کے سب سے مشہور ادارے سے اور پھر کچھ ہی مہینے میں اس نے اپنا بوتیک کھول لیا۔ بوتیک اس نے شائلہ کے نام پر کھولا۔ بوتیک کے باہر بورڈ پر بڑا بڑا کر کے شائلہ بوتیک لکھا ہوا تھا۔ یہ بوتیک اس نے شہر کے کسی مہنگے علاقے میں کھولا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ اب شہر کی مشہور فیشن ڈیزائنر بن گئی تھی، لوگ اس کے بوتیک سے شاپنگ کرتے۔ اس دوران اس نے شائلہ کی پرورش کا بھی بہت خیال رکھا اور پھر جب شائلہ پانچ سال کی ہوئی تو اس نے اس کا داخلہ اسکول میں کرادیا۔ وہ اسے گاڑی میں لے کر اسکول پہنچی۔ فرزانہ نے بھی خود تو اسکول میں پڑھا نہیں تھا اس نے سنا ہی تھا کہ اسکول جا کر پہلے دن بچے

کے تھے انہیں پسند کی شادی کسی صورت گوارا نہیں تھی، سو اس لئے ہم بھاگ کر یہاں لاہور آ گئے اور کورٹ میرج کر لی۔

فرزانہ کی خواہش تھی کہ شائلہ بھی اس کی طرح فیشن ڈیزائنر بنے۔ اس نے بچپن سے ہی فرزانہ کو سینا پرنا سکھا دیا تھا اور وہ بڑی محنت سے یہ سب سیکھ رہی تھی۔ فرزانہ شائلہ پر فخر کرتی۔ جس محفل میں بھی بیٹھتی بڑے فخر سے بتاتی کہ وہ اتنی ذہین بیٹی کی ماں ہے۔

ایک دن جب شائلہ آٹھ سال کی ہوئی تو فرزانہ نے اس کی سالگرہ منانے کا اہتمام کیا۔ اس نے اپنے گھر میں سالگرہ منانے کا سوچا تھا مگر اس کی ایک سہیلی نے کہا۔

”بھی فرزانہ! تم میرے گھر اپنی بیٹی کی سالگرہ مناؤ۔“ اس نے اتنے پیار سے کہا کہ فرزانہ منع نہیں کر سکی۔

فرزانہ نے شائلہ کو اچھی طرح تیار کیا اور خود بھی بڑی اچھی طرح تیار ہوئی اور اپنی سہیلی نازیہ کے گھر پہنچی۔ نازیہ نے تو اس سے بڑھ کر تیاری کی ہوئی تھی۔ گھر کو بڑی اچھی طرح سجایا ہوا تھا اور کھانے کا تو

نہایت ہی شاندار اہتمام تھا۔ اس گھر میں نازیہ کی ایک کام والی بھی تھی، بڑی خوبصورت اور خوش اخلاق۔ فرزانہ نے غور کیا کہ اس کی شکل شائلہ سے مل رہی ہے۔ اس نے سوچا کہ اتفاق ہے۔ نازیہ نے بھی

اس بات کو محسوس کیا کہ فرزانہ کی بیٹی شائلہ ہو بہو اس کی کام والی کی کاپی ہے۔ مگر یہ سوچ کر خاموش رہی کہ کہیں اگر یہ بات فرزانہ کے سامنے بول دی تو وہ برا نہ منالے کہ ”تم میری بیٹی کو ایک ماسی سے ملارہی ہو۔“

”باجی آپ کی بیٹی بڑی پیاری ہے، آج سے کئی سال پہلے میری بھی بالکل ایسی ہی چھوٹی سی بیٹی تھی،

نامعلوم کون اسے اغوا کر کے لے گیا۔“ وہ اداس لہجے میں بولی۔ فرزانہ نے آؤ دیکھانہ تاؤ اور بھری محفل میں کھینچ کر ایک زوردار تھپڑ ماسی کے منہ پر رسید کیا اور پھر بولی۔

”تیرے منہ میں خاک بے غیرت کہیں کی، تو کیا چاہتی ہے کہ میری بیٹی کو کوئی اغوا کر لے، سوچ سمجھ کر بولا کر۔“ کام والی صالحہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس ساری صورتحال سے نازیہ گھبرا گئی۔

”ارے ایسی بات نہیں ہے فرزانہ، صالحہ دل کی بہت اچھی ہے، وہ تو بس تھوڑی صاف گو ہے، جو بات دل میں آتی ہے بول دیتی ہے، میں اسے سالوں سے جانتی ہوں یہ بڑی اچھی عورت ہے۔“ شائلہ بھی بڑے غور سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔ اسے اپنی ماں کی یہ حرکت پسند نہیں آتی تھی۔ اس نے کبھی اپنی ماں کو اس طرح نہ دیکھا تھا۔

شائلہ بڑی بہادر مگر حساس بچی تھی، اسے اس غریب عورت کی تذلیل ہوتا دیکھ کر بہت دکھ ہوا اور پھر گھر پہنچ کر اس نے بری طرح منہ پھلایا، اسے یوں دیکھ کر فرزانہ کو حیرت ہوئی۔

”اب تمہیں کیا ہوا شائلہ، کیا وہاں پارٹی میں مزہ نہیں آیا۔“

”مجھے آپ سے بات نہیں کرنی، آپ گندی ہیں۔“ شائلہ نے ناراضی سے کہا۔

”ارے بھی یہ اچانک ناراضی کیوں، کیا ہو گیا ہے بیٹا؟“

”آپ نے اس بے چاری ماسی کو تھپڑ کیوں مارا۔“ شائلہ نے اسی لہجے میں پوچھا۔

”اوہو تو یہ ناراضی اس لئے ہے، ایک تو تم بھی ناں بہت حساس ہو۔“ فرزانہ نے لاڈ سے کہا۔

”اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ بھی بہت حساس ہو اور

آپ نے اسے مارا۔“ شائلہ کی ناراضی هنوز برقرار تھی۔
 ”تو پھر بتاؤ کہ تمہاری ناراضی کیسے دور کروں۔“
 فرزانہ نے پیار سے اس کے بال سہلاتے ہوئے
 پوچھا۔

”اس سے سوری کریں۔“ شائلہ کا جواب سن کر
 فرزانہ کا چہرہ عجیب سا بن گیا۔
 ”یہ تم کیا باتیں کر رہی بیٹا، چھوٹے لوگوں سے
 معافی نہیں مانگتے۔“

”تو پھر جائے میں بھی آپ سے جب تک روٹھی
 رہوں گی جب تک آپ اس سے معافی نہیں مانگ
 لیتیں اور ہاں ایک بات اور، آپ کی یہ سوچ غلط ہے
 کہ غریب لوگوں سے معافی نہیں مانگتے۔“ شائلہ
 بولی۔

”کس نے سکھائیں تمہیں یہ بے کار باتیں۔“
 فرزانہ نے غصے سے اس کا بازو دباتے ہوئے کہا۔
 ”میں نے اپنی اسکول کی کتابوں میں پڑھا
 ہے۔“ شائلہ بولی۔

”افوہ! ایک تو یہ اسکول کی کتابیں بھی ناں۔“
 فرزانہ اپنا سر پکڑ کے بولی۔
 ”اچھا ٹھیک ہے اب جاؤ ہواپے کمرے میں،
 دور ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے۔“ شائلہ روٹی
 ہوئی اوپر بیڑھیاں پھیلا گئی اپنے کمرے میں بھاگ
 گئی۔

کافی دیر گزر گئی، فرزانہ نے اسے منانے کی
 کوشش کی اور نہ ہی وہ خود نیچے آئی، پریشان ہو کر
 فرزانہ ہی اوپر آ گئی اسے منانے، وہ اس کا دروازہ
 کھول کر اندر گئی اور بولی۔

”ٹھیک ہے ہم دونوں کل ہی نازیہ آنٹی کے گھر
 چلیں گے وہاں صالحہ ہوتی ہے اس سے معافی مانگ
 لوں گی میں، اب تو تم خوش ہوناں؟“

”بہت زیادہ۔“ یہ کہہ کر شائلہ فرزانہ سے لپٹ گئی۔

☆.....☆.....☆
 اگلے روز وہ دونوں نازیہ کے گھر گئیں۔ نازیہ
 نے انہیں دیکھتے ہی بڑی خوشدلی کا مظاہرہ کیا۔
 ”اچھا ہوا جو تم دونوں آگئیں لیکن برانہ مانو تو کیا
 میں پوچھ سکتی ہوں اتنی صبح آنے کی وجہ؟“

”وجہ تو بس یونہی سی ہے، نازیہ دراصل کل میں
 نے تمہاری کام والی عورت صالحہ کو پھنسا دیا تھا اس
 وجہ سے میں اس سے معافی مانگنے آئی ہوں، تم جلدی
 سے اسے بلا دو۔“ فرزانہ بول کر چپ ہوئی تو نازیہ
 حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”فرزانہ واقعی کتنا بڑا دل سے تمہارا، میں ابھی
 صالحہ کو بلاتی ہوں۔“ اتنا کہہ کر وہ مسکراتی ہوئی صالحہ کو
 بلانے چلی گئی۔ واپس آئی تو صالحہ ساتھ تھی اور کچھ
 گھبرائی ہوئی سی لگ رہی تھی۔

”سلام بی بی جی!“ اس نے ادب سے سلام کیا۔
 جواباً فرزانہ نے گردن اٹھا کر سر کو ذرا سی جنبش دی۔

”میں تم سے معافی مانگنے آئی ہوں صالحہ! مجھے
 معاف کر دو۔“ فرزانہ چہرے پر تلخ مسکراہٹ سے بولی۔
 ”یہ خود سے کہاں سے آ رہی تھیں انہیں تو میں
 زبردستی لائی ہوں بڑے پاپڑیل کے۔“ شائلہ بھاگتی
 ہوئی گئی اور صالحہ کے گلے میں بائیں ڈال دیں۔

”بی بی جی مجھے آپ کی بیٹی اپنی بیٹی فریجی کی طرح
 اچھی لگتی ہے، وہ بھی بالکل اسی کی عمر کی ہے، ایسے ہی
 ہوگی کوئی آٹھ سال کی۔“ صالحہ زمین پر بیٹھ گئی تو شائلہ
 بھی اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔

”شائلہ یہ کیا کر رہی ہو، وہ تمہارے بیٹھنے کی جگہ
 نہیں ہے، سارے کپڑے خراب وہ جائیں گے، اٹھو
 وہاں سے فوراً اور یہاں صوفے پر آ کر بیٹھو۔“ فرزانہ
 ترخ کر بولی۔

ہمارے گھر کام نہیں کرنا شروع کر دیتیں۔“

فرزانہ کو لگا بچی ہے یونہی ضد کر رہی ہے ابھی تھوڑی دیر میں خود ہی مان جائے گی مگر جب شاملہ نہ دوپہر کے کھانے پر آئی اور نہ ہی رات کے کھانے پر آئی تو فرزانہ کو فکر کھانے لگی۔ اس کو لگا کہ یہ عورت اس کی بیٹی کو اس سے چھین رہی ہے۔

”نہ معلوم کیا جادو کر دیا اس جادو گر نے میری بچی پر جو یہ مجھے بھول کر اپنی ماں کو بھول کر ایک دوسری عورت کے پاس جا رہی ہے۔“ فرزانہ دل میں سوچنے لگی، مگر پھر اسے خیال آیا کہ شاملہ ابھی چھوٹی بچی ہے اور بچوں کو پیار محبت سے بہلایا جاسکتا ہے۔ وہ صالحہ مکاری سے شاملہ کا دل جیتنے کی کوشش کر رہی ہے اس نے اسی وقت اپنے ڈرائیور کو بھیج کر شاملہ کے لئے ایک پیاری سی گڑیا اور پیڑا منگوایا۔

اس نے جا کر شاملہ کے دروازے پر دستک دی، شاملہ نے فوراً ہی دروازہ کھول دیا، فرزانہ نے بڑے پیار سے شاملہ کو گڑیا اور پیڑا دیا مگر اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے وہ چیزیں لینے سے صاف انکار کر دیا۔ مجبوراً فرزانہ کو شاملہ کی ضد کے آگے ایک بار پھر ہتھیار ڈالنے پڑے۔ مگر اب کی بار اس نے بھی ایک شرط رکھ دی اور وہ یہ کہ صالحہ کے بجائے اس کی بیٹی فریہ اس گھر میں کام کرے گی۔

☆.....☆.....☆

فرزانہ کو صالحہ سے ڈر لگنے لگا تھا۔ اسے یوں لگتا تھا کہ کہیں وہ عورت ایک دن اس کی بیٹی کو اغوا نہ کر لے۔ اس کے ساتھ ہی ماضی کی یادیں تازہ ہو گئیں۔ راشد سے محبت پھر نکاح پھر گاؤں سے ٹرین کا سفر، اولاد نہ ہونا اور پھر بچی کو اغوا کرنا اور پھر راشد کا اسے طلاق دینا۔ یہ سب سوچ کر کہ وہ خود بھی شاملہ کو اغوا کر کے لائی تھی، اس کی روح کانپ اٹھی۔ جبکہ

”چلے آئی! آئیں اوپر صوفے پر چل کر بیٹھتے ہیں۔“ شاملہ نے لاڈ سے کہا اور صالحہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے فرزانہ کے برابر بٹھا دیا۔ فرزانہ تو ایک دم جیسے کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹی اور اس کے ساتھ ہی اپنی جگہ سے بڑی پھرتی سے اٹھی اور شاملہ کا ہاتھ تھام کر بولی۔

”اچھا نازیہ ہم اب چلتے ہیں پھر کسی دن آئیں گے۔“ اتنا کہتے کے ساتھ ہی وہ جانے لگی۔

”ارے رکو تو فرزانہ، کچھ ٹھنڈا گرم تو پیتی جاؤ، اب میں اتنی بھی بے مروت نہیں ہوں کہ یونہی سوکھے منہ تمہیں واپس لوٹا دوں۔“ نازیہ اسے جاتا دیکھ کر جلدی سے بولی۔

”ارے ایسی بات نہیں ہے نازیہ میں جانتی ہوں تمہارا دل بہت بڑا ہے مگر مجھے کچھ اور ضروری کام بھی ہیں، آج نہیں رک سکتی پھر کسی دن صبح، ٹھیک ہے ناں؟“ فرزانہ مسکرا کر بولی۔

”چلو جیسے تمہاری مرضی۔“ نازیہ نے مسکرا کر کندھے اچکا دیئے۔

فرزانہ شاملہ کو تقریباً کھینچتی ہوئی کمرے سے باہر لے گئی۔ صالحہ بڑی حسرت بھری نظروں سے شاملہ کو جاتا ہوا دیکھتی رہی۔

گھر پہنچ کر شاملہ نے ایک نئی ضد شروع کر دی اور وہ یہ کہ صالحہ ان کے گھر میں بھی کام کرے گی۔ یہ سنتے ہی جیسے فرزانہ کو آگ ہی لگ گئی، وہ شدید طیش میں آتے ہوئے بولی۔

”شاملہ! بس بہت ہو گئے تمہارے خمرے اب سیدھی طرح اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔“ فرزانہ کی اس بات کا الٹا اثر ہوا، شاملہ نے مزید ضد شروع کر دی۔

”تو پھر ٹھیک ہے اب میں کل سے اسکول ہی نہیں جاؤں گی اور نہ ہی کچھ کھاؤں گی اور یہ بھوک ہڑتال تب تک جاری رہے گی جب تک صالحہ آئی

فریحہ اور شائلہ اب ماشاء اللہ جوانی کی حدود میں داخل ہو چکی تھیں اور فرزانہ وقت کے ساتھ ساتھ بوڑھی ہونے لگی تھی۔ فرزانہ نے چاہا کہ شائلہ کا انٹرکا داخلہ کسی بڑے مہنگے کالج میں کروائے مگر یہاں تو معاملہ ہی کچھ کا کچھ ہو گیا۔ شائلہ نے صاف کہہ دیا کہ وہ تو فریحہ والے کالج میں داخلہ لے گی۔

”تم کیا پاگل ہو گئی ہو، کبھی وہاں جا کر نظام دیکھو اس کالج کا، پینے کو صاف پانی نہیں ہے، کینٹین میں گندا کھانا بن رہا ہے، کب کی پرانی میزیں اور کرسیاں رکھی ہیں، صفائی تک کا تو نظام ٹھیک نہیں ہے وہاں پر“۔ فرزانہ پھٹ پڑی۔

”فارگاڈ سیک مہاپلیز! فریحہ میری بیسٹ فرینڈ کی طرح ہے، میں بھی اسی کے ساتھ پڑھنا چاہتی ہوں“۔

”افوہ ایک تو تم بھی ناں بس ہر وقت فریحہ، فریحہ کرتی رہتی ہو نا معلوم کیا جادو کر دیا ہے اس عورت نے تم پر کہ مجھ سے تم کو چھین لیا ہے اور ہاں میری ایک بات یاد رکھو، ہر شخص کی بیسٹ فرینڈ اس کی ماں ہوتی ہے، تمہاری بیسٹ فرینڈ میں ہوں، تمہیں کسی اور کی ضرورت نہیں ہے، میں ہر گز بھی تمہیں ایسے گھٹیا اور بے کار کالج میں نہیں پڑھنے دوں گی“۔ فرزانہ ڈپٹ کر بولی۔

”تو پھر ٹھیک ہے فریحہ اس کالج میں پڑھے گی جس میں آپ چاہتی ہیں کہ میں پڑھوں، ہم دونوں اکٹھے وہاں پڑھیں گے اور فریحہ کی پڑھائی کے اخراجات بھی آپ کو اٹھانے ہوں گے“۔ شائلہ نے یہ کہہ کر پیار سے فرزانہ کے گلے میں بانٹیں ڈال دیں۔

”اچھا بابا ٹھیک ہے لیکن تم اس کو زیادہ لفٹ نہ کرایا کرو، وہ اچھی لڑکی نہیں ہے“۔ فرزانہ نے ہار مانتے ہوئے کہا۔

دوسری طرف شائلہ فرزانہ سے لپٹی اسے بار بار تھینک یو بول رہی تھی مگر اسے تو جیسے کچھ ہوش ہی نہیں تھا۔ وہ تو اپنی ہی سوچوں میں گم تھی۔

اگلے دن سے ہی فرزانہ نے فریحہ کو کام کرنے کے لئے رکھ لیا مگر وہ اس سے صرف اپنے کمرے کا ہی کام کرواتی اپنے سامنے اور ہر بات پر اسے جھڑپتی رہتی۔ کبھی کبھی تکیہ صبح سے رکھو تو کبھی بستی بستر کی چادر درست کرو۔ مطلب اس کے ہر کام میں نقص نکالتی رہتی جبکہ دوسری طرف شائلہ اسکول کی پڑھائی سے فارغ ہوتے ہی فریحہ کے ساتھ کھینے لگ جاتی۔

پھر کچھ ہی عرصے میں عید کا موقع آیا۔ فرزانہ نے ڈھیر سارے کپڑے اپنے اور شائلہ کے لئے بنائے اور پھر جب عید والے روز شائلہ کو ڈھیر دن عیدی ملی تو وہ اس نے ساری لے جا کر فریحہ کو دے دی کیونکہ اس کی وجہ ہی کچھ ایسی تھی۔ فریحہ کو عیدی نام کی کوئی چیز نہیں ملتی تھی۔ وہ ایک غریب عورت کی بیٹی تھی۔

فرزانہ کو جیسے ہی اس بات کا علم ہوا تو وہ غصے سے بیچ و تاب کھاتی فریحہ کے پاس پہنچی جو اس وقت شائلہ کے ساتھ کھیل رہی تھی۔

”چور کہیں کی میری بیٹی کے پیسے چرا لئے تم نے“۔ اتفاق سے اس دن صالحہ بھی آئی ہوئی تھی، گھبرا کر بولی۔

”خدا کی قسم بی بی جی میری بیٹی چور نہیں ہے، آپ کی بیٹی نے خود اپنی عیدی فریحہ کو دی تھی“۔

”تو چپ کر ڈائن کہیں کی، ہر وقت میری بیٹی کو کھانے کے لئے تیار بیٹھی رہتی ہے“۔ فرزانہ ٹیش میں آتے ہوئے بولی لیکن شائلہ کا گڑا موڈ دیکھ کر ایک بار پھر فرزانہ نے صالحہ سے معافی مانگ لی۔

وقت بڑلگا کر اڑ رہا تھا۔

پھر دونوں کا داخلہ شہر کے مہنگے ترین کالج میں ہو گیا۔ صالحہ فرزانہ کو شکریہ کہنے گھر آئی۔

”بی بی جی سچ کہتی ہوں آپ کے واقعی بڑے احسان ہیں مجھ پر، بی بی جی میری بیٹی بھی بالکل آپ کی شائلہ کی طرح تھی، بالکل اسی کی ہم شکل، دونوں جڑواں بہنیں تھیں، میں بیوہ عورت تھی، لوگوں کے گھر کام کر کے اپنی بچیوں کا پیٹ پالتی تھی۔ میری بیٹی کے اغوا کے بعد میری ملاقات چائے کے ایک چھوٹے سے ہوٹل کے مالک سے ہوئی۔ وہ مجھے پسند کرنے لگا۔ اس نے بتایا کہ اس کی پہلی بیوی کسی کی بیٹی کو پارک میں سے اغوا کر کے لگئی تھی اور پھر اس نے غصے میں آکر اسے طلاق دے دی۔ پھر ہم دونوں نے شادی کر لی۔“ صالحہ بول کر چپ ہوئی تو فرزانہ کو لگا کہ یہ داستان کچھ سنی سی ہے، اس نے جھٹ پوچھا۔

”تمہارے شوہر کا نام کیا ہے صالحہ؟“

”میرے شوہر کا نام راشد ہے۔“ فرزانہ پر جیسے بجلی سی گری۔

”مجھے فوراً اس سے ملواؤ۔“ وہ اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

”لیکن کیوں بی بی جی۔“ صالحہ نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”اسے نوکری دلاؤں گی اچھی سی۔“ اس نے بہانہ بنایا۔

”بہت بہت شکریہ پیگم صاحبہ! بڑی مہربانی۔“

جب صالحہ راشد کو لے کر فرزانہ کے گھر پہنچی تو راشد کو دیکھ کر فرزانہ دنگ رہ گئی اور خوف سے تھر تھر کانپنے لگی کیونکہ یہ راشد وہی تھا یعنی اس کا سابقہ شوہر۔ وہ راشد جس کے ساتھ وہ ٹرین میں بھاگ کر لاہور آئی تھی، وہ راشد جس کی وہ کبھی بیوی ہوا کرتی تھی، شدت غم سے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں، تب ہی

راشد پھٹ پڑا۔

”صالحہ! یہ تو مجھے کس گھر میں لے آئی، اسی بد ذات عورت نے تو تیری بیٹی اغوا کی تھی۔“

”کیا کہا؟ تو یعنی شائلہ میری بیٹی ہے۔“ شائلہ اور فریحہ جو آپس میں ایک طرف بیٹھی باتوں میں مصروف تھیں اب حیرت سے منہ کھولے کھڑے ہو کر انہیں دیکھ رہی تھیں۔

اچانک ہی صالحہ لڑکھڑا کر گر پڑی تو شائلہ نے لپک کر اپنی اصلی ماں کو تھام لیا۔

”امی خود کو سنبھالنے، دیکھئے آپ کی بیٹی آپ کو مل گئی۔“ وہ زار و قطار روتے ہوئے بولی۔ فرزانہ جو بت

بنی دیکھ رہی تھی ایک دم ہی سے جیسے ہوش میں آگئی۔

”شائلہ! کیا کر رہی ہو، بکواس کرتا ہے یہ آدمی اور یہ عورت۔“ تم میری بیٹی ہو میں تمہیں اغوا کر کے نہیں لائی تھی، میں تو تمہاری ماں ہوں۔“

”تم میری ماں نہیں ہو، تم مجھے اغوا کر کے لائی تھیں اور نہیں تو میڈیکل کی رپورٹس سے ثابت ہو جائے گا۔“ شائلہ فرزانہ کا ہاتھ جھڑکتے ہوئے بولی۔

راشد نے فریحہ، شائلہ اور صالحہ کو ساتھ لیا اور اپنے چھوٹے سے گھر میں لے آیا۔

اچانک ہی سے فرزانہ پر نیم بے ہوش طاری ہونے لگی۔ کہ سچ اس کا دم یہیں نکل جائے گا۔ وہ لڑکھڑا کر گری اس نے سنبھلنے کی بہت کوشش کی لیکن

اس کا سر میز سے ٹکرایا اور خون کا فوارہ ابل پڑا۔ اسے اس وقت احساس ہوا کہ وہ بالکل تنہا رہ گئی ہے۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اس کے پاس کچھ نہیں ہے۔

اس کے پاس نہ ماں باپ کی محبت رہی نہ راشد کی اور اب نہ ہی شائلہ کی محبت رہی۔ اسے شدت سے احساس ہوا کہ وہ خالی ہاتھ رہ گئی ہے۔

☆.....☆.....☆

ایقان علی

مسلم

(قارئین! پچھلی دو اقساط کی ترتیب آگے پیچھے ہونے کی وجہ سے اس ماہ ہم اس ناول کی قسط دوبارہ شامل
اشاعت کر رہے ہیں)
”دفع کرو اس ہر دلعزیزی کو“۔ احمر نے ناک سے مکھی اڑائی۔



”جس کو دیکھو میرے دماغ کی بات کرتا ہے میرے کومل سے دل میں کوئی نہیں جھانکتا جس میں حسناؤں کے لئے پیار ہی پیار ہے۔“

”تو کسی حسینہ سے کہہ دو دل کی بات۔“ مشورہ۔

”کیسے کہوں یار! ذرا جو غور سے دیکھو تو گھورنے لگ جاتی ہیں، سیٹی بجاؤ تو سینڈل اتار لیتی ہیں، اف میرے اللہ! میرا کیا ہوگا۔“ وہ کہتا چلا گیا۔

”تم سناؤ لیڈی! تمہیں مل گیا تمہارے خوابوں کا شہزادہ پرنس چارمنگ، تمہارا آئیڈیل۔“ اس کی بات پر وہ ذرا مسکرائی اور بال سیدھے کے کئے۔

”آئیڈیل ایسے ہی تھوڑی مل جاتے ہیں، وہ بہت خاص ہوتے ہیں کسی دن اچانک سے ہماری زندگی میں آتے ہیں اور سیدھے دل میں اتر جاتے ہیں، اور بس پھر ہر پرائیویسی ختم! نیندیں ان کی خواب ان کے یادیں

دوسری قسط



ان کی سوچیں ان کی۔ احمر نے منہ بنایا۔
 ”ایسا رانجھا کہاں ملے گا تمہیں گلوڑ مارا۔“
 ”کہیں تو ہوگا۔“ وہ کھلکھلائی۔

☆☆☆☆

اس دن جب وہ سو کر اٹھا تو صبح کے آٹھ بج رہے تھے چھٹی کا دن تھا تو خیر تھی نہ ب نہا کر دھونے کپڑے بدل پن میں تھی۔
 ”نہب!“ اس نے آواز دی تھی۔

”میں ابھی ناشتہ لائی۔“ وہ وہیں سے پکاری۔
 ”دفع کرو ناشتہ! جلدی سے تیار ہو جاؤ باہر چلتے ہیں۔“
 ”لیکن ناشتہ.....“

”باہر کر لیں گے۔“ آدھے گھنٹے بعد وہ ایک اوپن ریسٹورنٹ میں بیٹھے حلوہ پوری سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

☆☆☆☆

”ہیلو سویت ہارٹ!“ فلک کے چہرے کے زاویے بگڑے وہ تنگ آ چکی تھی۔
 ”مسئلہ کیا ہے مسٹر.....؟ کیا بے ہودگی ہے یہ.....؟ جب کہہ دیا کہ روٹنگ نمبر تو پھر بار بار ایس ایم ایس اور فون کر کے تنگ کرنے کی کیا تک ہے.....؟“ اس نے کال کر کے اچھی خاصی جھاڑ کی اور فون آف کر دیا شام میں آن کیا تو ڈھیروں پیغامات موجود تھے شاعری اور تجبانے کیا کیا۔
 ”منحوس آدمی! میں ان چھپوڑے ہسٹنڈوں میں نہیں آنے والی۔“
 ”تو کونسے جال میں آؤ گی.....؟“ فلک کا پی پی چڑھ گیا۔

”تکلیف کیا ہے.....؟“

”تم تھیک کر دو گی.....؟“

”ہاں.....“

”راتوں کو نیند نہیں آتی، طبیعت عجیب سی رہتی ہے، ایک بے نام اداسی طاری رہتی ہے، یاسیت سی حواسوں پر سوار ہے کسی کام میں دل نہیں لگتا، بھوک پیاس بھی اڑ گئی ہے۔“ اتنا لمبا افسانہ نما پیغام پڑھ کر وہ مسکرا دی۔

”لکھتے تجویز کریں ڈاکٹر صاحبہ!“

”دیکھو مسٹر! مجھے روٹنگ نمبر سے باتیں منکا نا پسند نہیں ہے۔“

”تو روٹنگ نمبر کو رائٹ نمبر بنا لو۔“ وہ ششدر رہ گئی۔

”مجھ سے دوستی کرو گی.....؟“

”نہیں.....“

”پلیز.....، التجاء“

”نہیں..... نہیں..... نہیں۔“ حتی انداز۔

”پلیز..... پلیز..... پلیز.....“

”بائے.....“ اس نے موبائل رکھا اور باورچی خانے میں آگئی، ابو آنے والے تھے۔

☆☆☆☆

”میں کیا کروں فیضان! جتنی مرضی محنت کر لوں، احمر بھائی کی طرح فرسٹ نہیں آ پاتا، ابو سے ہر بار ڈانٹ سنا پڑتی ہے، میں ہر بار اتنی زیادہ محنت کرتا ہوں لیکن پھر وہی حل“۔ وہ بریک کے دوران فیضان کے ساتھ بیٹھا افسردگی سے کہہ رہا تھا۔

”کوئی بات نہیں! محنت جاری رکھو، فرسٹ بھی آ جاؤ گے، مجھے دیکھو میں بھی آج تک فرسٹ نہیں آیا لیکن کبھی نا بھی آ جاؤں گا“۔ احمد خاموشی سے سچ باکس کھولنے لگا۔

”میرے پاپا کہتے ہیں محنت کرنا انسان کا کام ہے، آگے پھر صلہ دینا اللہ تعالیٰ کا کام ہے“۔ فیضان لقمے لیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”تمہارے ابو بھی کچھ کہتے ہوں گے بتاؤ ناں مجھے“۔ احمد لقمے لیتے لیتے رکا، وہ سوچ رہا تھا، اپنے ابو کی کہی کوئی ایسی ہی حکمت بھری، امید دلانی بات، کوئی ایسی جو صلہ دیتی۔

”وہ کہتے ہیں جو فرسٹ نہیں آتا، وہ میری نظر میں ٹیل ہے“۔ فیضان نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر زور سے ہنسا۔

”اچھا جوک تھا“۔

☆☆☆☆

فری پیریڈ تھا، کیسٹری والے سر چھٹی پر تھے، تبھی وہ باہر گراؤنڈ میں آ بیٹھا اور کتاب کھول لی۔

”آبا! انتہائی ناپسند آواز پر وہ چونکا اور سامنے دیکھا“ ”جوڑی“ سامنے کھڑی تھی (عثمان اور احمر)

”یار عثمان!“ احمر اپنے جوڑی دار سے مخاطب تھا۔

”کچھ لوگ سنڈے کو بہت انجوائے کرتے ہیں، مطلب اتنا زیادہ کرنا شے بھی اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ کرتے ہیں، ڈھابے پر حلوہ پوری کر کے“۔ وہ دونوں زور سے ہنسے، حمزہ ضبط کئے بیٹھا رہا تھا۔

”چلو یہ بھی ایک نئی روایت بن گئی گرل فرینڈ کو ڈیٹ پر حلوہ پوری کھلانا، ورنہ ہم نے تو کینڈل لائٹ ڈنر سنا تھا، بیچ سنا تھا، یہ ناشتہ اور وہ بھی حلوہ پوری“۔ عثمان نے اس کا ہاتھ دبایا، اسے غصہ چڑھتا دیکھ رہا تھا وہ۔

”وہیے لوگوں کی گرل فرینڈ کو کبھی لوگوں میں نجائے کیا نظر آتا ہے، وہ جس کی میں بات کر رہا ہوں ناں جو حلوہ پوری کی ڈیٹ پر تھے قسم سے لنگور اور پری کی جوڑی تھی۔ لڑکا ایسا پینڈو اور لڑکی اف کیا غضب کا پیس تھی“۔ بس وہ حمزہ کریم کے صبر و برداشت کی حدھی، وہ یکدم اٹھا اور ناں اسٹاپ بولتے احمر کی ناک پر مکا دے مارا، عثمان گنگ سا کھڑا رہ گیا۔

”آ سندہ اپنی گندی زبان سے میرے یا میرے سے جڑے کسی بھی انسان کے بارے میں بکواس مت کرنا“ اور میری بیوی کے بارے میں خاص طور پر“۔ اس کی بات پر بھٹے ہوئے ہونٹ سے رستے خون کو صاف کرتا احمر یوں شا کڈ رہ گیا جیسے دجال دیکھ لیا ہو، عثمان کی حالت بھی مختلف نہیں تھی۔

”بیوی.....؟“ حمزہ اپنی کتا میں سیٹ کر جا چکا تھا۔

”عثمان! تو نے ابھی کیا سنا ہے.....؟“ عثمان نے جواب اپنے کان میں انگلی ڈال کر صاف کیا۔

”کیا تو نے بھی وہی سنا جو میں نے سنا.....؟“

”کہیں یہ خواب تو نہیں.....؟“

”واقعی..... مطلب بیوی..... مطلب گھر والی.....؟ وہ جو گھر میں روٹی پکاتی ہے.....؟ اجی سنتے ہو کہنے والی.....؟ واقعی.....؟“ وہ دونوں شاکد تھے۔

☆☆☆☆

”ذرا تو مروت سیکھو! تم یہ مہرتے ہیں تو کیا ماری ڈالو گے.....؟“ فلک کا دل زور سے دھڑکا۔
 ”سو گئی ہو کیا.....؟“ فلک نے کروٹ لی اور سر پر لحاف تان لیا۔
 ”ساری دنیا سو گئی آخر! بس جاگتا رہا میں اور میری تنہائی“۔ دل پھر سے دھڑکا۔
 ”سنو! دوستی کر لو ناں.....“

”کیوں.....؟“ کانپتے ہاتھوں سے جوابی پیغام ٹائپ کیا۔
 ”یہ نہیں کیوں، کر لو ناں“۔
 ”اگر ناں کہوں تو.....؟“
 ”میں کہنے ہی نہیں دوں گا“۔
 ”تم کیا کر لو گے.....؟“

”تمہارے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ لوں گا اور تب تک نہیں ہٹاؤں گا جب تک ہاں نہیں کہہ دو گی“۔ دل دھک دھک کر رہا تھا۔

”چلو پھر کرو تیریاں منہ بند کرنے کی“ میں نہیں کہنے والی ہوں۔
 ”بڑی ظالم ہو قسم سے“۔ باہر رات تیزی سے گزر رہی تھی تاریکی اپنے پر پھیلا رہی تھی۔
 ”دوست“ کہاں لکھیں.....؟“
 ”میں تمہاری دوست کب سے ہو گئی.....؟“
 ”ابھی ہے“۔

”لیکن میں نے“ ہاں“ نہیں کہا۔
 ”تم نے“ ناں“ بھی نہیں کہا۔“ وہ ٹائپ کرتے کرتے رکی۔
 ”پلیز دوست بن جاؤ“۔ وہ نجانے کیوں مسکرا رہی تھی دل نجانے کیوں بری طرح سے دھڑک رہا تھا پسینے نجانے کیوں آگئے تھے۔

”دوست.....؟“ سوال پھر سے آیا۔
 ”ہاں“۔ یک لفظی مختصر ترین جواب۔
 ”محبت ہو گئی تم سے“

☆☆☆☆

ندا چھٹی کے بعد کالج سے نکلی تھی آج اس کی وہ دوستیں چھٹی پر تھیں جن کے ساتھ وہ گھر جاتی تھی اسی لئے وہ اکیلی گھر کی طرف جا رہی تھی چھوٹی سڑک سے جب وہ مین روڈ پر آئی تو اچانک اس کے پاس سے بائیک گزری اس بائیک پر سوار لڑکے نے ہولے سے اس کا کندھا چھوا تھا۔

”آئے ہائے سو بیو“۔ وہ زور سے چونکی اور اچھل پڑی بائیک والا انھوت سے ہنسا اور ہنستا چلا گیا۔
 ”کتے“ حرام خور“۔ وہ نجانے کون تھا جو سامنے سے بائیک پر آیا اور اس دوسری بائیک والے کو گردن سے پکڑ

کر زمین پر پٹخ دیا۔
 ”لڑکیوں کو چھیڑتا ہے سالے! منہر جا“۔ لحوں میں مجمع اکٹھا ہو گیا، چھیڑنے والے کی اچھی خاصی دھلائی ہو گئی وہ پہلے تو کھڑی تھر تھرا کا پتی رہی لیکن پھر دل مضبوط کر کے آگے بڑھ گئی۔
 ”معافی مانگنا باجی سے“۔ کسی نے اس آدمی کو اس کے قدموں میں دیے بار۔
 ”معاف کر دو باجی!“ اسے معافی مانگتے دیکھ کر اس نے بمشکل ہنسی روکی تھی۔
 ”چلیں میں آپ کو ڈراپ کر دوں“۔ وہ سامنے کھڑا آفر دے رہا تھا۔ پرنس چارمنگ آئیڈل۔

☆☆☆☆

”حمزہ!“ وہ لاہری سے نکل رہا تھا جب وہ پیچھے سے آیا حمزہ رکاوٹ مڑ کر دیکھا عثمان سامنے کھڑا تھا۔
 ”دراصل..... وی آر کٹنی“ مطلب میں اور احمر..... ہمیں افسوس ہے کل کے لئے جو بھی اس نے اول فول بکا، سو ری بار! اس کا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا نہیں تھا۔“
 ”کوئی بات نہیں“ حمزہ نے رمان سے کہا تھا۔
 ”وہ بھی شرمندہ ہے، تمہارا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی اس میں“۔ اور ویسے بھی سامنے آتا بھی تو بونگیاں ہی مارتا۔

”کوئی بات نہیں یار!“ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔

☆☆☆☆

وہ دونوں بھائی باہر آئس کریم کھانے کے لئے آئے تھے۔
 ”بھائی یہ ہونٹ پر کیا ہوا.....؟ لگتا ہے کسی نے مکا مارا ہے“۔ احمد نے پوچھا تو وہ شہنشاہ۔
 ”کچھ نہیں وہ دراصل ہمارے کان کے باہر کچھ لڑکے میرے دوست سے لڑ رہے تھے“ میں نے اپنے دوست کو بچایا تو ہاتھ پائی ہو گئی، لیکن خیر میں نے بھی بڑی دھلائی کی ان کی ایک کی تو میں نے ٹانگ توڑ دی۔“
 احمد زور سے ہنسا۔
 ”جی جی چھوڑتے رہے! چھوڑنے میں کونسا پیسے لگتے ہیں۔“
 ”شٹ اپ“۔ احمد نے رعب جھاڑا تھا، بھی وہ دوڑکیاں پارلر میں داخل ہوئیں اور ان کے برابر والی میز پر آ بیٹھیں احمد نے انہیں دیکھ کر سیٹی ماری تھی جواباً انہوں نے ٹھورا۔
 ”بھائی پلیز مت کریں وہ روتوڑ دیں گی“۔ احمد منمنایا۔
 ”ڈونٹ وری! میں ہوں ناں۔“

”آپ ہیں یہی تو مسئلہ ہے“۔ احمد نے دوبارہ سے سیٹی بجاتی لوگ مڑ مڑ کر اسے دیکھنے لگے تھے۔
 ”سینڈل دیکھیں بھائی! اہل چیک کریں اندر تک ہڈی بھی ٹوٹ جائے گی دماغ کی“۔ بھی ایک ویٹران کی میز پر آیا تھا۔
 ”سر!“

”جی.....“ احمد نے شان سے اسے دیکھا۔
 ”بی ہیو یو سیلف! ایسا نا ہو کہ ہمیں آپ کو دھکے دے کر باہر نکالنا پڑے“۔ اس کی مسکراہٹ سمٹی اور احمد ہولے سے ہنسا۔

☆☆☆☆

”دوست“۔ وہ کیمسٹری کا ٹیسٹ تیار کرنے میں مصروف تھی جب اس کا موبائل بجا۔
 ”کہاں گم ہو بات کرؤ“۔
 ”میں تمہاری طرح ویلی اور نکمی نہیں ہوں مجھے اور بھی بہت کام ہیں ایس ایم ایس کرنے کے علاوہ۔“
 ”اف ظالم.....“ وہ جواب دیئے بنا پڑھتی رہی تھی۔
 ”کب فری ہو گی تم.....؟“
 ”پتہ نہیں۔“ وہ کتنا الجھنچھلایا ہو گا یہ جواب پڑھ کر وہ سوچ کر مسکرا دی۔

☆☆☆☆

اس کا آپ آن تھی وہ پیٹ کے بل لیٹی، دونوں کہیاں بیڈ پر ٹکائے پوری تفصیل سے اسے سارا قصہ نمک مرچ لگا کر سنارہی تھی اور وہ انتہائی بد مزہ دکھائی دے رہا تھا۔
 ”اور تم بے حیا لڑکی اس پر اے مرد کی موٹر سائیکل پر بیٹھ کر گھر آ گئیں.....؟“ ندانے اسے گھورا۔
 ”نہیں جی! میں نے اسے کہا تھینک یو کوئی ضرورت میں چلی جاؤں گی لیکن وہ اصرار کرنے لگا۔“
 ”اور تم بے حیا لڑکی اس پر اے مرد کی موٹر سائیکل پر بیٹھ کر گھر آ گئیں.....؟“ احمر نے اس کی بات کاٹی۔
 ”پوری بات تو سن لو! میں وہاں سے بس اسٹاپ پر آ گئی کہ بس سے گھر چلی جاتی ہوں لیکن اس دن ساری بسیں بھی جیسے ہڑتال پر تھیں۔“

”اور تم بے حیا لڑکی اس پر اے مرد کی.....“

”شٹ اپ! جسٹ شٹ اپ بے ہوؤ آدمی“۔ ندانے چلا کر اس کی بات کاٹ دی۔

”گندے آدمی! رکشے سے گھر آئی ہوں میں۔“ احمر نے سکھ کا سانس لیا۔

”پھر دفع کرو ناں! بھول جاؤ اسے۔“

”ارے واہ! کیسے بھول جاؤں وہ بندہ بھولنے والی شے تھوڑی تھا میرا خواہوں کا شہزادہ۔“

”فٹے منہ۔“ احمر نے منہ بنایا۔

”ساری دنیا ویلی ہو گئی ہے شاید فلمیں دیکھ دیکھ کر دماغ خراب ہو گئے ہیں سب کے ذرا سا کسی کو لڑکی کو چھیڑتے دیکھا اور پہنچ گئے ہیرو بننے، ہونہہ..... مختصر زیادہ خوش مت ہو! ایسے رائج آخر میں زہر کے لڈو ہی کھاتے ہیں۔“ ندانے کو تپ چڑھی۔

”بد تمیز! دغ ہو جاؤ۔“ اس کا آپ بند..... رابطے منقطع۔

☆☆☆☆

”دوست! آداب عرض ہے۔“

”فرماؤ!“۔ وہ جلی بھی پی پھی تھی۔

”یار! بھلا نام کیا بتایا تھا تم نے.....؟ رخشندہ رضیہ۔“

”شٹ اپ۔“

”تو پھر کیا تھا.....؟“ فلک جی بھر کر بد مزہ ہوئی۔

”فضول آدمی بھاڑ میں جاؤ اور اب دوبارہ ٹیکسٹ مت کرنا۔“ آگے پیچھے بیانات کی برسات ہو گئی۔

”اچھا سوری..... اسمائل کروڈ پلینز“۔ وہ بنا جواب دیئے بیٹھی رہی۔
 ”فلک تک چل ساتھ میرے“۔ مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی تھی۔

☆☆☆☆

حمزہ کریم کی زندگی پہلے جیسی ہرگز نہیں رہی تھی اب کوئی اور بھی تھا جس کی زندگی اس کے ساتھ مشروط ہو گئی تھی اب جب جب اسے کھانا تھا تو کسی کو کھانا بھی تھا، سوٹا جاگنا تھا تو کسی دوسرے کے سونے جاگنے کا بھی خیال کرنا تھا، ابھی ابھی نینب اسے چائے کا کپ دے کر گئی تھی اس نے پہلے چائے کو دیکھا اور پھر چائے لانے والی کو صبح والا کاج کا واقعہ ذہن میں تازہ ہو گیا۔ کیوں پڑھا اسے اتنا غصہ کہ احمر کے مکا بڑو یا؟ اس نے ترجمہی نظروں سے نینب کو دیکھا جو کپڑے تہہ کر کے رکھ رہی تھی وہ اس کی عادت بن رہی تھی۔
 ”کیا دیکھ رہے ہو.....؟“ اس کو مسلسل دیکھتا دیکھ کر وہ اب بھی۔
 ”تمہیں دیکھ رہا ہوں“۔
 ”کیوں.....؟“

”کیا مطلب کیوں.....؟ شوہر ہوں تمہارا! حق بنتا ہے میرا جب تک مرضی دیکھوں“۔ وہ لال پڑتی گئی وہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھتا رہا۔
 ”سنو!“ ہولے ہولے چلتا اس کے پاس آیا اور اس کے نازک ہاتھوں کو تھام لیا۔
 ”محبت ہو گئی ہے تم سے“۔ لمبی لمبی ریشمی پلکیں لٹھکائیں دل اتنی تیزی سے دھڑکنے لگا بس اب سینے سے باہر آیا کہ تب۔

☆☆☆☆

احمر اسے ڈراپ کر کے چاچکا تھا وہ اندر آیا تو گھر میں خاموشی تھی البتہ ڈرائنگ روم سے باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں وہ ادھر آیا وہاں کچھ گیسٹ آئے ہوئے تھے۔
 ”آؤ آؤ عثمان بیٹے“۔ امی نے اسے اندر بلوایا تھا۔
 ”یہ عثمان ہے! ماشاء اللہ بہت بڑا ہو گیا ہے“۔ فریبی مالک خاتون پوچھیں اس نے پہچان لیا تھا وہ اس کی خالہ تھیں بیس برس مسقط میں گزارنے کے بعد خالہ کی فیملی پاکستان آ گئی تھی مستقل شفٹ ہونے کے لئے۔
 ”السلام علیکم!“ اس نے سلام کیا اور وہیں صوفے پر ٹنگ گیا تعارف ہونے لگا۔
 ”یارم ہے ہمارا اکلوتی بیٹی“۔ عثمان نے نظر اٹھا کر دیکھا مشرق اور مغرب کا خوبصورت مٹلاپ، کول اور نازک سی میٹریٹجیسی ڈراپولو میٹلی ہو جائے تقریباً اسی کی ہم عمر ارم بخاری عثمان نے نظریں جھکا لی تھیں یک ٹنگ دیکھنے کے بعد۔

☆☆☆☆

شام ہو لے ہو لے بھیگ رہی تھی موسم کی خنکی دم توڑ رہی تھی لیکن شام میں ابھی بھی سردی محسوس ہو رہی تھی کچہری لگی ہوئی تھی وہ باپ کے سامنے ملزم بنا کھڑا تھا۔
 ”دوستی پالنے بھجھتا ہوں میں تمہیں اسکول ہر وقت کھیل کود کی باتیں“۔ ابھی ابھی فیضان اسے کرکٹ کھیلنے کے لئے بلانے آیا تھا لیکن ابو نے منع کر دیا تھا وہ چلا گیا تو ابو نے اسے کتھرے میں بلوایا۔
 ”ان لڑکوں کا کام ہی یہ ہے ہر وقت کھیل کود آوارہ گردیاں احمد صدیقی! آئندہ میں تمہیں اس کے ساتھ نا

دیکھوں۔

”لیکن ابو! وہ میرا دوست.....“ وہ منمنایا۔

”ختم کرو یہ دوستیاں..... بس۔“ وہ اٹھ کر کمرے سے نکل گئے تھے، اتنے ایب نے ٹیٹ کی تیاری کا کہہ کر۔

☆☆☆☆

”سیلو حمزہ بھائی!“ حمزہ نے چونک کر سنا اور مڑ کر اسے دیکھا۔

”سیلو حمزہ بھائی۔“ وہ حیرت سے بے ہوش ہونے لگا تھا۔

”جی! احمر بھائی!“ اسی کے لہجے میں اسی کے الفاظ اسے لوٹا دیے تھے۔

”میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہ رہا تھا۔“ حمزہ نے سوالیہ اسے دیکھا۔

”کچھ پرسٹل سائے برامت منائیے گا۔“ سوالیہ ابرو۔

”مطلب آپ واقعی شادی شدہ ہیں، مطلب قبول ہے قبول ہے والی.....؟“

”جی۔“ حمزہ نے یک لفظی جواب دیا احمر کے ہونٹ ”اوہ“ کے انداز میں سکڑے۔

”اتنی جلدی کیسے.....؟ مطلب لو میرج.....؟“

”نہیں! ریشہ ہمارے ہاں گاؤں میں عموماً اتنی جلدی ہی شادیاں ہو جاتی ہیں، لڑکوں کی تو کبھی کبھی میٹرک

میں ہو جاتی ہے لیکن لڑکیوں کی عموماً پرائمری کے بعد ہو جاتی ہے۔“ احمر گنگ رہ گیا۔

”اور کچھ پوچھنا ہے.....؟“

وہ اور کچھ تو کیا..... کچھ بھی اور..... پوچھنے کی حالت میں نہیں تھا۔

”نہیں تھیک یو!“ کافی دیر بعد عثمان ادھر سے گزرا تو احمر وہیں گراؤنڈ میں پتھر کا بنا کھڑا تھا۔

”کیا ہوا.....؟ طبیعت ٹھیک ہے.....؟“

”کاش..... میں بھی گاؤں میں پیدا ہوا ہوتا، اب تک میرے چار بچے تو ہوتے ہی۔“ وہ خوابناک لہجے میں

بولتا تھا۔

”نئے منہ۔“ عثمان بد مزہ ہوا۔

☆☆☆☆

وہ کچن میں سالن بنارہی تھی جب پاس ہی سلیب پر پڑا موبائل بج اٹھا، اس نے دیکھا ”سدرہ“ کے نام سے

محفوظ نمبر سے ایس ایم ایس آیا ہوا تھا۔

”فرمائیں مسٹر! رحم شاہ!“ جوابی ایس ایم ایس کیا۔

”اوہ..... آج میرا اسم مبارک کیسے لے لیا.....؟“ وہ بنا جواب دیئے پیٹلی میں ڈوئی چلاتی رہی۔

”کیا کر رہی ہو.....؟“

”کھانا بنا رہی ہوں۔“

”گریٹ! میں کھانے کب آؤں.....؟“

”کیا..... جوتے.....؟“

”تمہارے ہاتھ سے تو جوتے بھی کھالوں گا۔“

”اف.....“ فلک نے ڈھکن ڈھکا اور ہاتھ صاف کرنے لگی۔

”پاگل ہے پورا۔“ وہ موبائل لئے کچن سے نکلی تو مسکرا رہی تھی۔
 ”کیا ہوا فلک آپنی! کس بات پر ہنس رہی ہیں.....؟“ چھوٹی نمرہ وہ بیٹھی تھی وہ گڑبڑا گئی۔
 ”کچھ نہیں! سدرہ سے بات کر رہی تھی ناں تو اس کی بات پر ہنسی آگئی۔“

☆☆☆☆

وہ کانوں میں ہینڈ فری ٹھونے چھت پر ٹہل رہا تھا جب اس نے ارم کو اوپر آتے دیکھا۔
 ”ہیلو!“ عثمان نے ہینڈ فری کان سے نکالی اور مسکرایا، وہ پاس آکھڑی ہوئی تھی۔
 ”تو تم ایف ایس سی کر رہے ہو.....؟“
 ”ہاں..... اور تم.....؟“

”میں ابھی ایڈمیشن لوں گی۔“ عثمان نے سر ہلایا وہ دونوں ریلنگ کے پاس کھڑے تھے وہ کھڑی چھوٹی
 چھوٹی باتیں پوچھتی رہی تھی اس کی پسند ناپسند عادت مشاغل وغیرہ دور مغرب کی دلدل میں زرد سا سورج
 پکھل رہا تھا۔

☆☆☆☆

رات ہو لے ہو لے بھگ رہی تھی وہ چھت پر آخری میز پر بیٹھی تھی کان سے موبائل لگا ہوا تھا۔
 ”مجھے ڈر لگ رہا ہے ارحم! اگر ابو نے دیکھ لیا تو.....؟“
 ”کچھ نہیں ہوتا یار! کہہ دینا فرینڈ کافون ہے۔“ فلک نے اپنے گرد چادر پلیٹ لی تھی۔
 ”تم نے اتنی رات کوفون کیوں کیا.....؟“
 ”مجھے مد فلک صاحبہ! میرا دل آپ کے قبضے میں ہے، لونادیں تو احسان عظیم ہوگا۔“
 ”اور اگر نا کروں تو.....؟“

”تو تا عمر آپ کا غلام رہنا میرے لئے باعث فخر ہوگا مہارانی۔“ وہ کھلکھلائی۔

”اچھا مجھے گانا سناؤ تم۔“ فلک کی نئی فرمائش۔

”کونسا.....؟“ ارحم نے گلا صاف کیا تھا۔

”کوئی بھی اچھا سا۔“ رات کے سناٹے میں اس کی آواز ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔

”ہوا ہے آج پہلی بار جو ایسے مسکرایا ہوں، تمہیں دیکھا تو جانا یہ.....“

”اوہ بڑے رومینٹک ہو رہے ہو۔“

”ہاں ہاں محبت جو ہو گئی ہے۔“

”میں کیسے مان لوں.....؟“ فلک اٹھلائی۔

چاہا جانا انسان کو ساتویں آسمان پر لے جاتا ہے اور اس لئے فلک الیاس وہیں تھی ساتویں آسمان پر۔

”تمہاری قسم! اپنی جان سے زیادہ محبت کرتا ہوں تم سے۔“

☆☆☆☆

”یار! تو نے ایورسٹ مووی دیکھی ہے.....؟ کمال کی مووی ہے۔“ احمر نے فریڈیریڈ میں عثمان سے پوچھا تھا۔
 ”نہیں یار۔“

”اف کمال دھمال! سوپر۔“ وہ تعریفوں میں رطب اللسان تھا۔

”واقعی اچھی ہوگی، کل ارم بھی کہہ رہی تھی کہ اس نے بھی ایسی ہے میں بھی دیکھوں گا۔“

”ارم.....“ احمر کی آنکھیں کان منہ سب کھل گیا تھا۔

”ارم کون.....؟“ جواباً عثمان نے سارا رشتہ بتا دیا تھا۔

”واہ جی واہ! یہ راتوں رات تیری کوئی کزن پیدا ہوگئی اور وہ بھی اتنی اپ ٹو ڈیٹ سچ بک۔“ عثمان نے کتاب کھولی۔

”سچ بتا دیا ہے میں نے۔“

”بکواس! میں آج تیرے گھر چائے پینے آؤں گا۔“

”سوری.....“ عثمان نے ٹھینکا دکھایا۔

”ایویں..... میں تو ضرور آؤں گا۔“

☆☆☆☆

”سوری فیضان!“ اگلے دن احمد نے اس سے معذرت کی تھی۔

”ابو نے مجھے دوستی سے منع کیا تھا، اسی لئے میں..... سوری یار۔“

”اٹس اوکے.....“ فیضان نے بات ختم کی، احمد غیر مطمئن سا اسے دیکھ کر رہ گیا۔

”چلو سچ کرتے ہیں۔“ فیضان نے بات بدلی تھی۔

☆☆☆☆

”میں کیسا لگا تمہیں.....؟“ آج کالج سے واپسی پر ارم کالج کے باہر بائیک لئے کھڑا تھا، فلک اسے دیکھنا

چاہتی تھی اب وہ پوچھ رہا تھا۔

”بس نارل سے ہو۔“ فلک نے مسکراہٹ دبائی۔

”اف.....“ وہ تاسف سے بولا تھا۔

”میری اماں مجھے چاند کہتی ہیں۔“

”اماں کو عینک لگواؤ۔“ وہ جوتے اتارنے لگی۔

”میرے دوست مجھے چاکلیٹ ہیرو بولتے ہیں۔“

”دوست بدلو جلدی سے۔“

”او میڈم! بس کرو۔“ موبائل رکھ کر وہ یونیفارم بدلنے چلی گئی تھی واپس آئی تو نیا پیغام آیا ہوا تھا،

”سچ بتاؤ میں کیسا لگا.....؟“ وہ کچھ دیر سوچ کر ٹائپ کرنے لگی۔

”تمہاری اماں ٹھیک کہتی ہیں اور دوست بھی مت بدلنا۔“

☆☆☆☆

وعدے کا پکا احمر صدیقی شام کی چائے کے وقت نوٹس لینے کا بہانہ بنا کر آ گیا تھا، امی بہت تپاک سے ملی تھیں،

عثمان نے امی کو اس کے بارے میں ”سب کچھ“ بتا رکھا تھا۔

”میرے بیٹے کے دوست ہو، میرے لئے میرے بیٹے جیسے ہو۔“

”تھینک یو آئی!“ خود کو لو فر کہتا اور ثابت کرتا احمر اب خود کو نجانے کیا کیا کہلاانا اور ثابت کروانا چاہ رہا تھا۔

بیباچہ!

”السلام علیکم۔“ ہواؤں کا جھونکا، شاعری کی غزل، بہاری امید، سورج کی کرن، بارش کی پہلی بوند، اف..... احمر

کی آنکھیں خیرہ ہونے لگیں۔ وہ تعارف وغیرہ آداب سلام کر کے چلی بھی گئی وہ ویسے ہی بیٹھا رہ گیا۔
 ”بڑی اچھی بیٹی ہے، سعادت مند اور فرماں بردار“۔ امی کہہ رہی تھیں۔
 ”میں اسے بیٹی بنانے کا سوچ رہی ہوں“۔ احمر کی گھٹی بیٹی۔
 ”اپنے بیٹے کی بہو بنا کر“۔ اسے اچھو لگا کھانتے کھانتے بے حال ہو گیا۔

☆☆☆☆

”میم!“ ندانے حیرت سے کارڈ کو دیکھا اور پھر اس سیزنگرل کو۔
 ”یہ کارڈ کام نہیں کر رہا“۔ وہ پریشان ہو گئی۔
 ”لیکن کیوں..... اس میں ابھی اچھی اماؤنٹ ہے۔“
 ”شاید کوئی ٹیکنیکل پرالیم ہو آپ کیش پے کر دیں“۔ ندانے پریشانی سے پرس کھجال لیا، اس میں چند سو روپے تھے۔

”اب میں کیا کروں“۔ پریشانی سے اس کا برا حال تھا، تبھی برابر میں کھڑا لڑکا اس کی طرف متوجہ ہوا۔
 ”کیئن آئی پے.....؟“ ندانے دیکھ کر شاکڈرہ گئی، وہ لڑکا وہی تھا (بقول احمر کے راجھا) وہ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ کیا کرے وہ بل پے کر بھی چکا تھا۔
 ”آپ کا بہت شکریہ! میں یہ لوٹاؤں گی کیسے.....؟“
 ”اس کی ضرورت نہیں ہے“۔ وہ مسکراتے ہوئے اپنا سامان سمیٹ رہا تھا۔
 ”نہیں پلیز..... آپ اپنا کارڈ ٹیکٹ نمبر دے دیں میں پے کر دوں گی“۔
 ”اٹس اوکے میم!“ وہ کہہ رہا تھا۔
 ”نہیں..... آپ نمبر دے دیں“۔ اور اس دن جب وہ واپس جا رہی تھی تو اس کے سیل کے کانٹیکٹ نمبرز میں ایک اور کا اضافہ ہو چکا تھا۔ ارسل حبیب!

☆☆☆☆

وہ کافی دیر سے اس کے سامنے بیٹھا بک رہا تھا، کچھ عدد آنسو بھی تھے جو اس کے گالوں پر بہہ رہے تھے، ایک لمحے کو عثمان کو لگا بھی کہ وہ واقعی رو رہا ہے اور شاید وہ یقین بھی کر لیتا اگر احمر صدیقی کی روح تک سے واقف نا ہوتا۔

”سب کی شادیاں منگنیاں ہو رہی ہیں اور پتہ نہیں کیا کیا، ایک میں کنوارا بیچارہ..... شاید میں اکیلا ہی مرجاؤں گا“۔ آنسو صاف کئے۔

”اتنے ارمان ہیں میری ماں کے دل میں بہولانے کے..... وہ بیچاری بوڑھی عورت“۔ بچکی۔
 ”کیا بتاؤں میں زمانے والوں کو کہ کیوں نہیں مجھے کوئی رشتہ مل رہا“۔ عثمان مسکراتا رہا تھا۔
 ”سب میرے دوست شادی شدہ ہو گئے، حمزہ اور اب تو بھی“۔

”حمزہ تیرا دوست کب سے ہو گیا.....؟“

”جب سے تو نے مجھ سے غدار کی میری ہونے والی بیوی سے منگنی رچانے کے منصوبے بنائے،
 ہائے“۔ اس نے پھر سے دہائی دی۔ عثمان ہنسی ہنستے بے حال ہونے لگا تھا۔
 ”شاید آج کل جوڑیاں بننے کا وقت چل رہا ہے، سب کو خوابوں کے شہزادے اور شہزادیاں مل رہے ہیں“

میں بھی صبح تہجد کے وقت اٹھوں گا دیکھنا۔“ عثمان نے قہقہہ لگایا۔

”خدا تمہیں خوش رکھے! سدا سہاگن رہو۔“ اس نے عثمان کا ہاتھ چوما۔

”میری طرف سے میری ایکس گرل فرینڈ اور میری..... مطلب تیری فیوچر پتی کو پیار دینا بیٹا۔“ وہ آنسو

صاف کر کے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”چل اب مجھے کچھ کھلا دے، کوک، شوارا اور مٹھائی..... سو سے اگر تو چاہے، اور ہاں رشین سیلڈ مائی فیورٹ‘

چل جلدی چل۔“ وہ اس کے ساتھ کینٹین کی طرف رواں تھا۔

☆☆☆☆

کچھ دنوں سے نذیب کی طبیعت خراب تھی بخار اترنے کا نام نہیں لے رہا تھا، چکر پر چکر آ رہے تھے، عجیب متلی

کی سی کیفیت تھی وہ پریشان ہو گیا، بڑھائی کی ٹینشن اوپر سے اس کی پیاری۔

”شام میں تیار رہنا، کلینک چلیں گے۔“ صبح کالج جاتے ہوئے حمزہ ہدایت کر گیا تھا اور اب وہ دونوں کلینک

میں تھے کچھ ٹیسٹ ہو چکے تھے کچھ ہو رہے تھے، تقریباً پندرہ منٹ بعد ڈاکٹر نے اسے اپنے کمرے میں بلوایا تھا۔

”مجھے کچھ اندازہ تھا، اب رپورٹس نے تصدیق کر دی ہے آپ کی سسر امید سے ہیں۔“ وہ گنگ رہ گیا ایک

لمحے کے لئے۔

”کیا.....؟“ اس نے پھر سے پوچھا، کیا واقعی وہ وہی کہہ رہے تھے جو اس نے سنا تھا۔

”جی واقعی..... آپ باپ بننے والے ہیں۔“ اس نے گردن موڑ کر برابر میں بیٹھی نذیب کو دیکھا وہ پتہ نہیں

کہاں کسے دیکھ رہی تھی۔

”لیکن آپ کی سسر کافی کمزور ہیں، شی از نو ویک اور ابھی بہت یگ ہیں، تو پیچیدگیاں بھی ہو سکتی ہیں۔“ وہ۔

اب مزید ہدایات دے رہے تھے۔

”عمر کیا ہے ان کی.....؟“

”سولہ.....“ حمزہ نے جواب دیا تھا، وہ اب بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ ہو کیا رہا ہے، کیا واقعی وہ ہونے جا رہا تھا،

کیا واقعی وہ باپ بننے والا تھا، اس نے پھر سے نذیب کو دیکھا وہ اب اسے ہی دیکھ رہی تھی وہ ہولے سے مسکرایا، وہ

وہ نہیں رہا تھا، اس خبر نے اسے کچھ اور ہی کر دیا تھا۔

☆☆☆☆

”مجھے تم سے ملنا ہے۔“ فلک وہ پیغام دیکھ کر سوچنے لگی تھی۔

”نہیں مارا! کسی جاننے والے نے دیکھ لیا تو بہت برا ہوگا۔“

”نہیں دیکھنا کوئی۔“

”نہیں۔“ فلک نے قطعی انکار کیا تھا۔

”پلیز میرے لئے، بس تھوڑی دیر کے لئے کوئی نہیں دیکھے گا۔“ فلک کا دل ہنسنے لگا تھا وہ سوچ میں گم ہو گئی۔

”میری قسم..... میرا مطلب ہے تمہاری قسم کچھ نہیں ہوگا۔“

”ہاں ہاں کھاؤ میری جھوٹی قسمیں تاکہ میں ہی مروں۔“ اور اگلے دن وہ بریک میں طبیعت کا بہانہ کر کے

کالج سے باہر آ گئی تھی۔ ارحم ہائیک پر اس کے انتظار میں تھا، اب وہ نزدیکی پارک میں ٹہل رہے تھے۔

”تم ایویں ڈر رہی تھیں یہاں کون دیکھے گا۔“

”تم جلدی بتاؤ جو بھی بتاتا ہے۔“ وہ ابھی بھی ڈر رہی تھی۔
 ”بتاتا ہوں۔“ وہ ہولے سے مسکرایا جب میں سے کچھ نکالا اور اس کے سامنے زمین پر دوڑا نو ہو گیا۔
 ”مجھے سے شادی کرو گی.....؟“ تھیلی سامنے کے وہ کہہ رہا تھا، کھلی تھیلی پر ننھی سی انگوٹھی رکھی ہوئی تھی۔
 فلک الیاس خاک کی مانند تیز ہوا میں بھڑکنے لگی تھی اور یہی تو ہوتا ہے کمزور لڑکیوں کے ساتھ وہ ایک لمحہ نہیں لگا
 تیں کسی کی بھی محبت کے سامنے پھرنے میں ٹوٹ جانے میں اور خاک ہو جانے میں۔
 ”بتاؤ ناں۔“ ارجم نے سوال پھر سے رہرایا تھا۔
 ”مجھے سے شادی کرو گی.....؟“
 ”ہاں.....“ فلک نے ہولے سے اقرار کیا تھا۔

☆☆☆☆

آج 9th کلاس کا رزلٹ آنا تھا۔ احمد کا دل بری طرح سے دھڑک رہا تھا، صبح سے ہی وہ جملے پیر کی بلی کی
 طرح ادھر ادھر چکراتا پھر رہا تھا، احمر نے کئی دفعہ اسے تسلیاں دی تھیں دو پہر میں رزلٹ آ گیا، اس کی
 بائیلوجی میں سبلی تھی۔ رزلٹ کے دس منٹ بعد ابو گھر آ گئے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں بیڈ پر بیٹھا تھر تھر
 کانپ رہا تھا ابو غصے سے اس کے کمرے میں آئے وہ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا، ابو نے آگے بڑھ کر اس کے
 گال پر تھپڑ رسید کیا تھا۔
 ”ابو پلیز۔“ احمر منمنایا۔

”تو چپ کر مجھے اس سے منمناتا ہے، اس نے زندگی حرام کر دی ہے میری، ناک کنوادی، خاک ڈلوادی میرے
 سر میں۔“ غصے سے کہہ کر ابو نے اس پر تھپڑوں کی بارش کر دی تھی احمر بچانے کے لئے پھر سے آگے بڑھا۔
 ”فیل ہو گیا بے غیرت، مر کیوں نہیں گیا تو۔“ جوتا بڑا تھا۔
 ”ابو پلیز..... مت ماریں۔“ احمر نے پھر سے منت کی تھی وہ روتے ہوئے پٹ رہا تھا اور مار کھا رہا تھا۔
 ”بھائی..... امی..... بھائی بچائے۔“
 ”کیوں آئی سبلی۔“ وہ غصے سے دھاڑے۔
 ”بائیو سمجھ میں نہیں آتی، پڑھی نہیں جاتی۔“
 ”تو احمر نے کیسے پڑھ لی.....؟ اس نے کیسے ٹاپ کر لیا.....؟“ ایک اور تھپڑ ابو غصے سے باہر نکل گئے تھے
 امی اور احمر اس کے زخم صاف کرتے رہ گئے۔

☆☆☆☆

”سپی برتھ ڈے۔“ ارجم نے وہ گفٹ اور کارڈ اس کی طرف بڑھایا تھا، اس نے مسکرا کر تھینک یو کہا اور وہ تھام
 لیا، خوبصورت رنگوں سے سجا کارڈ دیکھ کر وہ مسکرانے لگا تھا۔
 ”تم سوچ بھی نہیں سکتے، میں کتنا سوچتی ہوں تمہیں۔“ وہ الفاظ اندر تک راحت پہنچا رہے تھے، وہ بلا وجہ
 مسکرانے لگا تھا۔

”you are my happy ending“ شام کی گلابی ہوائیں ہر طرف تاریخی سرخیاں پھیلا رہی
 تھیں وہ عجب مدھوشی کے سے عالم میں کھڑا وہ چند الفاظ پڑھتا رہا تھا، عثمان اکرم، عثمان اکرم، نہیں رہا تھا کچھ
 اور ہو گیا تھا۔

☆☆☆☆

ڈرائنگ روم میں جائے پی جا رہی تھی ایک صوفے پر وہ بیٹھا تھا، سامنے صوفے پر ابوائی اور وہ..... ارسل۔
 ”بہت شکریہ آپ کا بیٹا جی! آپ مددنا کرتے تو ہماری نداد ہاں خوار ہوتی رہتی“۔ ابو نے شکریہ ادا کیا تھا۔
 ”انکل پلزز! شرمندہ مت کریں“۔ وہ انکساری سے بولا۔

ندانے کن اکھیوں سے اسے دیکھا اور ہولے سے مسکرائی (ایک اور خوبی انکساری! احمر بیچارہ تو انکساری کے جوڑ توڑ کر کے ٹوٹ پھوٹ جائے گا)

”یہ آپ کا اپنا گھر ہے بیٹا بلا جھجک جب آنا چاہو موٹ و ٹیکم۔“
 ”ہاں! ہاں اپنی امی سے بھی ملوانا ہمیں کسی دن کھانے پر لے کر آنا“۔ امی کہہ رہی تھیں۔ دوسری طرف کلیٹک سے واپسی پر حجزہ اور زنبہ ریسٹورنٹ میں آئے تھے۔

”کیا کھاؤ گی.....؟“

”کچھ بھی“۔ وہ اس کی خوشی میں خوش رہتی تھی آرڈر دے کر وہ پھر سے اس کی طرف متوجہ ہوا۔
 ”میں بہت خوش ہوں زینی! مجھ میں نہیں آ رہا کیا کروں! اچھلوں! کودوں! ناچوں! کیا کروں! خیر اس ویک اینڈ ہم گاؤں چلتے ہیں سب کو سر براؤز دیں گے“۔ خوشبو میں اڑاتے کھانے سے میز جگمگائی۔
 ”اب کسی قسم کی ٹینشن لینے کی ضرورت نہیں ہے بس آرام اور آرام“۔ وہ آگے کے لائحہ عمل طے کر رہے تھے۔

☆☆☆☆

امی نے اس کے زخموں پر مہم لگایا تو وہ سسک پڑا تھا اسے بیڈ پر آرام سے لٹا کر وہ باہر آئی تھیں۔
 ”کیا ضرورت تھی ایسے مارنے کی.....؟“ ابو باہر ہی بیٹھے تھے۔
 ”اور کیا حسن کارکردگی کے ایوارڈ سے نوازاؤں.....؟“ بڑا معرکہ مادا ہے ناں اس نے۔ وہ طنز ابو لے۔
 ”بیٹا ہے وہ آپ کا“۔
 ”ناگ کنوئی ہے میری اس نے ہر بندہ پوچھ رہا ہے بڑے نے تو ٹاپ کیا تھا اسے کیا ہوا کیا جواب

دوں.....؟“

”کہہ دیں پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں“۔
 ”انگلی نہیں ہے وہ اولاد ہے انسان ہے اور انسان سب ایک سے ہوتے ہیں دو آنکھیں دو ہاتھ اور ایک سا دماغ“۔ امی باورچی خانے میں چلی گئیں اندر کمرے میں نیندا اور دو اکے اثر سے وہ دھت سورا تھا وہ وہ نہیں رہا تھا کوئی جانور ہو گیا تھا جسے بے دردی سے مارا گیا تھا۔

”انکل کو ایسے نہیں کرنا چاہئے تھا“۔ اپنے کمرے میں بیڈ پر لیٹا احمر ندا سے اس کا پپ پر ہم کلام تھا۔
 ”وہ خود بھی تو ڈپر لیس ہوگا“ اسے حوصلہ دیتے اب کیا کریں اگر وہ تمہاری طرح ڈپن نہیں ہے تو“۔ احمر نے ہنکارا بھرا۔

”میں نے کہا تھا ابو کو کہ اسے بائو مت پڑھوائیں بلکہ سرے سے سائنس مت پڑھوائیں وہ ویک ہے کچھ اور پڑھ لے گا نہیں سائنس نہیں تو جیسے کچھ بھی نہیں اب دیکھ لیں خود“۔ ندا تاسف سے اسے دیکھ رہی تھی۔
 ”میری طرف سے اسے دلاسہ دینا“۔

”ہونہہ..... تم سناؤ پرنس چارمنگ کا“۔ احمر نے ماحول پر چھائی کلفت دور کرنے کی کوشش کی تھی۔

”پرنس چارمنگ مل گیا۔“ ندانے بریکنگ نیوز دی تھی۔
 ”کون.....؟“ وہ سیدھا ہو بیٹھا۔
 ”وہی۔“

”جون سہنا.....؟“ وہ بے یقین تھا اسے دیکھ کر وہ ہنسی سارا قصہ مختصر اُسنایا وہ حیرانی سے سنتا رہا۔
 ”لو ہمارے بٹوے خالی ہو جاتے ہیں ہماری مدد کو نہیں آتے ایسے رحدلی کے فرشتے (یہ کیا سارے فرشتے تمہاری طرف رہتے ہیں کیا.....؟“ وہ کھلکھلائی۔
 ”ہاں جی! ہمارے اعمالوں کے صلے میں فرشتے ہی اترتے ہیں۔“
 ”تو ہم نے کونے ایسے گناہ کر دیئے ہیں جو، طر صدیقی ادھر آ گئے.....؟“
 ”وہ باپ ہیں تمہارے۔“ ندانے ڈپٹا۔
 ”اوہ سوری۔“ وہ گڑبڑایا۔

☆☆☆☆

ان کی گاؤں آمد کے ساتھ ہی خوشیوں کی بہار آ گئی تھی، دادا ابو نے سارے گاؤں میں مٹھائی بانٹی تھی، مبارک سلامت بلائیں..... ایک پختے کے لئے زینب کو گاؤں چھوڑ کر وہ شہر آ گیا تھا۔ ان سے دور وہ ہال لائٹنگ سے سجا ہوا تھا۔ رنگ تھے روشنیاں تھیں، خوشیاں تھیں، یہ عثمان اکرم کی مٹھنی کی تقریب تھی، گڑیا جیسی نازک ارم اس کے برابر میں بیٹھی ہوئی تھی وہ نازک سی سنہری انگوٹھی عثمان نے اس کے حنائی ہاتھوں کی انگلی میں پہنائی تھی۔
 ”مبارک ہو۔“ احمر نے مصنوعی آنسو صاف کرتے ہوئے کہا تھا اور عثمان کے گلے لگ گیا۔

☆☆☆☆

”جان من۔“ ایپیکر سے آتی ہوئی آواز غمار میں ڈوبی ہوئی تھی فلک کے انگ انگ میں سرشاری بھرنے لگی تھی۔
 ”فرماؤ۔“
 ”ایسے نہیں پیار سے کہو۔“
 ”کو۔“

”ہاہاہ..... یہ ٹھیک ہے۔“
 ”عزت راس نہیں تمہیں۔“ وہ بھی ہنسی۔
 ”فون کیوں کیا.....؟“
 ”تم سے ملنا ہے۔“ نئی فرمائش۔
 ”کیوں.....؟“

”پیار بھری باتیں کرنی ہیں۔“
 ”تو کر لو میں سن رہی ہوں۔“

”تمہیں سامنے بٹھا کر ہاتھ تھام آ نکھوں میں آنکھیں ڈال کر کرنی ہیں۔“ وہ لال پڑنے لگی۔

☆☆☆☆

فیضان نے حیرت سے اس کے زخموں سے چور چورے کو دیکھا تھا۔
 ”تمہارے ابو نے مارا تمہیں.....؟“ وہ نظریں چرا گیا، آنکھوں میں پانی بھرنے لگا تھا۔

”تمہیں نہیں مار پڑی، تمہاری بھی تو میتھ اور فزکس میں سہلی ہے۔“

”نہیں تو.....“ فیضان جھٹ سے بولا۔

”میں رو رہا تھا، رزلٹ دیکھ کر ابو نے مجھے گلے سے لگایا، بال سہلے ماتھا چوما اور کہا کوئی بات نہیں، اگلی بار اور زیادہ محنت کرنا۔“ احمد اسے دیکھتا رہ گیا۔

”پھر تم نے کیا کہا.....؟“

”میں نے کہا میں اور بھی زیادہ پڑھوں گا، کم سے کم ٹی وی دیکھوں گا، کرکٹ بھی نہیں کھیلوں گا، فرسٹ آنے کی کوشش کروں گا۔“ احمد ششدر رہ گیا، اس نے یہ سب وعدے اپنے ابو سے نہیں کئے تھے، اس نے مزید اور زیادہ محنت کرنے کا عہد نہیں کیا تھا، کیوں؟ وہ جواب ڈھونڈتا رہا تھا، اور اسے جواب مل گیا تھا، اس کے ابو نے گلے نہیں لگایا تھا، بال نہیں سہلے تھے، اسے تو اس نے وعدے نہیں کئے تھے، دلا سے عہد کرواتے ہیں، پھر نہیں۔

☆☆☆☆

وہ ہنچکپاتے ہوئے اندر داخل ہوئی تھی۔

”آؤ اندر آ جاؤ۔“ وہ اس کا ہاتھ تھامے اسے ڈرائنگ روم میں لے آیا تھا، فلک نے چاروں طرف دیکھا، اس گھر میں خاموشی تھی۔

”گھر والے کہاں گئے.....؟“

”شادی پر.....“ وہ صوفے پر بیٹھ گئی، وہ پاس ہی آ بیٹھا۔

”ڈر رہی ہو.....؟“

”ہاں۔“

”مجھ سے.....؟“ اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”شاید.....“ ارجم نے اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے مضبوط اور پر حدت ہاتھوں میں تھام لیا تھا، نرمی سے۔

”اب بھی ڈر لگ رہا ہے.....؟“

”نہیں! اب تم جو میرے پاس ہو۔“ اس کے بس فلک کو پاگل کر رہے تھے۔

”مجھے اب چلنا چاہئے۔“ وہ ہولے سے بولی، وہ اس کے ہاتھ سہلا رہا تھا۔

”مت جاؤ ناں، میرے پاس ہی رہ جاؤ ہمیشہ کے لئے۔“ وہ اپنے آپ میں نہیں تھا، اپنا آپ تو فلک الیاس

بھی دھیرے دھیرے کھو رہی تھی، وہ دھک رہا تھا، دھک رہا تھا۔

”میرے پاس کہیں پاس رہ جاؤ، یا مجھے رکھ لو اپنے پاس، کہیں اندر دل میں، سانوں میں۔“ اس

نے ہاتھ چھوڑ دیئے اور ہولے سے اسے گلے سے لگالیا، وہ کسمائی، لرزی اور شانت ہونے لگی، دودل ایک سیٹے میں دھڑکنے لگے تھے۔

”میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔“ وہ اس کے کانوں میں صور پھونک رہا تھا، اس کے الفاظ فلک الیاس کو

ہوش و خرد سے بیگانہ کر رہے تھے وہ نہیں رہی تھی کچھ اور ہو رہی تھی کچھ انمول سی..... کچھ بے مول سی۔

”میں بکھر رہی ہوں ارجم!“

”بکھر جاؤ، میں سمیٹ لوں گا۔“ وہ دھوٹی میں بول رہا تھا، وہ ٹوٹنے کو تیار تھی، بکھرنے ہی والی تھی، ریزہ ریزہ

ہو کر پرحدت لمس اسے پکھلار ہے تھے دکتے لمس اس کے وجود کو بھادینے پر تلے ہوئے تھے اس کی سانسیں اس کی سانسوں میں حل ہو رہی تھیں۔ بکھرے ٹوٹنے کے لمحے ہوئے دم توڑ رہے تھے۔

☆☆☆☆

ندانے مسکرا کر وہ اس کے فخریہ انداز سے اسے دکھایا۔

”میرے پرنس چارمنگ“۔ احمد در تک ہنستا رہا۔

”یہ باباجی..... یہ ہیں وہ..... اف“۔

”جسٹ شٹ اپ“۔ ندانے کا غدر کھ دیا۔

”ایسی شکل والی ایک چھچھوند رہمارے کالج میں بھی پڑھتی ہے“۔

”کبواس بند کرو“۔ وہ چلائی۔

”اتنا سوفٹ کیئرنگ بندہ ہے یہ اور انکساری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اس میں“۔ احمد کی پھر سے ہنسی چھوٹ گئی۔

”اف اتنا مشکل سی چیز اور وہ بھی کوٹ کوٹ کر بھری بن گئی ہوگی انکساری کوٹنے بھرنے میں“۔

”ازالے مذاق جاندر تھو کو تو اپنے ہی منہ پر آتا ہے“۔ کوٹ سے رابطہ بند اس رات جب وہ سونے لیٹی تو کچھ دیر سوچنے کے بعد ایک گڈ ٹائٹ کا ایس ایم ایس ارسل کے نمبر پر کیا تھا۔

”کون.....؟“۔ جوابی ایس ایم ایس آیا وہ دھک سے روہ گئی وہ اسے بھول بھی چکا تھا۔

☆☆☆☆

زندگی ایک معمول پر رواں ہو گئی تھی۔ احمد صدیقی 10th میں ہو گیا تھا اپنے تئیں سخت منت میں جتا ہوا تھا ابوی ڈانٹ ڈپٹ اور سختیاں دیے ہی تھیں عثمان اور احمد کی دوستی ویسے ہی تھی عثمان اور ارم کی پسندیدگی محبت میں ڈھلنے لگی تھی دوسری طرف نسیب کو حمزہ واپس لے آیا تھا دونوں بہت خوش تھے محبت کے نو خیز پودے فلک الیاس کے دل میں تناور درخت بن چکے تھے۔ امی کی طبیعت اسے کئی دن سے بوجھل محسوس ہو رہی تھی بخار جو اترنے میں نہیں آ رہا تھا، دنوں میں آنکھوں کے گرد حلقے پڑنے لگے تھے پہلے تو انہوں نے بدلتے موسم سے اس بیماری کو تشبیہ دے کر ٹال دیا لیکن جب حالت نہیں سنبھلی تو چیک اپ کے لئے جانا پڑا عثمان ان کے ساتھ تھا رپورٹس اگلے دن آئی تھیں۔

☆☆☆☆

”اچھا تاؤ اب کب ملوگی.....؟“ اس کی بات پر فلک ایک لمحے کے لئے خاموش رہ گئی۔

”ارحم یہ غلط ہے! ہمیں اب اسے ختم کر دینا چاہئے“۔

”کیا غلط ہے محبت کرنا.....؟“

”نہیں! تنہائیوں میں ملنا اور حدیں پار کرنا اس میں صرف رسوائی ہے“۔

”اوہ جانے دو بار! کوئی رسوا نہیں ہوتا پہلے ہم کئی بار ملے ہیں کچھ بھی نہیں بگڑا اب بھی کچھ نہیں ہوگا“۔

”سٹ بی“۔ فلک نے لمبی سانس بھری۔

”میں اب مزید تم سے نہیں ملنے والی“۔

”میں تم سے پیار کرتا ہوں“۔

”میں بھی، لیکن یہ غلط بات ہے جائز نہیں ہے۔“

”محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے فلک۔“ وہ خاموش رہ گئی۔

”سنڈے کو میں انتظار کروں گا۔“ کال ڈس کنیکٹ ہو گئی تھی اگلے دن اس کا فون دوبارہ آیا تھا۔

”بار! میں کتنے دنوں سے تمہاری منتیں کر رہا ہوں مل لو ناں پلیز۔“

”نہیں ارحم!“ فلک نے دو ٹوک لہجے میں کہا تھا، کچھ دیر کے لئے خاموشی چھا گئی تھی۔

”آخری دفعہ ریکوریٹ کر رہا ہوں جان۔“ فلک اس کے لہجے پر ٹھٹھکی تھی۔

”مطلب در نہ کیا کرو گے.....؟“ جواباً وہ ہنسا تھا۔

”وہ ویڈیو لیک کر دوں گا جس میں تم میرے گلے میں لگی بکھر جانے کی بات کر رہی ہو اور وہ والی جس میں تم واقعی

بکھر بھی چکی ہو۔“ فلک اندر تک لرز کر رہ گئی وہ کیا کہہ رہا تھا اسے سانس لینے میں بھی دشواری محسوس ہو رہی تھی۔

”ارحم.....“ وہ کچھ اور نہیں بول پائی تھی۔

”سنڈے یا در کھنا! میں انتظار کروں گا۔“ وہ زمین پر ڈھے سی گئی تھی ساڑھ سی شروع ہو چکی تھی بد قسمتی کا

منحوس دور۔

☆☆☆☆

وہ بھابی کے ساتھ شاپنگ پر آئی ہوئی تھی ابھی کچھ دیر پہلے ان کو کوئی دوست مل گئی تھی تو وہ دونوں اب ساتھ

تھیں، ندا ان دونوں کے ساس بھی، بھوئی، ٹائپ فضول سے ٹاپک سے بور ہونے لگی تو الگ ہو کر مال کے

اوپر حصے میں آ گئی اور وہیں اسے وہ دکھائی دیا تھا۔

”پرنس چارمنگ۔“ وہ چینٹنس حصے میں کپڑے دیکھ رہا تھا، وہ کھڑی اسے دیکھتی رہ گئی تھی وہ دو ماہ بعد اسے

دیکھ رہی تھی اس رات جب گڈ ٹائٹ کے ایس ایم ایس کے جواب میں ”کون“ کا جوابی پیغام آیا تھا تو ندانے

دوبارہ کوئی بھی ایس ایم ایس نہیں کیا تھا۔

”السلام علیکم!“ وہ کسی ان دیوھی ڈور سے بندھی اس کے پاس آئی اس نے چونک کر دیکھا اور لمحوں میں

پہچان گیا۔

”ندا..... ٹائٹ ٹو میٹ یو!“ ندا کے دل میں لٹو پھوٹنے لگی وہ اب تک اسے جانتا تھا۔

”کافی.....“ اس نے ندا کو آفر دی۔

”شیور۔“ کچھ دیر بعد وہ مزدکی کافی شاپ میں تھے۔

”میں نے آپ کا نمبر ای دن ڈیلیٹ کر دیا تھا ندا یو نو دوست وغیرہ ایسے لڑکی کے نمبر سے آئے پیغامات

دیکھیں تو بے فکر بناتے ہیں پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔“ کافی کے سپ لیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”آئی ہو آپ نے مائنڈ نہیں کیا ہوگا، مطلب۔“ بھی تو ٹھیک نہیں ہے ناں کہ کسی رشتے کے بغیر رات تک

ایس ایم ایس ایس ایم ایس کھیلوں۔“ وہ مرعوب ہو رہی تھی۔

”نہیں، نہیں آئی ڈونٹ مائنڈ! میں سمجھ رہی ہوں۔“ بھی بھابی آئیں۔

”ارے ارحم! کیسے ہو ٹھیک ہو تم پھر آئے ہی نہیں“ انہم انتظار کرتے رہ گئے تمہارا، آنٹی کے ساتھ آؤ

ناں۔“ سوال پر سوال۔

”جی بھابی جلد آؤں گا۔“ وہ مسکرایا۔



فلک نے جھر جھری لی! سامنے اسکرین پر وہ ویڈیو چل رہی تھی جس میں وہ انتہائی شرمناک حالت میں ارحم کے ساتھ تھی! اس نے بے یقینی سے پاس بیٹھے ارحم کو دیکھا جو اسے دیکھ کر ہونے سے مسکرایا اور آنکھ ماری۔
”تم مجھ سے محبت کرتے ہو ارحم! تم نے کہا تھا“۔ اس کی آواز رندہ گئی تھی۔

”یقیناً کرتا ہوں میری جان! اور یہی چاہتا ہوں کہ تم ہمیشہ میرے پاس رہو، بہت پاس“۔ اس کی کسر کے گرد بازو حائل کرتے ہوئے وہ بولا۔

”میں مرجاؤں گی ارحم!“ وہ رو پڑی اور دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیئے۔

”مجھے معاف کر دو! اس ویڈیو کو ضائع کر دو پلیز“۔

”ریلیکس جان! اتنی خوبصورت لڑکی میری وجہ سے روئے مجھ سے یہ ہرگز برداشت نہیں ہوگا“۔ وہ اسے گلے لگا کر بولا۔

”مجھے رسوا مت کر دو ارحم! تمہیں محبت کا واسطہ“۔

”نہیں کرتا، بس تم میری پیاس بجھاتی رہو“۔ ایک سردی لہر فلک کے وجود سے گزر گئی۔

”ٹھیک ہے مجھ سے شادی کر لو“۔ وہ ہتھ پر مار کر ہنسا اور ہنستا چلا گیا۔

”جب شادی کے بغیر تم مجھے مل رہی ہو میرے پاس ہو تو پھر میں یہ طوق کیوں پہنوں! آئندہ ایسا مذاق مت کرنا“۔ وہ ششدر رہ گئی وہ فلک الیاس کو ایک کھلونا سمجھ رہا تھا، ایک ٹشو پیپر۔

”خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو“۔

”اور تم مجھ پر رحم کرو“۔ وہ اس کے پیروں میں پڑنا چاہتی تھی وہ اسے اپنے اندر رکھیں سو لینا چاہتا تھا اس کے دہکتے لمس اب فلک الیاس کو دوزخ کے شعلوں جیسے محسوس ہو رہے تھے۔



”ایک لقمہ اور.....“ حمزہ نے لقمہ اس کے منہ میں دیا تھا۔

”بس حمزہ! بہت کھا لیا میں نے اب مزید میں الٹ جاؤں گی“۔

”چلو ٹھیک ہے اب یہ جوس لے لو“۔ جوس کا گلاس اسے دے کر اب وہ برتن سمیٹنے لگا تھا۔

”میری عادتیں بگاڑ رہے ہو تم“۔

”سو تو ہے پر خیر ہے“ مجھے بگڑی ہوئی عادتوں والی بیوی بھی قبول ہے“۔ وہ مسکرایا اور برتن لئے کمرے سے

لگا اور باورچی خانے میں آیا برتن دھو کر ریک میں لگائے بچا ہوا کھانا فریژ میں رکھا اور واپس کمرے میں آیا۔

”زنہب“۔ جوس کا گلاس فریژ پر پڑا تھا وہ بے سندھ تھی اس نے آگے بڑھ کر اس کا گال تھپتھپایا تھا۔

”زنہب ہوش کرو!“ اس کے پیروں تلے سے زمین کھکنے لگی تھی۔



وہ بخار میں پھنک رہا تھا، سر میں شدید درد تھا، ایسے میں ابواسے بائیو کاسٹیسٹ یاد کرنے کو دے گئے تھے وہ بشکل میٹھا پڑھ رہا تھا آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا، سردی سے بوہل تھا اور آنکھوں کے سامنے لفظ بھاگے اوڑے پھر رہے تھے۔

”احمد! امی! تمہاری ہیں کھانا کھا لو! آ کر“۔ امر اندر آیا تو وہ بے سندھ پڑا تھا۔

”احمد!“ وہ پریشانی سے بولا۔ کچھ دیر بعد وہ اسے نزدیکی اسپتال لے آیا تھا، اسی اسپتال کے دوسرے فلور پر حمزہ ڈاکٹر کے سامنے بیٹھا تھا۔

”کمزوری بہت زیادہ ہے، پریکٹس کالاسٹ منٹھ ہے تو احتیاط کریں۔“ ڈاکٹر نے کچھ دوائیں لکھ دیں تھیں وہ دوائیں لینے نیچے اسٹور پر آیا اور وہیں اسے احمد مل گیا۔

”حمزہ بھائی آپ یہاں خیریت.....؟“ جواباً حمزہ نے مختصر اُسب بتایا تھا۔

”اوہ..... میں اپنے چھوٹے بھائی کے چیک اپ کے لئے آیا تھا، چلیں آپ کو میں ڈراپ کر دوں۔“

”تھینک یو یار! آئی دل میچ۔“

”جانے بھی دیں چلیں! بھابی کہاں ہیں.....؟“ کچھ دیر میں وہ گاڑی میں احمد کے ساتھ گھر کی طرف رواں تھا۔

☆☆☆☆

وہ کافی دیر سے اپنے ڈاکومنٹس ڈھونڈ رہا تھا، ساری الماریاں دیکھ لی تھیں، درازس، بیک، کچھ نہیں ملا تھا، تبھی بیڈ کی سائڈ ٹیبل سے اسے کچھ اور ملا تھا۔ خاکی کاغذ کے لفافے میں کچھ کاغذات میڈیکل رپورٹس امی کی۔

”بلڈ ٹیسٹس لاسٹ سبچ بڑی کوری کی امید ایک فیصد سے بھی کم۔“ اس کے دل کو جیسے کسی نے ٹھسی میں لے کر مسل دیا تھا۔

”مجھے کیوں نہیں بتایا.....؟“ رات میں وہ امی کے پاس بیٹھا روتے ہوئے کہہ رہا تھا وہ انتہائی تھکی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔

”فکرمٹ کرو۔“ انہوں نے دلا سہ دیا تھا۔

”میں..... میں آپ کا علاج کرواؤں گا میں آپ کو کچھ نہیں ہونے دوں گا۔“ ایک لمحے کے لئے سب خاموش رہ گئے۔

”کئی لاکھ کاٹریبنٹ ہے اور ری کوری کا ایک فیصد چانس بھی نہیں ہے۔“ ممانی بولی تھیں۔

”تو کیا کروں، ان کو مر جانے دوں ایسے ہی جھاڑوں؟“ وہ خاموش رہ گئیں۔

”میں علاج کرواؤں گا اپنی ماں کا۔“

”تمہارے ماموں کا کاروبار پہلے ہی خسارے میں جا رہا ہے، چند ہزار کا منافع بھی نہیں ہے۔“

”آپ کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاؤں گا۔“ عثمان نے آنسو صاف کئے۔

”اٹنا گھر بیچ دوں گا، قرضہ لے لوں گا لیکن اسی ایک فیصد سے بھی کم امید پر بھی رسک لوں گا۔“

”باگل ہو.....؟“ امی نے نرمی سے ڈپٹا۔

”جی.....“ وہ اب نہیں رویا تھا۔

☆☆☆☆

رات تاریک ہوتی جا رہی تھی وہ آخری سیڑھی پر بیٹھی جلتے بجتے تاروں کو دیکھ رہی تھی موبائل کان سے لگا ہوا تھا۔

”ازم پلیز! مجھے بخش دو، محبت کی اتنی بڑی سزا مت دو مجھے خدا کے لئے میرے حال پر رحم کرو۔“ وہ ہلکے رہی تھی۔

”سزا..... ڈارلنگ میری قربت تمہارے لئے سزا ہے، ایسے پلیز میرا دل مت دکھاؤ۔“

”خدا کے لئے ایسے مت کرو۔“

”اور تم بھی.....“ نیچے کھٹ پٹ ہوئی تو اس نے جلدی سے فون بند کر دیا تھا وہ ابو تھے اور ابو پر ہی آرہے تھے۔
 ”میری بیٹی رو کیوں رہی ہے.....؟“ وہ پاس آ بیٹھے فلک نے اپنا سر ان کے کندھے سے ٹکا دیا آنسو خود
 خود بہہ نکلے تھے۔
 ”امی یاد..... آرہی ہیں۔“ انک انک کر بولی، وجہ کوئی تو بتانی تھی ناں..... یہ ناں کہتی تو اور کیا کہتی، وہ سب
 لیے بتا دیتی.....؟ کاش بتا دیتی۔

☆☆☆☆

”میرے بیٹے کی طبیعت اب کیسی ہے.....؟“ وہ اپنے کمرے میں بیڈ پر لیٹا تھا جب ابو پاس آ بیٹھے وہ
 ہلدی سے اٹھ بیٹھا۔

”ٹھیک ہوں ابو!“ امی دودھ کا گلاس لئے اندر آئی تھیں۔

”میں نے ٹیسٹ یاد کر لیا ہے ابو!“ اس نے ہولے سے ابو کو بتایا۔

”گڈ بوائے!“ ابو نے اس کے بال سہلائے تھے۔

”میں بہت اچھے مارکس لاؤں گا۔“ اس نے ہولے سے کہا اور اگلے دن اس کے ٹیسٹ میں نوے فیصد

بہرے تھے، ٹیسٹ کے کونے میں Brilliant سے لکھا چمک رہا تھا۔

☆☆☆☆

ڈائننگ ہال میں کھانا کھایا جا رہا تھا، ارسل اور اس کی والدہ چیف گیسٹ تھے، سو براورڈیٹ سی خاتون وہ
 تارہی تھیں۔

”بس بہن! ارسل کے پاپا کی ڈیجھ کے بعد میں نے ہی اسے ماں اور باپ دونوں بن کر پالا ہے اپنے
 تئیں میں نے ہر کوشش کی ہے کہ اسے باپ کی کمی محسوس نا ہو، باپ کے بعد ان کے بزنس کو سنبھالنے کی ذمہ داری
 ملی اب اس پر ہی ہے ساتھ ساتھ پڑھ بھی رہا ہے۔“

”میں نے تو ارسل سے کئی بار کہا کہ آنی کو لے کر آؤ! آج قسمت سے یہ لی ہی آیا۔“ بھائی کہہ رہی تھیں۔
 ”اس نے آپ سب کی اتنی تعریفیں کیں میں تو خود آپ سے ملنے کے لئے بے چین تھی۔“ کھانے کے بعد
 ہائے جیتے ہوئے انہوں نے اپنی آمد کا مقصد بتایا تھا۔

”بھائی صاحب! میں ایک خاص مقصد کے لئے آئی ہوں، بہت ساری امیدیں لے کر۔“ ابتدائی جملے
 بہت کچھ سمجھا رہے تھے۔

”میں آپ سے مذاکا ہاتھ مانگتی ہوں، اپنے ارسل کے لئے۔“ مذاکا سر جھک گیا، چہرہ لال، ابو، امی کو دیکھ کر
 سکرائے۔

”تھوڑا وقت۔“

”جی جی آپ اچھی طرح سمجھ سوچ لیں مجھے کوئی جلدی نہیں، پرائڈ مارٹ کیجئے گا۔“ آنٹی بولی تھیں۔

☆☆☆☆

وہ خالی الدہنی کی سی حالت میں کتابیں کھولے بیٹھا تھا جب ارم پاس آ بیٹھی، وہ ابھی خالہ خالو کے ساتھ
 ملاوت کے لئے آئی تھی۔

”تم ٹینشن مت لو عثمان! آنٹی انشاء اللہ جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔“ اس نے دلاسا دیا تھا۔ (جاری ہے)

عکس ہسپروں جہان رکھنا

”سبرینا آج تمہاری پھپھو آ رہی ہیں، بریانی سامان اور دیگر اشیاء میں لے آیا ہوں، وقت پر تم کام نمٹالینا۔“ یہ سنتے ہی سبرینا کے چہرے مسکراہٹ غائب ہو گئی سبرینا کی پھپھو کے آتے گھر میں کرفیولگ جاتا تھا، سب افراد الٹ ہو جاتے تھے کیونکہ وہ غصے کی بہت تیز تھیں، شام میں جب مہمان کھانا کھانے کے بعد فارغ ہوئے تو سبرینا پھپھو و شمشہ نے طعنوں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔

”سبرینا یہ تمہاری وارڈ روپ کو کیا ہو گیا؟ ہر سہرے کا ستیاناس کر دیتی ہو، میری بیٹی ابھی محض پانچ برس ہے مگر تم سے زیادہ نفاست کا خیال رکھتی ہے یہ مکمل کوٹنے سے ذرا سا پھٹ گیا ہے اس کی سلائی کو کیوں تم اسے لیر بنانا چاہتی ہو عقل سے کام کرو۔“ سبرینا ان تمام رخ باتوں کے جواب میں خاموش رہی۔ رات میں تمام برتن دھونے کے بعد سبرینا کو شدید تھکن کا احساس ہو رہا تھا اس لئے اس نے چائے بنانے کا پروگرام بنایا۔

”کیا سوچ رہی ہو کزن؟“ سبرینا کو اپنے عقیدے سے آواز آئی۔

”زیان تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا، خیریت تو مانا؟ کم ہی نظر آتے ہو تم جن میں کیا لیلے آئے ہو؟“ سبرینا کا اب مکمل دھیان چائے بنانے کی جانب تھا۔

”خیریت ہی تو نہیں ہے کزن۔“ زیان باتوں میں اکثر پہیلیاں پوشیدہ ہوتی تھیں۔

”کیا مطلب؟“ لمحہ بھر کے لئے تو سبرینا بیچ بچہ پریشان ہو گئی تھی۔

”امی جیٹھانی آپ ہیں مگر پچی کی رعب دار شخصیت سے تو کچھ اور ہی لگتا ہے۔“ سبرینا بھی گھبراہٹ اپنی بات کو تشویش کے رنگ میں ڈھال لیتی تھی۔

”میری پیاری سبرینا کیا کہنا چاہتی ہو؟ بات کے رخ کو صحیح سمت میں لے آؤ۔“ ماصفہ نے بڑی شائستگی سے سوال کیا تھا۔

”یہی کہ ہم شاید اس گھر میں مہمان ہیں، ہمارا حق کسی بھی چیز پر نہیں ہے۔“ سبرینا کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی نمودار ہو گئی تھی۔

”سبرینا ایسی باتیں نہ سوچا کرو یہ گھر سب کا ہے میں دین کے راستے پر چلتی ہوں اس لئے پرسکون رہتی ہوں تم بھی ایسی باتوں کو بھلا دیا کرو۔“ ماصفہ کے لہجے میں ہمیشہ کی طرح اطمینان تھا۔

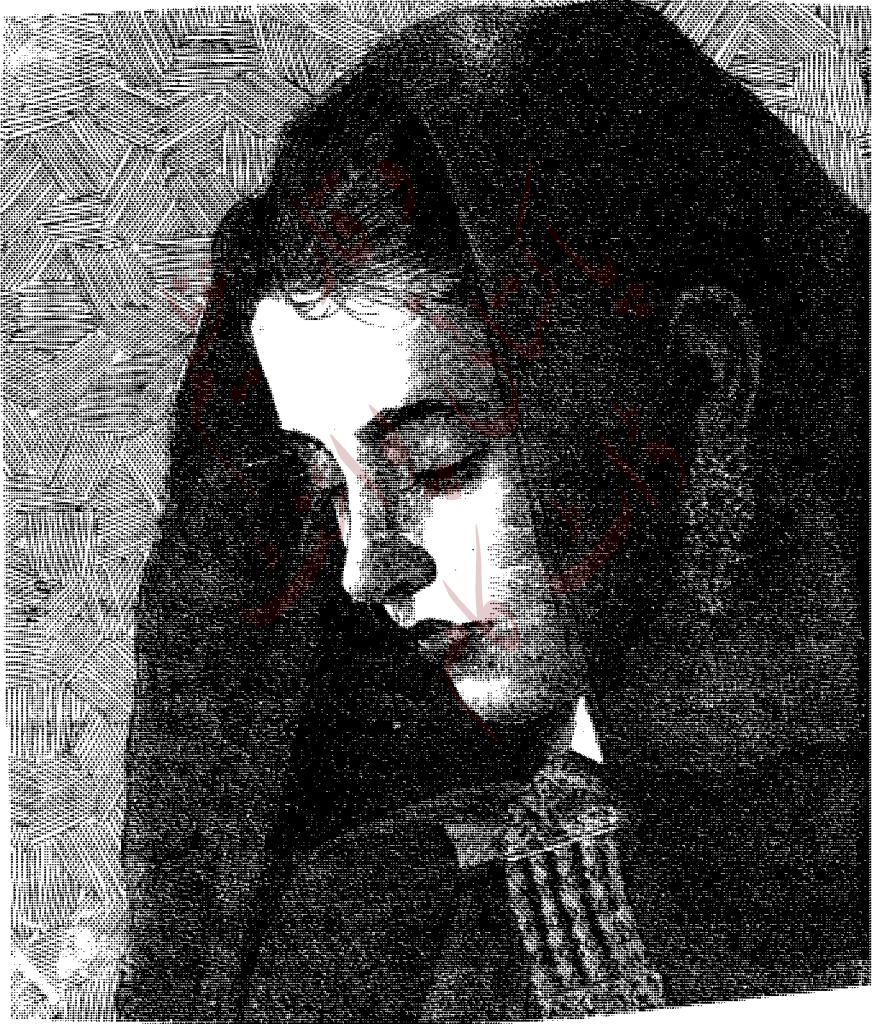
”امی آپ کی طرح صابر و شاکر بننا بڑا مشکل کام ہے آپ بہت اچھی ہیں۔“ سبرینا اپنی والدہ کے گلے لگ گئی۔

”واہ میری بچیاں تو بہت خوش نظر آ رہی ہیں۔“ سبرینا کی دادی جان کی انٹری سے ماحول خوشگوار ہو گیا۔

”دادی جان میں آپ کی بہو کی تعریف کر رہی تھی۔“ سبرینا کو چاچا تک شرارت سوچھی۔

”سبرینا بہت شریر ہو تم، ماصفہ میری بیٹیوں جیسی ہے تمہاری والدہ نے ہمیشہ سے ہی میرا بے حد خیال رکھا ہے، ماصفہ کا ہر حکم ماننا کرو ایسے تنگ نہ کیا کرو۔“ نگار بیگم کی بات سو فیصد درست تھی، ماصفہ اپنی ساس کو ہمیشہ ماں کا درجہ دیتی تھی اور کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیتا تھا کہ وہ غیر برادری سے آئی ہے۔

”میرا مطلب یہ ہے کہ سر میں کافی درد ہے ایک
 کپ چائے مجھے بھی دے دو۔“ زیان ہمیشہ سے ہی
 ات بدلتے میں ماہر تھا۔
 ”جی ضرور کیوں نہیں اس گھر میں موجود ہر شے
 آپ لوگوں کی ہی تو ہے، ہم کیا ہماری مجال کیا۔“
 سہرینا نے خود کو بخجیدہ کرنے کی کوشش کی تھی۔
 ”ارے نہیں کزن آپ بھی برابر کی حصے دار
 ہیں۔“ اب زیان کے چہرے پر مسکراہٹ کے
 تاثرات نمایاں ہو رہے تھے زیان اپنا چائے کا کپ
 اپنے ہاتھ میں تھام کر بچن سے باہر چلا گیا۔ سہرینا یہ



سوچتی ہی رہ گئی کہ نجانے اس محبت کا انجام کیا ہوگا۔
 ”سوئی گیس اور بجلی کے بل ہم ادا کرتے ہیں
 زیادہ تر راشن بھی ہمارے پیسوں سے آتا ہے مانا کہ
 تمہارے تایا دینی میں رہتے ہیں لیکن حرام کا مال نہیں
 بھیجتے ہیں اپنے سرکاری ملازم ظکرک باپ سے کہو نہیں
 پلاؤ کا سامان لادیں۔“ رقیہ بیگم سچ نے چاول کی
 پرات سبرینا کے ہاتھوں سے پھین لی۔

”امی کیا ہو گیا ہے یہ بھی بھلا کوئی لڑنے کی بات
 ہے، آپ کو معلوم تو ہے کہ سبرینا کو جھنڈیاں پسند نہیں
 ہیں اتنا ظلم مت کیا کریں۔“ زیان بچپن سے ہی اسی
 طرح سبرینا کی حمایت کرتا تھا۔

”تم ان معاملات میں مداخلت مت کیا کرو۔“
 رقیہ بیگم اس سے زیادہ کچھ اور نہ کہہ سکی تھیں کیونکہ
 زیان ان کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھا۔

☆☆☆☆

استور روم کے باہر کرسی سے ٹیک لگائے سبرینا
 ناول پڑھنے میں مشغول تھی افق پر موجود چاند پورے
 آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا رقیہ بیگم کی ٹانگوں
 میں درد رہتا تھا اس لئے وہ چھت کی جانب کم ہی آتی
 تھیں زیان اکثر سبرینا کے لئے کتابیں خرید لاتا تھا۔
 ”کزن پیدیکھو میں کیا لایا ہوں اپنے ناول سے
 باہر نکلو اور حقیقی ہیرو سے ملو سبز زیان ایک خوب رو
 نوجوان۔“ زیان کا مزاج بے حد خوشگوار تھا۔

”ہا ہا زیان..... تم مذاق اچھا کر لیتے ہو اور برائی
 لانے کی کیا ضرورت تھی شام والی بات میں بھول گئی
 تھی۔“ سبرینا نے اپنے چہرے پر مسکراہٹ کا خول
 چڑھا لیا تھا وہ اب صرف خوش رہنا چاہتی تھی۔

”لیکن میں نہیں بھولا تھا۔ برائی گرم ہے ابھی
 کھالو اور ہنسی مسکراتی رہا کرو۔“ زیان یہ کہنے کے بعد
 واپس جانے کے لئے ابھی مڑا ہی تھا اتنے میں رقیہ
 بیگم بھی چھت پر پہنچ چکی تھیں۔

”غضب خدا کا تو یہ کھیل کھیل جا رہا ہے ماصفہ

نیک پروین تم سوئی رہو گی کیا ذرا دیکھو تو تمہاری بیٹی کا
 کیا کارنامہ سرانجام دیتی ہے رات کے اندھیرے
 میں۔“ رقیہ کی آواز بلند ہوئی جارہی تھی اور چند ہی
 لمحوں بعد گھر کے سب ہی افراد اوپر آچکے تھے زیان کو
 افسوس ہو رہا تھا کہ اس کی وجہ سے سبرینا آج رسوا
 ہو رہی تھی۔

”ای اللہ گواہ ہے کہ ہم کسی بری نیت سے یہاں
 نہیں آئے تھے آپ کو یہ سب کر کے کیا ملے گا؟“ زیان
 کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

”زیان میں اندھی نہیں ہوں، پچھلے ایک ماہ سے
 یہ لڑکی تمہیں چھت پر بلوا رہی ہے، ایک دن جب تم
 سوئے ہوئے تھے میں نے خود سبرینا کی کالر ریسیو کی

تھی اور میرے پاؤں تلے تو زمین ہی نکل گئی تھی جب
 سبرینا نے کہا کہ ایک ماہ سے تمہاری راہ تک رہی ہوں
 اب مجھ سے انتظار نہیں ہوتا ہے جب تم اس ڈرامہ

کو مین کے شے میں نہیں آئے تو آج اس نے
 چاولوں کی منصوبہ بندی کی یہ لڑکی تو میری سوچ سے
 سچی زیادہ چالاک ہے۔“ رقیہ بیگم کی آنکھوں میں

سوا کی بے رحمی تھی کھڑے کھڑے رقیہ نے خود ساختہ
 کہانی گھڑ لی۔

”امی آپ بھی جانتی ہیں یہ الزامات بے بنیاد
 ہیں آپ بہت غلط کر رہی ہیں۔“ زیان کا ذہن
 ماؤف ہو رہا تھا ڈر اور بے بسی کے عفریت نے سبرینا

کو جکڑ رکھا تھا زیان چٹان کی مانند سبرینا کے آگے
 کھڑا ہوا تھا جبکہ سبرینا خود کو بے بس محسوس کر رہی تھی
 زندگی میں پہلی بار اسے احساس ہوا تھا کہ خود کو بے گناہ

ثابت کرنا بے حد مشکل امر ہے۔

اگلی صبح سبرینا کے والدین نے شہر چھوڑنے کی
 تیاریاں شروع کر دی تھیں وہ جانتے تھے کہ سبرینا بے
 قصور ہے لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اگر حالات اچھے

نہ ہوں تو الفاظ ساتھ نہیں دیتے ہیں ان کا قصور صرف
 غریب ہونا تھا اور آج کل کے ترقی پسند دور میں اس

سے بڑا جرم کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا ہے، زیان جب آفس سے واپس گھر لوٹا تو اک لامحدود خاموشی کو اپنا منتظر پایا، یوں لگ رہا تھا کہ جیسے سبرینا کے پورشن کے درود یوں اور شکوہ کر رہے ہیں۔

”سبرینا تم چلی گئی ہو، کاش یہ سب نہ ہوا ہوتا، یہ بوجھ مجھے سکون سے جینے نہیں دے گا۔“ زیان نے خود سے ہم کلامی کی اور مجھے دل کے ساتھ اپنے کمرے میں آ گیا۔

☆☆☆☆

پانچ ماہ خاموشی سے گزر گئے، دونوں فیملیز کا ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ ختم ہو گیا تھا، اسی دوران زیان کی منگنی اس کی خالہ کی بیٹی سے کر دی گئی تھی، فتنش بہت دھوم دھام سے ہوا تھا لیکن زیان اضطراب کا شکار ہو گیا تھا، اس کی سوچوں کا محور آج بھی نہیں بدلا تھا۔

”زیان سبرینا نہیں رہی۔“ زیان کی پھپھو نے دل دہلا دینے والی خبر سنائی تھی، رات کے پچھلے پہر عمو نا اسی طرح کے پیغامات دیئے جاتے ہیں، زیان کال اٹھینڈ کرنے سے قبل ہی کافی پریشان ہو گیا تھا۔

”پلیز ایسا مت کہیں وہ ہمیشہ اس طرح چھوڑ کر نہیں جاسکتی ہے۔“ زیان بے یقینی کے عالم میں بول رہا تھا۔

”یہ سچ ہے زیان، سنا ہے اس رات والے قصے کے کچھ دنوں بعد ہی نروس بریک ڈاؤن کے باعث اسے اسپتال لیے جانا پڑا، جان تو بچ گئی تھی لیکن پھر وہ بستر سے لگ گئی تھی اس کی ذہنی حالت آہستہ آہستہ خراب ہو گئی اور آج شام مغرب کی اذان کے بعد وہ مر گئی، زیان۔“ دشنہ نے موت کی وجہ بتادی تھی، زیان کی پوری فیملی آج سبرینا کے گھر موجود تھی، سبرینا کے تایا جان اپنی لاڈلی سبرینا سے آج کافی عرصے بعد مل رہے تھے لیکن آج وہ چڑیا کی طرح چپک نہیں رہی تھی، زیان کے لئے سانس لینا دشوار ہو رہا تھا، رقیہ بیگم روبرو کر معافی مانگ رہی تھیں، لیکن آج وہاں فقط سبرینا کا بے جان وجود موجود تھا، روح تو پرواز کر چکی تھی، زیان اب کمرے میں آ گیا تھا، باہر ہر طرف

آنسوؤں کا سیلاب تھا۔ رونے کی آوازوں کے باعث زیان کو ایسا لگ رہا تھا کہ اس کے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی، اتفاق سے زیان نے جس کمرے میں قدم رکھا تھا وہ سبرینا کا تھا، سامنے ٹیبل پر وہ تمام ناولز اور کتابیں موجود تھیں جو زیان نے سبرینا کو لا کر دی تھیں، سب سے نمایاں وہ ڈائری لگ رہی تھی جو اکثر زیان پڑھنے کے لئے مانگا کرتا تھا اور ہر بار سبرینا یہ کہہ کر انکار کر دیتی تھی کہ میری زندگی میں تو تم اسے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے ہو، ڈائری کے پہلے صفحے پر زیان کا نام بہت خوبصورتی سے لکھا ہوا تھا، سبرینا نے ہر نظم صرف زیان کے لئے لکھی تھی، زیان کی نظروں سے جب آخری نظم گزری تو اسے یوں لگا کہ جیسے سر پر آسمان ٹوٹ پڑا ہے، تاریخ سے ظاہر ہو رہا تھا کہ ایک سال قبل لکھی ہے، سبرینا کی محبت میں زیادہ شدت تھی۔

عشق سید ہے خیال رکھنا

دنیا کی ہر تہمت سے

تم اس کو بچا کر رکھنا

حرف آ بھی سکتا ہے

مگر تم یہ یاد رکھنا

محبت پاک ہوتی ہے

ذرا سی تھخیں لگنے پر

بہت سی ٹوٹ جاتی ہے

ہوں حالات جیسے بھی

کبھی نہ چھوڑنا مجھ کو

مجھے تم اپنی نظروں کے

ہمیشہ سامنے رکھنا

عشق سید ہے خیال رکھنا

سبرینا کی زندگی کا سفینہ وقت کے سمندر میں موجوں سے کھیلتا اور طوفانوں سے الجھتا، موت کے ساحل پر لنگر انداز ہو گیا تھا۔

☆☆☆☆

دلور کا کسے ملے

”اف خدا کتنا لیٹ ہو گئی ہوں۔“ ماہ نور نے خود سے ہمکھامی کی۔
”گلتا ہے آج کچھ نہیں ملے گا، آدھا گھنٹہ ہو گیا ہے۔“ خود سے بڑبڑاتی تھی۔
”نہ کوئی بس آرہی ہے نہ ہی کوئی رکشہ ہے، پوری سڑک سنسان ہے، پورے دن تو ٹریفک کا ہجوم ہوتا ہے۔“



”یہ لوگ میری طرف کیوں آرہے ہیں۔“ اس نے
 بھاگنے میں عافیت جانی، نہ جانے کس سمت بھاگ رہی
 تھی کچھ پتہ نہ تھا۔ بھاگتے بھاگتے وہ کافی دور نکل آئی
 تھی، اب تو بھوک کی وجہ سے بھاگا بھی نہیں جا رہا تھا۔
 اس نے پیچھے نظر گھمائی تھی تو جھوم اوجھل تھا نظر
 سے۔ اس نے سکھ کا سانس لیا تھا اور اب جلد ہی اسے
 گھر پہنچنا تھا۔ وہ روڈ پر کھڑی تھی سامنے روڈ کراس
 کرنے پر اسے رکشہ نظر آیا تھا۔
 اس نے جونہی روڈ کراس کرنا چاہی لینڈ کروزر نے

اچانک شور کی آواز سے وہ چونکی تھی۔ لوگوں کو دور
 سے آتا دیکھ کر جن کے ہاتھوں میں ڈنڈے تو کسی کے
 ہاتھوں میں ہاکی دیکھ کر وہ گھبرائی تھی۔
 اچانک کانچ سے لیٹ ہونے پر پوائنٹ نکل گیا
 تھا، اب واقعی وہ پچھتا رہی تھی، گھبراہٹ کے مارے
 جسم کی جان نکل رہی تھی۔ کہاں جائے، یونیورسٹی بھی
 کافی دور تھی اسٹاپ سے۔
 ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کیا کرے کہ لوگوں کی
 پاس آتی آواز نے متوجہ کر لیا تھا۔



تیر نے لگے تھے۔

”ارے ارے آپ رو کیوں رہی ہیں۔“ ریان نے جلدی سے قریب ہو کر کہا۔

”بابا بہت پریشان ہوں گے میرے لئے، پتہ نہیں میرا موبائل اور بیک کہاں گر گیا، بابا نے بہت کالیں کی ہوں گی مجھے۔“ وہ کہتے کہتے پھر رو دی تھی۔

”کرے آپ چپ ہو جائیں روئیں نہیں، آپ کے بابا کو کال کر دی ہے میں نے، وہ آتے ہی ہوں گے۔“ ہلدے چپ کر لیا تھا وہ تو ماہر تھا چپ کروانے میں کتنی ہی لڑکیوں کو لڑایا تھا اور کتنی ہی کو ہنسایا تھا اور یہ اس کا فن ہی تھا۔

”لیکن آپ کو میرے بابا کا نمبر کیسے ملا؟“ اس کی سوچ آخر زبان پر آئی تھی۔

”آپ کے موبائل سے لیا تھا وہ میری کار میں ہے ابھی لا دیتا ہوں۔“ ریان نے کہا تھا۔

”ماہ نور میری بچی کیسی ہے؟“ شاہد صاحب نے پیار سے پچکارے ہوئے کہا تھا۔

”بابا آپ آگئے، میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا، یہ دیکھیں۔“ ماہ نور نے بچوں کی طرح لپٹ کر کہا تھا اور اپنی چوٹیں دکھائی تھیں۔

”ہم ہم... دیکھیں یہاں بھی لگی ہے۔“ ماہ نور نے اپنے بازوؤں پر چوٹ دکھائی۔

”جلد ہی ٹھیک ہو جائیں گی، آپ تو بہادر بیٹے ہیں۔“ شاہد صاحب نے پیار سے کہا۔

☆.....☆.....☆

ریان حیدر کی یاں اس کے بچپن میں ہی چل بسی تھی، ریان حیدر کا تعلق ہائی سوسائٹی سے تھا۔ حیدر صاحب کی گارمنٹس فیکٹری تھی وہ نہایت ہی شریف انسان تھے مگر بیٹا غلط صحبت میں گزر گیا تھا۔ حیدر صاحب کا اور کوئی بیٹا نہ تھا۔ حیدر صاحب نے بہت سمجھایا تھا مگر وہ اپنی حرکتوں کو نہ چھوڑتا تھا، تنگ آ کر حیدر صاحب نے بولنا ہی چھوڑ دیا اور ریان بگڑتا ہی چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

اسے ہٹ کر دیا، گاڑی سے باہر آتا شخص بہت غصے سے دھاڑا تھا لیکن سامنے لڑکی کو خون میں لت پت پایا تو سارا غصہ کہیں جا سو یا تھا۔ جلدی سے گاڑی میں نازک سے وجود کو لٹایا تھا اور ہاسپٹل کے باہر ہی گاڑی کو روکھا تھا۔

☆.....☆.....☆

”مسٹر ریان! Now she is fine! اب وہ خطرے سے باہر ہے۔“ ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا۔

”Who is she?“ ڈاکٹر نے پوچھا۔

”کوئی نہیں ہے، ان کا ایکسیڈنٹ میری گاڑی سے ہوا تھا۔“ ریان حیدر نے بتایا تھا۔

”تو ان کی فیملی کو کیسے انفارم کریں گے وہ تو فکر مند ہوگی۔“ ڈاکٹر نے کہا، اپنی پریشانی میں وہ بھول گیا تھا سب۔

”اوہ... میں تو بھول گیا تھا، ان کا کچھ سامان میری گاڑی میں ہے شاید وہاں سے کچھ پتہ چل جائے۔“ ریان نے کہا تھا۔

”میں بس ابھی ان کی فیملی کو انفارم کر دیتا ہوں ڈاکٹر صاحب!“ وہ کہہ کر اپنی گاڑی کی طرف روانہ ہوا اور جلدی سے کار سے بیک نکلا تھا، بیک کو چھان مارا تو وہاں سے موبائل فون برآمد ہوا جس پر ماہ نور کی تصویر لگی تھی۔ تصویر میں وہ بلا کی حسین لگ رہی تھی، مہندی طر میں میک اپ کے ساتھ وہ پری لگ رہی تھی۔ وہ تصویر میں ہی کھو گیا تھا لیکن جلد ہی خود پر کنٹرول کرتا

contact چیک کیا تھا۔ ماہ نور کے نمبر میں بیلنس نہیں تھا تو اپنے نمبر سے کال کرنا پڑی تھی۔ ساتھ ہی ماہ نور کے نمبر سے اپنے پاس میسج بھی۔ وہ ایسا ہی تھا لڑکیوں سے دوستی کرنا اس کا مشغلہ تھا، جب دل بھر جاتا تو چھوڑ دیتا۔

☆.....☆.....☆

”مسٹر ریان! پیسٹ کو ہوش آ گیا ہے آپ مل سکتے ہیں۔“ نرس نے آ کر بتایا تھا۔

”اوکے ٹھیکس۔“ ریان نے کہا تھا۔ وہ جونہی کمرے میں داخل ہوا تو ماہ نور کی آنکھوں میں آنسو

”اودہ سوری مجھے آپ کا نام معلوم نہیں تھا، اینڈ آئی تھنک میں نے آپ کو نمبر نہیں دیا تھا“۔ نور کو عجیب محسوس ہوا، 2 ماہ پہلے کی بات تھی تو آج کیوں اسے میں یاد آئی تھی اور اس کے پاس نمبر کیسے آیا، کب سے پوچھنا چاہ رہی تھی آخر پوچھ لیا۔
”وہ نمبر اس دن میں نے آپ کے موبائل سے نکالا تھا“۔ ریان نے بتایا۔

”لیکن کیوں؟“ نور نے وضاحت چاہی تھی۔
”آپ کے ایکسیڈنٹ کے بعد آپ میرے خیالوں سے ایک پل نہیں گئیں، میں بہت چاہتا ہوں آپ کو“۔ اس نے صاف کہا تھا۔ جانتا تھا لڑکیوں کو پھنسانا اور یہ ہی سب نور کے ساتھ کر رہا تھا۔
”آپ نے میرے دل کا ایکسیڈنٹ کر دیا تھا“۔ ریان نے لفظوں سے چھانٹنا چاہتا تھا مگر وہ جانتی تھی لڑکوں کو پینڈل کرنا۔
”تو مسٹر ریان صاحب اپنے دل کا علاج اچھے ڈاکٹر سے کر دیا میں جا کر، یہاں کال کرنے کی ضرورت نہیں تھی آپ کو، اینڈ اب کال نہ آئے“۔ کہہ کر فون بند کر دیا۔
پھر کال آ رہی تھی۔

”اف خدا“۔ نور نے سوچ کر فون بند کرنا چاہا تھا مگر میچ فون نے توجہ اپنی طرف کر دائی تھی۔ نور نے جو نبی میچ کھولا تو ششدر رہ گئی۔

”نور! آپ کو یقین کرنا ہو گا مجھ پرور نہ میں اپنی جان دے دوں گا، اتنی محبت کے باوجود آپ کو یقین نہ دلا سکا تو میں مرجانا بہتر سمجھتا ہوں، اگر اگلے 5 منٹ تک جواب نہ آیا تو... میری آخری سانس بھی نکل جائے گی“۔ کتنی مکاری سے میچ کیا تھا، جانتا تھا کبھی انکی میزھی کر کے نکالنا تھا۔

”مرتا ہے تو مرے، بڑا عجیب انسان ہے مجھے اس سے کیا“۔ وہ سوچ کر بڑبڑاتی تھی۔
”لیکن نور تیری اس شخص نے جان بچائی تھی اور اس

”بابا! آپ اب تک سوئے کیوں نہیں“۔ نور نے کمرے کی لائٹ آن دیکھی تو اندر چل آئی۔
”جی بیٹا بس نیند نہیں آ رہی ہے کچھ سوچ کر“۔
شاہد صاحب نے صاف کہا تھا، وہ نہیں چاہتے تھے اب اور دیر کی جائے، جلد اپنے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے۔
”بابا! کیا پریشانی ہے آپ کو ہمیں بتائیے“۔ نور نے کہا۔

”نور میں چاہتا ہوں اب آپ کی شادی ہو جائے آپ بڑی ہو گئی ہیں، آپ کی ماما ہوتیں تو آج وہ آپ سے بات کرتیں مگر وہ نہیں ہیں تو مجھ پر ہی ذمہ داری ہے“۔ شاہد صاحب نے کہا تھا۔
”اور میری زندگی کا بھی کوئی بھروسہ نہیں ہے آج ہوں کل نہیں“۔ شاہد صاحب نے پیار سے کہا تھا۔
”بابا! آپ ایسا تو نہ کہیں، ماما کے بعد آپ ہی تو سب کچھ ہیں میرا، جیسے آپ چاہیں گے دیا ہی ہو گا“۔ نور نے رضامندی دے دی تھی، وہ بابا کو دیکھ دینا نہیں چاہتی تھی جنہوں نے کبھی کوئی کمی نہیں رکھی تھی ماہ نور کے لاڈ اٹھانے میں۔

☆.....☆.....☆

”افوہ کس کی کال ہے“۔ کب سے فون بج رہا تھا نور باتھ لے کر نکلی تو خود سے بڑبڑاتی تھی۔
بے دھیانی میں کال اٹھائی مگر تنک نہیں دیکھا تھا۔
”السلام علیکم!“ دوسری طرف سے مردانہ آواز میں جواب دیا گیا تھا۔
”جی فرمائیے آپ کون، کس سے بات کرنی ہے؟“ نور نے سوالیہ پوچھا۔

”میں ریان بات کر رہا ہوں“۔ اس نے کہا تھا۔
”کون ریان؟“ نور نے ذہن پر زور دیا، کچھ یاد نہ آنے پر پوچھ جاتا تھا۔

”جس کی کار سے آپ کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا“۔
ریان نے یاد دلایا۔

لی ہی جان لے رہی ہے، تو ایسا کیسے کر سکتی ہے۔“ ضمیر نے مجبور کر دیا، نہ چاہتے ہوئے بھی کال کر ڈالی تھی۔
کال جیسے ہی پک ہوئی نور سے برداشت نہ ہوا تو چلا اٹھی۔

”باگل ہو گئے ہیں آپ ایسے محبت کرتا ہے کوئی یوں دھمکیاں دے کر کسی کی محبت حاصل نہیں ہوتی۔“ اس نے روتے ہوئے کہا تھا۔ ریان اپنی فتح پر دل کھول کر خوش ہوا تھا۔

”اچھا بابا سوری اب نہیں کروں گا ایسا، نہ سوچوں گا، دیکھو کان بھی پکڑ لئے۔“ جیسے نور فون سے دیکھ رہی ہو۔

”اب تو معاف کر دو ناں۔“ وہ خاموش تھی، رو رہی تھی۔

”پلیز چپ ہو جاؤ ناں، تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں برداشت کر سکتا۔“ ریان نے پھر تیر پھینکا تھا۔

”ٹھیک ہے لیکن اب کبھی مرنے کی بات نہیں کریں گے، کوئی فضولیات نہیں کہیں گے، پراس کریں۔“ نور نے وعدہ لیا۔

”پراس... نہیں کروں گا۔“

نہ چاہتے ہوئے بھی نور ریان سے باتیں کرنے لگی اور نہ جانے کب وہ اسے اپنے دل میں بسائی تھی۔

☆.....☆.....☆

”ریان! بابا اپنے بزنس پارٹنر کے بیٹے سے میرا رشتہ کرنا چاہتے ہیں۔“ نور نے افسردگی سے بتایا۔

”جان آپ رشتہ تو کر لیں لیکن شادی مجھ سے ہی ہو گی۔“ ریان نے جان چھڑانی چاہی تھی اس ٹاپک سے۔

”مگر ریان میں کسی اور سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔“ نور نے رو ہوا سی ہو کر کہا۔

”آپ کب کریں گے بات اپنے پاپائے۔“ نور نے کتنی بار کا سوال پھر دہرایا تھا۔

”یار کر لوں گا کبھی، تم کیوں اتنی پاگل ہو رہی ہو۔“ ریان نے چڑتے ہوئے کہا تھا۔

”اس میں پاگل ہونے والی کون سی بات ہے کب کریں گے بات جب بابا میری شادی کر دیں گے۔“ نور صاف بات کرنا چاہتی تھی آج، کب سے وہ نال رہا تھا اسے۔

”تھک آچکا ہوں میں ان فضول سوالوں سے، کوئی جواب نہیں ہے میرے پاس، جہاں بابا کہیں وہاں ہی کرلو شادی۔“ ریان نے صاف انکار کیا تھا۔

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، کیا آپ کو مجھ سے محبت نہیں جو کسی اور کے ساتھ کا کہہ رہے ہیں۔“ ماہ نور نے کہا تھا۔

”ہاں نہیں ہے اور نہ ہی میں کبھی تم سے شادی کروں گا، ہاں اگر ویسے ہی بات کرنی ہے ریلیشن رکھنا ہے تو کوئی اعتراض نہیں۔“ ریان نے سفاکی سے کہا تھا۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا آپ کی باتوں پر، کھائیں میری قسم۔“ ماہ نور نے روتے ہوئے ریان کا ہاتھ سر پر رکھا تھا۔

”ہاں نہیں ہے محبت اب یہ ڈرامہ نہیں کرو رو کر۔“ ریان نے پھر اسے توڑ دیا تھا لفظوں سے۔

”اس کا مطلب آپ نے وقت گزاری کی تھی میرے ساتھ اور میں نادان سمجھ نہ پائی۔“

”ہاں یہی سمجھ لو۔“ ریان جان چھڑانا چاہتا تھا۔

”اف خدا کتنی بڑی بھول ہو گئی مجھ سے۔“ نور روتے ہوئے گھر گئی تھی۔ جا کر اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

وہ سونے کی تیاری میں تھا تھکن سے اس کے وجود میں درد ہو رہا تھا جو بنی وہ آنکھیں بند کر کے لیٹا نور کا چہرہ پوری آب و تاب سے اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں جگمگا رہا تھا۔ ریان نے فوراً آنکھیں کھولی تھیں۔

کچھ دیر بعد پھر آنکھیں بند کی تھیں مگر نور کی آواز اس کے دماغ میں گونجی تھی۔ اس کا روتا، اس کی باتیں، اس کی محبت یاد آ رہی تھی۔

”مگر وہ کچھ نہیں جو میں نے فیصلہ کر لیا ہے بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے، مجھے آپ کے فیصلے لینے کا پورا حق ہے، باپ ہوں آپ کا دشمن نہیں ہوں۔“ حیدر صاحب نے غصے سے کہا تو ریان بھی خاموش ہو گیا مگر وہ تو نور سے محبت کرنے لگا تھا، کیسے کرے گا کبھی اور سے شادی۔

”میں نور کو منالوں گا، پھر اس سے ہی شادی کر کے گھر لے آؤں گا، یا کو اپنا فیصلہ تبدیل کرنا پڑے گا۔“ وہ سوچ کر مطمئن ہو گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ نور کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، ایک ہی لمحے میں کیسے وہ بدیل گیا تھا۔ ابھی ریان نے اس کی شادی کی ڈیٹ بھی رکھ دی تھی مگر نور نہ تو کال اٹھاتی نہ ہی کالج جاتی۔ وہ روز کالج جاتا مگر نور نہ آتی تو وہ تھک کر اپنے گھر آ جاتا۔ اسی طرح دن گزرتے جاتے تھے مگر نور کو وہ تلاش نہ کر پایا تھا، شادی کی تاریخ قریب آ گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

نور نے اپنے دل کو کس طرح سمجھایا تھا یہ وہ ہی جانتی تھی یا اس کا خدا۔ اپنے بابا کو ہرٹ نہیں کرنا چاہتی تھی اور کرنی بھی کیوں، کس کے لئے، وہ سنگدل تو کب کا جا چکا تھا۔

آج بارات کے دن بھی وہ اپنے دل میں ریان کو ہی محسوس کر رہی تھی، کیا کچھ نہ سوچا تھا اس نے سب ختم ہو گیا تھا ایک پل میں۔

وہ آج دل میں چھپے آنسوؤں کو بہا دینا چاہتی تھی، ریان کو بھلا دینا چاہتی تھی۔

”بارات آگئی یا رات آگئی۔“ کے شور سے وہ اپنے حواس میں آئی تھی تھوڑی ہی دیر میں نکاح خواں کمرے میں داخل ہوا تھا، ساتھ کرن اور بابا بھی تھے۔ کب اس کا نکاح ہوا اسے کچھ خبر نہ ہوئی صرف ریان حیدر کے نام پر دل زور سے دھڑکا تھا یہ وہ ریان حیدر نہ تھا۔ دل بھی کتنا نادان ہے ناں اس کو یہی

”افوہ کیا مصیبت ہے، کیا ہو رہا ہے مجھے، وہ کیوں مجھے یاد آ رہی ہے۔“ پوری رات وہ سو نہیں سکا تھا۔ نور کی آواز ہر سو بھیلی ہوئی تھی۔

وہ ناچا جتے ہوئے بھی اسے سوچے جا رہا تھا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے آج سے پہلے تو بھی اس طرح نہیں ہوا تھا کتنی ہی لڑکیوں کا دل توڑا تھا، کتنی ہی لڑکیوں کے ساتھ تھیل چکا تھا کبھی اس طرح نہیں ہوا تھا، کبھی کسی کا چہرہ یاد نہ آیا تھا مگر آج اس ایک لڑکی نے اس کا سکون چھین لیا تھا، آج نور کی آنکھوں کے آنسو اسے چین نہیں لینے دے رہے تھے۔

”اف خدایا! مجھے سونا ہے dont think about Noor“ وہ اپنی سوچ کو جھٹک کر سونا چاہتا تھا، مگر نیند اس کی آنکھوں سے روٹھ گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

پوری رات نیند نہ آنے کی وجہ سے آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں وہ جوہنی ناشتے کی ٹیبل پر آیا تھا یا کو اپنا منظر پایا تو جھٹ سلام کر ڈالا۔

”گڈ مارننگ، ہائے سن!“ حیدر صاحب نے جواب دیا۔

”بیٹھو یہاں۔“ حیدر صاحب نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ”مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“ حیدر صاحب نے کہا۔

”جی پاپا کہیے۔“ آج ریان بالکل پہلے والے ریان سے مختلف لگ رہا تھا۔

”میں نے اپنے بڑے بڑے پارٹنر کی بیٹی سے تمہاری شادی پکی کر دی ہے۔“ حیدر صاحب نے ریان پر ہنسی پھوڑا۔

”واٹ... جی، پاپا کیا میں نے جو سنا ہے وہ۔“ ”ہم... بالکل ٹھیک سنا آپ نے۔“ حیدر

صاحب جانتے تھے وہ ایسا ہی ری ایکٹ کرے گا۔ ”مگر پاپا! آپ ایسا کیسے کر سکتے ہیں میری بے مرضی کے خلاف، میں یہ شادی بالکل نہیں کروں گا۔“

”ماہ نور نام ہے اس کا، میں نے اسے بہت چاہا ہے بہت لیکن جب چاہا جب وہ مجھے چھوڑ گئی، مجھے خود سے الگ کر گئی، لیکن مجھے اسی سے محبت ہے، میں کبھی کسی کو نور کی جگہ نہیں دے سکتا، کبھی بھی نہیں۔“ ریان نے مجھے لہجے میں کہا تھا۔

”تو نور کو ہی جگہ دے دیں جو نور کی ہے۔“ اس نے گھونکھٹ ہٹایا تھا اور ریان کے سامنے آئی تھی۔ ریان پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ”نور تم، یہاں کیسے۔“ ریان نے جھٹ جانتا چاہا تھا۔ ”آپ نے انگل سے پوچھا نہیں تھا نام، میری طرح بالکل میں بھی انجان تھی، آپ کی طرح مگر دیکھئے ناں جسے چاہے رب ملادے۔“

”نور! مجھے معاف کر دو میں نے تمہارا دل توڑا مگر میں خود بے سکون ہو گیا تھا، ہر بل تمہیں یاد کرتا، ہر لمحے نہیں سو جاتا تھا، پاگل ہو گیا تھا میں۔“ ”میں نے معاف کیا تمہیں مگر ایک شرط پر؟“

نور نے کہا تھا۔ ”اگر کبھی کسی لڑکی کو دیکھا بھی ناں یا مجھے چھوڑ کر پھر سے گئے ناں تو بھی آپ کو معاف نہیں کروں گی۔“ نور نے روتے ہوئے کہا تھا۔ ریان جانتا تھا نور اسے بہت چاہتی ہے تو کیسے نہ شرارت کرتا۔ ”اور اگر چلا گیا پھر کہیں تو....“

نور نے شرارت سمجھتے ہوئے کہا تھا۔ ”تو میں آپ کو جان سے مار دوں گی۔“ ریان نے تہقیر لگایا تھا۔

”ہم تو ویسے ہی قتل ہو گئے ہیں آپ کو دیکھ کر۔“ ریان نے سرگوشی میں کہا تھا۔

”ایک بات کہوں؟“ ریان نے کہا تھا۔ ”جی۔“

”بہت حسین لگ رہی ہو، بالکل حقیقی پری۔“ ریان نے کہا تھا، نور نے نظریں نیچے کر لی تھیں۔

☆.....☆.....☆

پتا ہے جو سب سے زیادہ تکلیف دیتا ہے۔

نکاح کے نور ابعد ہی نور کا چہرہ گھونکھٹ میں چھپا دیا گیا تھا کب وہ رخصت ہو کر پیا گھر آئی تھی اسے معلوم بھی نہ ہوا تھا۔

☆.....☆.....☆

ساری رسومات کے بعد نور کو کمرے میں بٹھایا گیا تھا۔ نور نے کمرے پر پٹر سری سی نگاہ ڈالی تھی، پورا کمرہ سرخ اور وائٹ گلابوں سے سجا تھا۔ پردے بھی ریڈ اور وائٹ کنٹراس میں لگائے تھے ہر طرف پھول بھرے تھے۔

بیڈ کے اطراف میں بھی سرخ گلابوں کی لڑیاں لٹک رہی تھیں، ابھی وہ کمرے کا جائزہ ہی لے رہی تھی اچانک کمرے میں آتے شخص کو دیکھ کر کبھی اسے اپنا ریان لگا تھا۔

ریان حیدر کی صورت میں بھی اسے ریان ہی لگا تھا مگر یہ ریان اس ریان سے تھوڑا مختلف تھا، بڑھی شیو بال بھی بکھرے پڑے تھے آنکھوں سے لگتا تھا لتنی راتوں سے رت چلے کیے ہوں، جیسے جیسے وہ بیڈ کے قریب آتا گیا نور کا گھونکھٹ میں چھپا چہرہ مزید نیچے ہو گیا۔ اس کا دل زور سے دھڑک رہا تھا۔

کیا ہونا تھا اب وہ نہیں جانتی تھی، اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں مگر گلے ہی پل ابھرنی آواز نے اسے چونکا دیا تھا۔

”تم جو کوئی بھی ہو یہاں صرف پاپا کی خواہش پر آئی ہو، میرے دل میں نہ تم بھی آئی ہو نہ ہی آؤ گی، یہ سب پاپا کی ضد کا نتیجہ ہے ورنہ میں تم سے کبھی شادی نہ کرتا، میں تم سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا مگر پاپا کی ضد نے مجبور کر دیا مجھے، میں کسی اور کو چاہتا ہوں۔“ وہ نور کو بغیر دیکھے ہی سب کہہ رہا تھا چونکہ وہ گھونکھٹ میں تھی، آواز کو پہچان کر اسے یقین ہو گیا تھا، یہ وہی ریان ہے جس سے اس نے محبت کی مگر وہ آج بھی ایسا ہی تھا۔ وہ پہلے بھی اس کی محبت کو ذلیل کر چکا تھا آج پھر وہ رسوا تھی۔

وہ بمشکل بولی پانی تھی۔ ”کون... کون...؟“

ادب و ادب

نہیں بول پایا تھا اور شوہر کے چہرے پر بھیلی تشویش اور ادھوری جملے نے لائیبہ کی پریشانی کئی گنا بڑھا دی تھی اس کے رونے میں یکدم ہی اضافہ ہو گیا تھا۔ ”بچوں کی طرح بی ہیومت کرو لائیبہ خود کو سنبھالو اور دعا کرو کہ ہمارا حظلہ جہاں بھی ہو خیریت سے ہو اور ساتھ خیریت سے گھر آ جائے۔“ بیوی کا رونا کہاں برداشت ہوا تھا وہ دھتے سر اور بڑھتی فکر کے ساتھ قدرے غصہ سے بولا تھا۔

”کئی گھنٹوں سے میرے بچے کا پتہ نہیں ہے اور اب سب کہتے ہیں میں حوصلہ کروں تو نہیں ہوتا مجھ سے حوصلہ دانش۔“ اس کی ہچکیاں بندھنے لگی تھیں اریبہ نے آگے بڑھ کر بہن کو سہارا دیا تھا اس وقت لغاری ہاؤس میں کئی لوگ موجود تھے مگر موت کا سنا سنا طاری تھا جس میں لائیبہ کی سکلیاں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں دانش لغاری اپنے والدین کا اکوٹا بیٹا جو پرائیویٹ کمپنی میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا دانش سے چھوٹی دونوں بہنیں عائشہ اور ثانیہ شادی شدہ تھیں دانش کے والد کا تقریباً دو سال قبل انتقال ہوا تھا اور وہ اپنی والدہ کے ساتھ ہی لغاری ہاؤس میں ریائش پذیر تھا دانش کی شادی خالد زاد لائیبہ سے ہوئی تھی اور ان کے تین بچے تھے ایک بیٹا حظلہ سے چھوٹی سیارہ فانیو کلاس کی اسٹوڈنٹ تھی لائیبہ لوگ دو بہنیں تھیں اور بھائی کوئی نہیں تھا اریبہ بڑی بہن سے تقریباً چار سال چھوٹی تھی اور جامعہ کراچی میں ایم اے انگریزی کی طالبہ تھی حظلہ ماں باپ اور خاص کردادی کا بے حد لاڈلا تھا جس کی عمر چودہ سال تھی خوبصورت آنکھیں

”آپی! خدا کے لئے سنبھالیں خود کو حوصلہ رہیں حظلہ خیریت سے ہوگا، کچھ دیر میں آ جائے گا۔“ اریبہ نے اپنے سے چار سال بڑی بہن کو تسلی دی تھی جو رور و کرادھ موئی ہوئی ہوئی جارہی تھی اور اس کی یہ حالت پچھلے چھ گھنٹوں سے تھی کہ اس کا اکوٹا بیٹا جو جماعت ہفتم کا طالب علم تھا معمول کے مطابق شام کے ساڑھے پانچ بجے مدرسے سے واپسی کے بعد کرکٹ کھیلنے گیا تھا اور اب تقریباً دس بج گئے تھے اور ہنوز اس کی واپسی نہیں ہوئی تھی جبکہ حظلہ روز کوئی ساڑھے پانچ، بونے چھ بجے کرکٹ کھیلنے جاتا تھا اور سات بجے سے قبل اس کی واپسی ہو جانی تھی وہ جب سے ہی پریشان ہو رہی تھی اور جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا اسے اپنا دل بند ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔

”اریبہ! میرا بچہ چھ گھنٹوں سے گھر سے باہر ہے اس کا کہیں پتہ نہیں ہے میں کیسے حوصلہ رکھوں۔“ لائیبہ کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں اسی وقت آٹھ ہوئی تھی وہ دانش کو دیکھ کر لپک کر اس تک پہنچی تھی۔ ”دانش! کچھ پتہ چلا کہاں ہے میرا حظلہ۔“ وہ بہتی آنکھوں سے دکھ کی تصویر بنے شوہر سے سوال کر رہی تھی۔

”تم پریشان نہ ہو لائیبہ۔“ دانش خود بیٹے کو کئی گھنٹوں سے کئی محلے میں ڈھونڈتا رہا تھا اس کے دوستوں سے پوچھا تھا مگر ہر طرف سے مایوسی کا سامنا تھا کہ جن محلے کے بچوں کے ساتھ مل کر وہ کرکٹ کھیلتا تھا ان سب کا یہی کہنا تھا کہ آج حظلہ گراؤنڈ میں آیا ہی نہیں اور یہ بات انتہائی تشویشناک تھی اور وہ خود اس قدر مضطرب اور پریشان تھا کہ بیوی کو دو حرف تسلی کے



مجھے گھر پہنچا تھا اور حظلہ کو ڈھونڈتا پھر ہاتھ مگر وہ کہیں مل کر نہیں دیا تھا۔

”ایسے کب تک ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہیں گے میرا خیال ہے ہمیں پولیس میں رپورٹ کرنی چاہئے۔“ لائبہ کے والد نے نواسے کو ڈھونڈنے میں داماد کی مدد کی تھی اور ناکام سے لوٹ کر آئے تھے اور بیٹی کو روتے دیکھ کر تفکر سے بولے تھے گزرتے وقت نے ان سب کو سہا دیا تھا پولیس میں رپورٹ کر دی گئی تھی مگر پورے چوبیس گھنٹے گزر گئے تھے حظلہ کا کچھ پتہ نہیں چلا تھا، دانش لغاری نے کچھ سوچ کر رینجرز کی مدد لی تھی تین دن گزر گئے تھے لائبہ کی بہت پری حالت تھی چوتھے دن کا آغاز ہوا تھا کہ کینل ہوئی تھی دانش لغاری نے دروازہ کھولا تھا اور حظلہ کو دیکھا اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا تھا حظلہ لپک کر باپ کے سینے سے آگاہ تھا لائبہ یار بار بیٹے کو چوم رہی تھیں ساتھ ساتھ روتی جا رہی تھیں گھر بھر میں خوشی کی لہر دو گئی تھی۔

”اپنی ماما چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے۔“ لائبہ بری طرح رورہی تھی دانش نے اریہ کو اشارہ کیا تھا وہ حظلہ کو لینے اس کے کمرے میں چلی گئی تھی۔

”تم نشاور لے لو تب تک میں تمہارے لئے ناشتہ بنوائی ہوں۔“ اریہ بھانجے کو دیکھ کر شفقت سے بولی تھی اور ناشتہ کے بعد حظلہ سے تفصیل پوچھنے کا آغاز ہوا تھا، تفصیل ایسی تھی کہ لائبہ نے بیٹے کو خود سے پلپٹا لیا تھا۔

”یا اللہ تیرا شکر ہے۔“ وہ بیٹے کے ماتھے پر بوسہ دیتے ہوئے رو پڑی تھیں اسی وقت ملازمہ نے آفیسر کے آنے کی اطلاع دی تھی دانش لغاری ان سے ملے تھے اور بیٹے کو بلالیا تھا۔

”کہاں گئے تھے تم؟“ آفیسر نے سمجھ کر تھپڑ لگاتے ہوئے استفسار کیا تھا حظلہ رونے لگا تھا تو انہوں نے ایک اور تھپڑ لگایا تھا اور تفتیش کا آغاز کیا تھا

بھرا بھرا جسم صاف گوری رنگت وہ اپنی عمر سے کافی بڑا لگتا کہ اس کی جسامت ڈبل ڈول کافی اچھا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ بچپن سے ہی اپنی بے انتہا خوبصورتی کی وجہ سے جلد سب کی نظروں میں آ جاتا تھا اور مزاج بھی کافی ہنس مکھ تھا جس سے ملا دوستی ہو گئی اور پچھلے سال سے تو وہ موبائل بھی استعمال کر رہا تھا کہ جب اسکول میں دوست موبائل اور فیس بک کی باتیں کرتے دانش ایپ نمبرز کا تبادلہ ہوتا دیکھتا تو ضد پکڑ لی کہ اس نے بھی موبائل رکھنا ہے اور دانش لغاری نے وقت کی ضرورت اور جدید تقاضوں کو سمجھتے ہوئے بیٹے کو مہنگا ترین موبائل سیٹ دلوا دیا تھا لائبہ کو اعتراض تھا وہ حتی المقدور کوشش کرتی تھی کہ نظر رکھے مگر اس کی اپنی مصروفیات تھیں گھر اور دیگر ذمہ داریوں میں الجھ کر وہ دھیرے دھیرے اس طرف سے قدرے غافل ہو گئی تھی کہ بیٹی کے پاس کن دوستوں کی کالز آتی ہیں بیٹا موبائل پر کیا کرتا رہتا ہے دونوں بچے دادی سے بہت اچھڑتے تھے مگر الماس لغاری کی بھی اپنی مصروفیات تھیں فیس بک آئی ڈی کو ٹائم دینا موبائل پر دوستوں اور رشتہ داروں سے رابطے میں رہنا اور لی وی ڈرامے دیکھنا ان تمام مصروفیات کے سبب وہ بھی بچوں پر کم توجہ دے پائی تھیں کہ ان کی تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ موجودہ زمانے کے تقاضے کے نام پر غیر ضروری ان کی عمر سے مطابقت نہ رکھتی ہوئی سرگرمیاں عروج پر تھیں حظلہ شوخ مزاج کا کھلنے ملنے والا بچہ تھا اسکول میں کافی فرینڈز تھے پورے محلے میں بھی مشہور تھا آج جب مدرسے سے واپس آیا تھا اس کے پاس ایک کال آئی تھی اور وہ گراؤنڈ جانے کے بجائے کال پر جو پلان ترتیب دیا تھا اس جگہ پر پہنچ گیا تھا مگر اس بات سے لائبہ لاعلم تھی اور جب وہ کافی دیر تک گھر نہیں آیا تھا تو اس نے دانش کو کال کی تھی جو ریٹک میں پھنس گیا تھا اور معمول کے مطابق سات بجے کے بجائے بیوی کی کال کے بعد پریشان سا آٹھ

اور حظلہ نے وہی تفصیل جو گھر والوں کو بتائی تھی وہی آفیسر کو بتانا شروع کر دی تھی۔

☆☆☆☆

”پچھلے سال ہم سب گھر والے نادرین ایریاز تفریح کے لئے گئے تھے اسلام آباد کے ہول کے ایک ویٹر سے میری دوستی ہو گئی تھی اس کا نام جبار خان تھا اس نے مجھے اپنا موبائل دے کر کہا تھا کہ میں اس سے رابطے میں رہوں وہ انکل ویٹر بہت اچھے تھے بہت پیاری باتیں کرتے تھے اس لئے میں نے ان سے وعدہ کر لیا تھا کہ میں ان سے رابطے میں رہوں گا اس لئے میں نے ان کا نمبر سیو کر کے انہیں اپنا موبائل نمبر دے دیا تھا، تقریباً چھ ماہ قبل میرے پاس انکل ویٹر کی کال آئی تھی اس کے بعد اکثر انکل ویٹر مجھے کال کرنے لگے تھے کبھی کبھی میں بھی انہیں کال کر لیتا تھا ہمارے درمیان گفتگو کچھ خاص نہیں ہوتی تھی بس وہ میری ایجوکیشن کا پوچھتے تھے اور ہمیشہ تلقین کرتے تھے کہ میں دل لگا کر پڑھوں ایک ہفتہ قبل ان سے میری بات ہوئی تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ وہ مجھے بہت یاد کر رہے ہیں اور مجھ سے ملنا چاہتے ہیں میں نے انکل ویٹر سے کہا کہ ان سے ملنا تو میں بھی چاہتا ہوں لیکن مل نہیں سکتا دو ماہ بعد میرے ایگزامز میں اب تو جون جولائی کی چھٹیوں میں ہی ملنا ممکن ہوگا اس پر انہوں نے کہا کہ وہ کراچی آئے ہوئے ہیں اور مجھ سے ملنا چاہتے ہیں میں نے کہا میں اپنی ماما کے ساتھ ان سے ملنے آؤں گا وہ اس پر بولے کہ وہ مجھ سے اکیلے میں ملنا چاہتے ہیں انہوں نے کہا کہ وہ مجھ سے عمر میں بہت بڑے ہیں اس لئے میں ماما کو ان کے بارے میں بتاؤں گا تو ماما ملنے سے منع کر دیں گی اور مجھے ان کی بات درست لگی تھی پھر انہوں نے مجھے کچھ اتنی محبت سے ملنے پر اصرار کیا کہ میں ماما کو بتائے بغیر الدین پارک پہنچ گیا جہاں وہ انکل موجود تھے انکل نے مجھے بہت پیار کیا اور مجھے

جھولے بھی جھلائے ساتھ ہی برگرار کوک بھی لے کر دی میں بہت خوش تھا والدین میں گھومتے ہوئے انکل نے مجھے اسلام آباد چلنے کی آفر کی انکل ویٹر بات اتنے پیار سے کرتے تھے کہ میں انہیں انکا نہیں کر پایا اور میں گھر میں بتائے بغیر ٹرین میں انکل ویٹر کے ساتھ سفر کرنا اسلام آباد پہنچ گیا ٹرین میں میری آنکھ لگ گئی تھی تب ہی کسی نے موقع کا فائدہ اٹھا کر میرا موبائل اور پیسے چوری کر لئے تھے (حظلہ کا موبائل اور پیسے ویٹر نے ہی نکال لئے تھے اس بات سے حظلہ انجان تھا) میں انکل ویٹر کے ساتھ کراچی سے اسلام آباد پہنچ گیا اور مجھے اب ماما کی فکر ہوئی میں نے انکل ویٹر سے کہا کہ میرے ماما بابا میرے لئے پریشان ہو رہے ہوں گے اس پر ویٹر انکل نے کہا کہ وہ میرے گھر کال کر دیں گے میں چپ ہو گیا مجھے ویٹر انکل نے ہول کے ایک کمرے میں ٹھہرایا تھا وہ مجھ سے بات کر رہے تھے انہوں نے میری فیکل کے بارے میں پہلے بھی کافی کچھ پوچھا تھا اب نئے سرے سے پوچھ رہے تھے قریب کے ہی نہیں دور کے رشتے داروں کا بھی پوچھا تھا اور تب میں نے انہیں بتایا تھا کہ میری آئی کے فیائسی جیو میں ہوتے ہیں تب ویٹر انکل نے شیراز انکل کے بارے میں پوچھا تھا مجھے جتنا پتہ تھا انہیں بتا دیا تھا پھر کل رات انہوں نے مجھے پیسے دیئے اور ٹرین میں بٹھا دیا اور میں گھر واپس آ گیا۔ حظلہ نے ایک ایک بات مکمل تفصیل کے ساتھ کہہ دی تھی آفیسر نے حظلہ کو آئندہ اس طرح کسی کے ساتھ جانے پر کافی کچھ سمجھایا تھا پھر پاکستان رینجرز اور پاکستان پولیس ایکشن میں آگئی تھی حظلہ سے اس ویٹر کا نام اور حلیہ پوچھ کر اس کا نمبر لیا گیا تھا حظلہ ہتھم جماعت کا ایک شارپ طالب علم تھا اسے ویٹر کا نمبر یاد تھا پاکستان رینجرز حظلہ کی دی معلومات کے ذریعے ویٹر ٹنگ پہنچ گئی تھی ویٹر جبار خان کا ایک پورا گینگ تھا جو بچوں کو

موبائل فون کا لم مری میں استعمال ہے جب والدین موجودہ زمانے کی ضرورت سمجھ کر اولاد کو آسائش مہیا کرتے ہیں تو ان پر یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ چیک اینڈ بیلنس بھی ساتھ ساتھ رکھیں ورنہ تباہی ان کے بچوں کا مقدر بن جاتی ہے لائبہ نے اپنے بیٹے کو سینے سے لگاتے ہوئے آئندہ اس کی طرف سے لاپرواہی برتنے سے توبہ کر لی تھی پاکستان ریٹائرڈ کے آفیسر ایک آخری بار ان کے گھر آئے تھے حظلہ نے آفیسر کو دیکھ کر بے ساختہ اپنے گال پر ہاتھ رکھ لیا تھا جس پر انہوں نے زیر لب مسکراتے ہوئے حظلہ کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

”وہ تھپڑ نہیں تمام عمر تمہاری غلطی کا نہ صرف احساس دلانے کا نہیں آئندہ غلطی کرنے سے بھی محفوظ رکھے گا جب تم اپنے گھر والوں کو دھوکہ دے کر کسی کی چکنی چڑی باتوں میں آنے لگو تو اس تھپڑ کو ضرور یاد کر لیتا“۔ وہ حظلہ کے کاندھے پر ہاتھ رکھے اپنے مخصوص دبک انداز میں بولے تھے حظلہ نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

”انکل! میں آئندہ ایسی غلطی کبھی نہیں کروں گا میں نے ممّا پاپا سے بھی سوری کر لی ہے آپ سے بھی سوری میری وجہ سے آپ پریشان ہوئے“۔ وہ ندامت سے بولا تھا۔

”یہ ہماری ڈیوٹی ہے برخوردار! اس لئے ہم پریشان نہیں ہوتے“۔ وہ اس کے کاندھے سے ہاتھ ہٹاتے دانش لغاری سے مصافحہ کرتے چلے گئے تھے دانش لغاری نے اپنے بیٹے کو سینے سے لگایا تھا لائبہ اپنے بیٹے کو دیکھتی دل ہی دل میں رب کا شکر ادا کرتی مطمئن ہو گئی تھی اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اب کبھی اپنے بچوں کی طرف سے لاپرواہی کا مظاہرہ نہیں کریں گی دانش بھی یہی سوچ رہا تھا اور بیٹے کو مسکراتے دیکھ کر مسکرا دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

اس طرح بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ رکھتا تھا یوں اغواء کیے جانے والے بچوں کے ساتھ جنسی زیادتی کی جاتی تھی اور انہیں فروخت کر دیا جاتا تھا جبار خان نے آفیسر کو تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا تھا کہ اسلام آباد کے مختلف سات ہوٹلوں میں ان کے کارندے بطور ویٹر تعینات تھے وہ ہوٹلوں میں قیام کرنے اور کھانے وغیرہ کے لئے آنے والی فیملیز پر نظر رکھتے تھے اور ہشتم جماعت تک کے کمسن بچوں کو بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ رکھتے تھے ان کے ساتھ جنسی زیادتی کرتے تھے اور آگے پارسل کر دیتے تھے حظلہ جو کہ ایک خوبصورت بچہ تھا اس پر جبار خان کی نیت پہلے ہی دن خراب ہو گئی تھی اس لئے اس نے دوستی کی تھی اور فون پر رابطے کے بعد اسے اسلام آباد لانے میں کامیاب ہو گیا تھا، مگر وہ اپنے مکروہ ارادے کو عملی شکل دیتا اس سے قبل ہی حظلہ نے اسے ڈر دیا تھا وہ جو نیوز کا سن کر ہی خوفزدہ ہو گیا تھا اس لئے اس نے بہت چاہنے کے باوجود بھی حظلہ کے ساتھ کسی قسم کی بدتمیزی نہیں کی تھی اور اپنے گینگ کے سربراہ سے رابطہ کیا تھا پھر اس کے مشورے پر ہی حظلہ کو واپسی کی ٹرین میں بٹھا دیا گیا تھا وہ جو اس بات کے ڈر سے کہ کہیں اس بچے کے ذریعے مسٹیا ان تک نہ پہنچ جائے انہوں نے بچے کو کسی قسم کا نقصان پہنچانے بغیر آزاد کر دیا تھا جبار خان نے اپنے اپنی طرف سے حظلہ کو کسی کو کچھ بتانے سے منع کیا تھا مگر جب فوجی ہاتھ پڑتا ہے تو اچھے اچھے بول پڑتے ہیں پھر وہ تو ایک معصوم بچہ تھا جبار خان کا پورا گینگ پڑا گیا تھا دانش لغاری نے صدقے کے بکرے دیئے تھے لائبہ نے بھی رب کا شکر ادا کیا تھا کہ اس کا بیٹا زندہ سلامت لوٹ آیا تھا حظلہ کی قسمت اچھی تھی کہ وہ واپس آ گیا تھا ورنہ ایسے کتنے ہی بچے جب ایک بار گھر سے جاتے ہیں تو واپسی ان کا مقدر نہیں بن پانی اس طرح کے معاملات میں قصور وار والدین کی لاپرواہی اور

مریم علی احمد

افسانہ

مایا

ہاجرہ کا وجود کب تک دھوپ میں جلتا رہا، لیکن
ہاجرہ کے لئے سورج کی دھوپ اس کے غموں کی دھوپ
کے سامنے بے ضرر تھی، جو اس نے اپنی زندگی میں
دیکھی تھی۔ دھوپ کی تپش اس آگ کے مقابلے میں



کچھ بھی نہیں تھی جس میں اس کا وجود جل رہا تھا۔ کچھ لوگوں کی زندگی صرف اور صرف آزمائش اور دکھ تکلیفیں برداشت کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ ہاجرہ کا شمار ان ہی لوگوں میں ہوتا تھا۔ اس کی زندگی میں سکھ کا بادل بہت تھوڑی دیر کے لئے ٹھہرا تھا۔ اس نے اپنی زندگی اپنے لئے نہیں جی تھی، اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ بوجہ بن کر رہ جائے گی، اس کی اولاد جس کے لئے اس نے اپنی جوانی، اپنی ذات، اپنی خواہشات اور اپنے آرام کو پس پشت ڈالا تھا وہی اولاد اس کو در بدر کر دے گی۔ زندگی کی فلم اس کی آنکھوں کے سامنے چلنے لگ گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

ہاجرہ کے نصیب بشیر کے ساتھ لکھے گئے تھے۔ بشیر ہاجرہ کی بڑی بھائی کا بھائی تھا۔ جس کو کوئی اپنی بیٹی نہ دیتا تھا، اس کی سستی اور کاہلی کی وجہ سے، وہ ہاجرہ کے لئے چنا گیا تھا۔ ہاجرہ زیادہ بڑھی لکھی نہ تھی، ایک صاف دلی کی قرآن پاک پڑھی معمولی شکل و صورت کی لڑکی تھی۔ ہاجرہ نے اس کے گھر میں قدم رکھے تو باقی لڑکیوں کی طرح بہت سے اربابان دل میں سچائے ہوئے تھے لیکن وہ شاید یہ بھول گئی تھی کہ کچھ لوگوں کے لئے زندگی صرف امتحان ہوتی ہے۔

ساس سر کے ہوتے ہوئے اس کے لئے زندگی دو بھر کرنے والوں کی کمی نہ تھی۔ ساس نے پہلے دن ہی اس سے سارا زور ہتھ لیا تھا۔ سر صاحب کا کام نقطہ چینی تھا اور وہ اپنا کام بخوبی سرانجام دے رہے تھے۔ بشیر کیسا انسان تھا، اس کا اندازہ وقت کے ساتھ ساتھ ہاجرہ کو ہو رہا تھا۔ جب وہ شادی کو مہینہ گزر جانے کے بعد بھی بیڈ پر سوتا ہوا نظر آیا۔ ہاجرہ حیران تھی کہ بشیر کوئی کام نہیں کرتا تو گھر کیسے چلے گا۔ ابھی جو خرچ پورا ہو رہا تھا وہ اس کے سر کی پٹن اور جٹھ جو باہر سے پیسے بھیجتا تھا اسے اخراجات پورے ہو رہے تھے۔

ہاجرہ کچھ کہہ سکتی تو ایک ہی بات ہوتی۔
”یہ تمہارے سوچنے کی باتیں نہیں ہیں، تمہیں روٹی

ملتی رہے گی تم بھوک نہیں مرو گی“۔ ہاجرہ چپ ہو جاتی۔ بشیر کی کئی دن گھر سے باہر رہتا اور جب گھر آتا تو سوتا رہتا۔ تب ہاجرہ کو محلے والوں سے معلوم ہوا کہ بشیر نشہ کرتا ہے اور جوا کھیتا ہے۔ ہاجرہ نے یہ بات اپنے گھر والوں کے کان میں ڈالی۔ ماں باپ نے حالات کو دیکھا تو بچی کو گھر لے آئے۔ بھابی اپنے میکے چلی گئی۔ بھابی کے دو چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ بھائی کا بچوں کے بغیر گزارا ممکن نہیں تھا۔ بھائی بظاہر تو کچھ نہیں کہتے لیکن چپ چاپ رہتے، زیادہ بات نہ کرتے۔ ہاجرہ ان سب حالات کو دیکھ کر خود کو نھور وار سمجھتی رہتی۔ آخر اس نے اپنے ماں باپ کو کہا کہ وہ گھر جانا چاہتی ہے۔ وہ اپنے ساتھ ایک ہنستا ہنستا گھر نہیں اجازت سکتی، وہ بھائی کو بچوں سے دور نہیں کر سکتی۔

ماں باپ بات کو سمجھ گئے اور ہاجرہ کو چھوڑ آئے اس کے گھر۔ ساس سر بڑے بیٹے کے پاس چلے گئے کبھی نہ لوٹنے کے لئے۔ اللہ نے ہاجرہ کو بیٹے کی نعمت سے نوازا۔ رضوان کے آنے سے جہاں گھر میں کچھ بل کے لئے خوشی آئی وہاں حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ بشیر کچھ نہیں کرتا تھا، ہاجرہ تنگی سے گزارا کرتی۔ ایک کے بجائے آدھی روٹی کھاتی۔

سال بعد ایک اور بیٹے سے اللہ نے نوازا دیا۔ ہاجرہ کا دن رضوان اور عمران کے ساتھ گزارتا، تنگ حالات کی وجہ سے ہاجرہ نے اپنے گھر کا آدھا پورشن کرائے پر چڑھا دیا، بشیر کی نشے کی لت بوہتی جا رہی تھی۔ ہاجرہ بہت صابر عورت تھی اس نے بھی کسی سے گلہ نہ کیا۔ ہر وقت اپنے رب کا شکر ادا کرنے میں لگی رہتی۔

وقت کو پُر لگ گئے، ہاجرہ دوسے پانچ بچوں کی ماں بن گئی۔ عمران کے بعد ساجدہ، عابدہ اور نعمان۔ بشیر نے نشہ پورا کرنے کے لئے گھر کا سامان بیچنا شروع کر دیا۔

ہاجرہ نے بچوں کو پالنے کی فکر میں گلی کے ایک گھر میں کپڑے دھونے شروع کر دیئے لیکن بچوں کو پیٹ بھر

بھولی کہ اس کے ساتھ پانچ اور معصوم جانیں بھی ہیں جن کو بھوک بھی لگتی ہے اور جن کی ضروریات بھی پوری کرنی ہیں، تعلیم بھی دلوانی ہے۔ ہاجرہ نے بیچے چھ پیسوں اور گھر کا سامان بیچ کر غریب بستی میں دوسرے کا ایک خستہ سا مکان لیا جس میں صرف ایک کمرہ تھا جس کی چھت سے سورج کی دھوپ گزر کر آتی تھی۔ وہ قریب ہی ایک بھٹے پر کام کرنے لگی۔ دن میں بھٹے پر کام کرتی شام کو لوگوں کے برتن ہاتھتھی اور کپڑے دھوئی۔ گزارا کیسے ہو رہا تھا صرف ہاجرہ ہی جانتی تھی۔

رضوان نے ماں کی مشکل کو دیکھتے ہوئے صبح کے وقت اسکول جانے سے پہلے اخبار بیچنا شروع کر دیا۔ ہاجرہ سب بچوں کو پڑھاتا چاہتی تھی۔ اس کی ہڈیوں میں درد رہنے لگ گیا تھا۔ بھٹے زمانے میں ہاجرہ نے سلائی سیکھی تھی رات کو لوگوں کے کپڑے سلائی کرتی۔ رضوان کالج سے واپسی پر بچوں کو ٹیوشن پڑھاتا۔ عمران بھی چھوٹا موٹا کام کرنے لگا۔ سادہ کپڑوں میں ماں کا ہاتھ بٹائی اور تعلیم بھی حاصل کرتی۔ عابدہ ماں کے سب سے زیادہ قریب تھی۔ ماں کو مشین کی طرح کام کرتے ہوئے دیکھتی تو آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔ ماں کے ہاتھ دہائی پاؤں دہائی ہاتھ چومتی، ہاجرہ کئی بار کہتی۔

”میری بچی میں ٹھیک ہوں“۔ لیکن وہ ایک نہ سنبھلی، تب تک کھانا نہ کھاتی جب تک ہاجرہ نہ کھالیتی۔

رضوان نے ایم اے کیا اور اسے اچھی نوکری مل گئی۔ حالات کچھ ٹھیک ہونے لگے۔ ہاجرہ کو کنگنے لگا کہ اس کے برے دن ختم ہونے والے ہیں۔ زندگی نے بہت امتحان لے لئے، اب اس کی باقی زندگی میں سکون ہو گا۔ ہاجرہ نے بھٹے پر جانا چھوڑ دیا۔ عمران ذہین تھا ڈاکٹری میں داخلہ ہو گیا۔ ہاجرہ کے لئے تو وہ عید کا دن تھا۔ اس کو لگا کہ اس کی ساری محنت و ریاضت کا صلہ مل گیا۔

اب ہاجرہ کو رضوان کی شادی کی فکر ستانے لگی۔ اب گھر میں تنگی کے حالات نہ رہے۔ رضوان ماں اور

کر روٹی نصیب نہ ہوتی۔ رضوان کو سرکاری اسکول میں داخل کروایا۔ کتابیں اور یونیفارم اسکول سے مل گیا، فیس بھی کم تھی۔ بشیر بچوں کے لئے صرف نام کا باب تھا۔ اب تو وہ بیمار رہنے لگ گیا تھا۔ ایک دن، بشیر کے ساتھ کچھ لوگ گھر دیکھنے آئے۔ ہاجرہ کے پوچھنے پر بتایا کہ یہ لوگ گھر کرائے پر لینا چاہتے ہیں اس لئے دیکھنے آئے تھے۔ ہاجرہ چپ کر گئی۔ پھر ایسا ہوا کہ ایک ہفتہ ہو گیا بشیر گھر نہ آیا۔ ہاجرہ کو فکر ہونے لگی آخر شوہر تھا۔ ہاجرہ نے محلے کے لوگوں سے پوچھا لیکن کسی کو بشیر کے بارے میں کچھ پتہ نہ تھا۔

دو دن بعد کچھ لوگ بشیر کی چار پائی اٹھائے گھر میں داخل ہوئے، ہاجرہ کے پاؤں کے نیچے سے تو جیسے کسی نے زمین ہی ہٹا لی ہو۔ وہ روتے ہوئے نعمان کو چھوڑ کر بھاگی، چار پائی پر بشیر کا مردہ جسم تھا۔ بشیر نے نفسہ زیادہ لے لیا تھا، جس کی وجہ سے اس کی موت ہو گئی۔ ایک آدمی نے ہاجرہ کو پیسوں کی گڈیاں دیں کہ یہ بشیر کی جیب سے ملی ہیں۔ ان پیسوں سے بشیر کی تدفین ہوئی۔ بشیر کی موت پر اس کا کوئی رشتہ دار نہیں آیا تھا۔ ماں باپ کو پر دس میں شاید خبر نہ ہوئی یا پھر وہ بشیر کے جانے کے انتظار میں تھے۔ تدفین کے بعد جب ہوش آیا تو ہاجرہ نے پیسے گنے، وہ ایک لاکھ ستر ہزار تھے۔ ہاجرہ یہ بھول گئی تھی کہ یہ پیسے آسمان سے نہیں گرے ہوں گے۔

☆.....☆.....☆

کچھ دنوں بعد ایک اور قیامت برپا ہوئی جب کچھ لوگ آئے اور ہاجرہ کو مکان خالی کرنے کو کہا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ بشیر نے یہ گھر کوڑیوں کے بھاد بیچ دیا ہے۔ ان لوگوں نے کتنے پیسے دئے کتنے نہیں ہاجرہ نہیں جانتی تھی۔ بے سہارا عورت کیا کر سکتی تھی، منت سماجت سے ایک مہینے کا وقت لیا۔

ہاجرہ نے اس مصیبت کی گھڑی میں کسی رشتے دار کا احسان لینے سے خود کو بھوکا رکھا، بہتر سمجھا لیکن وہ یہ نہ

باقی بہن بھائیوں کو لے کر شہر میں شفٹ ہو گیا۔ ساجدہ نے اپنے اچھا رشتہ آیا، لڑکا اچھا اور قابل تھا۔ پھر لڑکے والوں نے جینز کا بھی مطالبہ نہ کیا، رضوان نے موقع مناسب سمجھا اور ساجدہ کی رخصتی کر دی۔ رضوان کا تبادلہ دوسرے شہر ہو گیا۔ رضوان نے اپنے ڈپارٹمنٹ میں ایک لڑکی کو پسند کر لیا۔ رخسار ایک خوبصورت لڑکی تھی، ہاجرہ بچوں کی خوشی میں خوش تھی، رضوان اور رخسار کی شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی۔

☆.....☆.....☆

عمران کا میڈیکل ہو گیا، اس نے سرکاری اسپتال میں نوکری کے ساتھ ساتھ شہر میں کلینک بھی کھول لیا، شام کو وہاں بیٹھتا۔ اب گھر میں پیسے کی ریل پیل تھی۔ ہاجرہ نے لگے ہاتھوں عمران اور عابدہ کی بھی شادی کر دی۔ عمران کی شادی ماہ نور سے ہوئی۔ ماہ نور ایک ماڈرن لڑکی تھی جس کو عمران نے ہی پسند کیا تھا۔ عابدہ کو بھی قسمت سے اچھا سسرال مل گیا لیکن وہ ہاجرہ کا اب بھی اتنا ہی خیال رکھتی، ہنستے بعد چکر لگاتی، ہاجرہ لاکھ منع کرتی۔

”اب تمہارا سسرال ہے، سسرال میں بار بار میسکے جانا پسند نہیں کیا جاتا۔“

☆.....☆.....☆

ماہ نور یورپ میں پئی بڑھی تھی، ویسے تو پڑھی لکھی تھی لیکن ہاجرہ کے لئے وہ اچھی بہو ثابت نہ ہوئی۔ ماہ نور کا زیادہ وقت اپنے کمرے میں بانی وی دیکھتے ہوئے گزرتا تھا۔ ہاجرہ بہو کے بہت لاڈ کرتی۔ اس کے لئے کھانا بناتی، اس کے کام کرنے میں خوشی محسوس کرتی۔

نعمان نے باہر تعلیم کی ضد کی تو دونوں بھائیوں نے مل کر اسے باہر بھیج دیا۔ اس نے وہیں ڈگری پوری کی اور کسی گوری سے شادی کر کے ہمیشہ کے لئے وہاں کا ہو کر رہ گیا۔ ہاجرہ کے لئے خرچہ بھیج دیتا۔ ہاجرہ کی زندگی اب ایک کمرے میں محدود ہو کر رہ گئی تھی۔

ایک دن ماہ نور کی دوستیں گھر آئیں۔ ماہ نور نے

ہاجرہ سے کہا کہ وہ کھانا بنادے۔ ہاجرہ کی طبیعت اس دن پتھر ٹھیک نہ تھی مگر وہ بہو کو انکار نہ کر سکی۔ ماہ نور کی دوستوں نے کھانے کی خوب تعریف کی۔ ہاجرہ پانی کا جبک رہنے کے لئے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی کہ اس کے قدم رک گئے، ماہ نور کہہ رہی تھی۔

”تم لوگ اس بڑھیا کی تعریفیں کر کے اس کو زیادہ سر پرست چڑھاؤ، میں نے تو اس کو پاؤں کی جوتی بنا کر رکھا ہوا ہے، عمران نہ ہوتے تو میں اس کو گھر میں ایک پل کے لئے بھی برداشت نہ کرتی، گھر دیکھو کتنا صاف ستھرا ہے یہ بڑھیا کی وجہ سے ہے، اس کی زندگی لوگوں کے گھروں میں جھاڑ پونچھ کرتے ہی گزر رہی ہے گھر میں برداشت کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بڑھیا نے گھر اچھا سنبھالا ہوا ہے، یونو مجھ سے یہ سب کب ہوتا ہے۔“ ماہ نور کے نفرت آمیز الفاظ ہاجرہ کو مضبوط نہ رکھ سکے، وہ جو سب سختیوں کے باوجود اپنے پیروں پر کھڑی رہی وہ آج اپنا وجود نہ سنبھال سکی اور بوسیدہ عمارت کی طرح گر گئی۔ پانی کا جگ گرنے کی آواز سن کر ماہ نور آگے بڑھی۔ عمران کو کال کرنے لگی۔ ہاجرہ پر فالج کا ایک ہوا تھا۔ اس کے دائیں طرف گہرا اثر پڑا تھا۔ وہ اب چل پھر تو دور کی بات دائیں ہاتھ سے پانی بھی نہ پی سکتی تھی۔ بیٹیاں سنتے ہی دوڑی آئیں، عابدہ کا تو برا حال تھا، ہاجرہ کی مریضہ تھی، بیٹیاں روٹی دھوئی گھروں کو واپس چلی گئیں۔

☆.....☆.....☆

ہاجرہ دن بھر بھوک پیڑی رہتی۔ ہاتھ روم میں جانے کی کوشش کرتی تو کپڑے گندے کر لیتی، ماہ نور سے کب یہ سب برداشت ہونا تھا۔ اس نے عابدہ کو فون کیا، حال چال کی رسی بات کے بعد سلیقے سے ہاجرہ کے بارے میں بتانے لگی۔

”عمران اسپتال اور کلینک پر مصروف ہوتے ہیں، وہ رات گئے واپس آتے ہیں، میں کچھ دنوں کے لئے نمی کی طرف جا رہی ہوں تم کچھ دنوں کے لئے امی کو

رہی تھی کہ ہاجرہ نے تن تنہا 5 لوگوں کو سنبھال لیا تھا۔
آج ان سب سے ایک ہاجرہ نہ سنبھالی جا رہی تھی۔
سادہ سے بات کی۔ سادہ کے سسرال میں کوئی نہ
تھا۔ اس کے شوہر نے بھی اعتراض نہ کیا، یوں ہاجرہ
ایک بیٹی کے دروازے سے اٹھ کر دوسری بیٹی کے
دروازے پر چلی گئی۔

ماہ نور اور عمران سادہ کے گھر ہاجرہ سے ملنے
آئے، وہ ہاجرہ کے استعمال کی باقی چیزیں بھی سادہ
کے گھر چھوڑ آئے اور جاتے ہوئے یہ کہہ گئے۔

”امی! ہم آپ کے بچے ہیں، کبھی بھی کسی چیز کی
ضرورت ہو تو ہمیں بتائیے گا، آخر ہم پر آپ کے بہت
احسانات ہیں۔“ ہاجرہ نے ہنس کر ان کی طرف دیکھا
پھر چھت کو خالی نظروں سے دیکھنے لگ گئی۔ وہ شاید اپنی
قسمت پر ہنس رہی تھی۔ اب اسے یہ نہیں مرنا تھا۔ بیٹی اور
داماد میں کبھی بھمار ہاجرہ کو لے کر لڑائی ہو جاتی لیکن
وقت گزر رہا تھا۔ اب اس بہت بڑی زمین پر کوئی ایسی
جگہ نہ تھی جہاں ہاجرہ رہ سکتی۔

سردیوں کے دن شروع ہو گئے تھے۔ سردیوں
میں پرانے درود بھی جاگ جاتے ہیں۔ کوئی دن ایسا نہ
ہوتا جس میں ہاجرہ کی تکلیف نہ بڑھتی۔ ایک دن
اسے اپنی چھاتی میں درد اٹھتا ہوا محسوس ہوا جو بائیں
بازو میں سرایت کر گیا، اس سے پہلے کہ وہ کسی کو بلالی
ویل چیئر سے نیچے گر گئی اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا
چھانے لگا۔

شاید اب ہاجرہ کا بوجھ اترنے والا تھا۔ شاید اب
اس کا وجود کسی کے لئے تکلیف اور پریشانی کا باعث
نہ رہتا۔ وہ پانچ بچوں کی ماں کا وجود تھا۔ رोज پرواز کر
رہی تھی، کوئی پاس نہ تھا، کوئی پانی کے گھونٹ پلانے
والا، کوئی پکڑنے والا، کوئی بھی تو نہ تھا، اب ہاجرہ کو
سکون ہی سکون ملنے والا تھا، اس کی تکلیف کا باب ختم
ہونے والا تھا۔

☆.....☆.....☆

لے جاؤ پر اپنے بھائی سے بات تم خود کرنا۔ اب تم بیٹی
ہو تمہاری ان کو زیادہ ضرورت ہے، انہوں نے اپنی
زندگی تم لوگوں کے لئے ہی گزاری ہے، کچھ تم لوگوں کا
بھی تو فرض بنتا ہے۔“

”رضوان بھائی تو ایسے مصروف ہیں اپنی زندگی
میں کہ انہیں کام اور اپنے بچوں کے علاوہ کسی اور کی فکر ہی
نہیں ہے، امی جان اپنے بچوں سے ملنے کے لئے ترس
رہی ہیں۔“

عابدہ اگلے دن ہی گھر پہنچ گئی۔ اس نے عمران سے
بات کی عمران نے زیادہ انکار نہ کیا، وہ بھی سمجھتا تھا کہ
عابدہ سے بہتر امی کی دیکھ بھال کوئی نہیں کر سکتا۔

عابدہ کے گھر اس کے شوہر نے تو کچھ نہ کہا، ہاں
اس کی نند اور ساس کو یہ بات پسند نہ آئی۔ انہوں نے
کچھ دن تو برداشت کیا لیکن پھر انہوں نے عابدہ کے گرد
زندگی کا دائرہ تنگ کرنا شروع کر دیا۔

”ہم نے تمہاری ماں کا ٹھیکہ نہیں اٹھایا ہوا، جہاں
اسے اٹھا کر لائی ہو وہاں ہی اس بوجھ کو پھینک کر آؤ، میرا
بیٹا درختوں سے پیسے توڑ کر نہیں لاتا جو تم نے اپنے
خاندان کو بھی پالنا شروع کر دیا ہے۔“

عابدہ نے عمران سے بات کی لیکن ماہ نور نے یہ
بات کہہ کر بات گول کر دی۔

”میرا چھوٹا سا بچہ ہے میں سارا دن اس کے ساتھ
مصروف رہتی ہوں، امی کا دھیان کیسے رکھ سکتی ہوں۔“
رضوان بھائی نے کہا۔

”عابدہ! یہ کیسے ممکن ہے کہ میں امی کو اپنے ہاں
لے کر آؤں، امی فاق کی مرید ہیں، ہم کیسے ان کو رکھ
سکتے ہیں، کون ان کو کھلائے پلائے گا، کون ان کا
دھیان رکھے گا۔“ انہوں نے عابدہ کو ٹھیکتیں کر کے
نون بند کر دیا۔

ہاجرہ کی آنکھوں میں آنسوؤں کا ریلہ تھا جو رکنے
کا نام نہیں لے رہا تھا کہ یہ وہی اولاد ہے جس کے
لئے اس نے خود کو چکی میں پیس دیا تھا۔ عابدہ سوچ

شازیہ مصطفیٰ عمران

سلسلہ وار ناول

نذر کی پہلی شہینشاہ

”آخاہ بھائی جان آپ چلیں گے۔“ حرا تو خوشی سے بھرپور آواز میں بولی جنین جھینپ گیا۔
”امی کی حالت دیکھتے ہوئے کہہ رہا ہوں۔“



”ٹھیک ہے باقی کی شاپنگ آپ اور میں کر لیں گے۔“
 ”انیسہ بھی مطمئن ہو گئی تھیں کسی طرح تو وہ بھی اپنی پسند سے کچھ لے گا۔“
 ”بھائی جان برا ہیڈل ڈریس کے لیے آریکہ باجی کو ساتھ لے لیتی ہوں۔“
 ”جب وہ آئے گی نہیں تو کیوں بولتی ہو۔“ وہ امی کے روم سے نکل کے باہر آیا۔
 ”ہاں یہ تو ہے۔“ وہ بھی انفر دگی سے گویا ہوئی۔
 حنین کو امی کی بہت فکر ہو گئی تھی وہ اچانک سے انفر دگی کی باتیں کرنے لگی تھیں شاید انہیں اس کی فکر تھی
 کہ کہیں وہ شادی سے انکار نہیں کر دے۔
 مگر حنین تو عجیب کشکش کا شکار ہو گیا تھا اسے اپنی شادی کی خوشی اتنی نہیں تھی جتنی آریکہ کا رویہ ابھن

فسطا نمبر 14



میں مبتلا کر رہا تھا۔

اب امی تاہید آنٹی سے اور جلدی شادی کا کہہ کر ٹھیک نہیں کیا تھا وہ آریکے سے مل کے اور بات کر کے کوئی راہ نکالنا چاہتا تھا۔ وہ اپنی زندگی کی ابتدا اچھے اور خوش کن انداز میں کرنا چاہتا تھا وہ آریکے کی بدگمانی دور کرنا چاہ رہا تھا مگر اسے کوئی ایسا موقع نہیں مل رہا تھا۔

وہ بیڈ کی بیک کراؤن سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا اور ذہن اس کا آریکے کی طرف تھا۔ شروع سے یہ لڑکی میرے لیے الجھن کا باعث رہی تھی۔ ان دونوں کے درمیان کبھی اچھے موڈ میں گفتگو تک نہیں ہوئی تھی پتا نہیں بعد میں کیا ہوگا۔ اس نے چکر اکر اپنا سر تھام لیا۔ وہ نکلا اور برآمدے میں آگیا۔ لگتا تھا امی سو گئی تھیں۔ حنین نی وی دیکھ رہا تھا اور حرا اپنا اسکول کا کام کر رہی تھی۔ اس کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ چائے کی طلب ہو رہی تھی چن میں آگیا کچن میں گھس کے اس نے بھی کوئی کام کب کیا تھا۔

”چائے کیسے بناؤں۔“ وہ دونوں ہاتھ پشت پر جمائے کھڑا ہو گیا۔
”امی ٹھیک کہتی ہیں شادی جلدی ہو جائے کم از کم مجھے چائے وغیرہ تو مل جایا کرے گی۔“ وہ سوچ رہا تھا۔

چائے پینے کا ارادہ ملتوی کیا اور باہر آگیا۔
بے اختیار نگاہ اس نے اوپر اٹھائی شاید اس کی جھلک ہی نظر آجائے۔
کہتے ہیں جب کسی کو درد دو یا کسی کو تنگ کرو اور وہ جسے آپ چاہتے ہوں محبت کرتے ہوں تو اپنے دل کو بے چینی سے بے قراری اور اداسی بڑھتی جاتی ہے۔ لڑکیاں تو ویسے بھی بدگمان جلدی ہو جاتی ہیں انہیں یقین دلا نا بہت مشکل ہوتا ہے۔

وہ برآمدے میں پڑے تخت پر لیٹ گیا۔ دل کے اندر اداسی اور محرومی بڑھتی جا رہی تھی۔
”بھائی جان آپ ادھر کیوں سو رہے ہیں؟“ حرا نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا وہ تو اچھل ہی گیا۔
”آپ ادھر کیوں لیٹے ہیں؟“
”کیوں یہاں لیٹنے پر پابندی ہے؟“ وہ چڑا ہوا تو پہلے ہی تھا۔
حرا نے حیرانگی سے اس کی طرف دیکھا اور تیخ انداز پر پہلو بدلنا مزید کچھ نہیں بولی وہاں سے پلٹ گئی۔
حنین نے بھی کروٹ لے لی تھی۔

☆.....☆

”امی آپ نے ان کی مانی کیوں۔“ آریکے کے تو ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے جب اسے خبر ملی کہ انیہ۔
”آپ نے تو امی تاریخ طے کر لی تھی پھر اور جلدی کیوں۔“
”انیہ۔“ حاجی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے وہ کیسے گھر کو سنبھالیں۔“ انہوں نے کہا۔
آریکے نے لب بھینچ لیے کیونکہ وہ سمجھ گئی انہیں صرف کام کرنے والی چاہیے تھی۔
”ان سے کہیں ماسی لگائیں۔“ وہ جھٹ بولی۔

”ماسی کو جنین منع کرتا ہے۔“

”ظاہر ہے بغیر تنخواہ والی ماسی مل تو رہی ہے وہ تو منع کریں گے ہی۔“ وہ تو ایسے ہی جلی بھنی بیٹھی تھی۔
”زیادہ فضول نہیں بولو وہ تو اس لیے منع کر رہا ہے کہ ماسی کا کام اچھا کب ہوتا ہے۔ چھٹیاں الگ کرے گی۔“ انہوں نے بھی وضاحت دی۔

”امی پھر بھی انہیں ماسی لگانا چاہیے انور ڈکرسکتے ہیں۔“ ثمرہ نے بھی مداخلت کی۔
”یہ ان کے گھر کا معاملہ ہے۔“

”آبی آپ تو جا کے ماسی لگا لیجئے گا۔“ اس نے آریکے سے کہا۔

”تھہیں بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ انہوں نے ثمرہ کو سرزنش کی وہ خیف سی ہو گئی۔

آریکے کا دل تو جنین نے اتنا خراب کر دیا تھا۔ وہ کچھ اچھا سونج ہی نہیں رہی تھی بس دل و دماغ میں نوکرائی گھسا ہوا تھا۔ جنین اور اس کی امی کو کام کرنے والی چاہیے تھی۔

”اچھا تم یہ کام سمیٹو میرے ساتھ بازار چلو توڑی بہت جو خریداری رہ گئی ہے وہ بھی منادو۔“ انہوں نے آریکے سے کہا جو کپڑے سلائی کر رہی تھی۔

”امی آپ ثمرہ کو لے جائیں مجھے ایسا کچھ خاص نہیں لینا۔“ جتنے شادی کے دن قریب آ رہے تھے اس کے مزاج میں بھی چڑچاہٹ اور بے زاری آگئی تھی ہر وقت دماغ جنین کے رویوں کو سوچتا رہتا تھا۔
”ثمرہ کو نہیں لے جانا، چیزیں تم نے اپنی لینی ہیں اور ہاں انیسہ باجی حرا اور حسن کے کپڑے بھی لینے ہیں پہنونی میں دینے کے لیے۔“ انہیں یاد آیا۔

آریکے پھر چپ ہو گئی اس نے سارا پھیلا وہ سمیٹا اور تیار ہونے چلی گئی۔

ناہید نے ثمرہ کچھ ہدایتیں دیں۔ منیر احمد بھی آگئے تھے۔

”ہم لوگ مغرب سے پہلے آجائیں گے۔“ وہ بولی تھیں۔ آریکے دھانی لان کے پرینڈ ڈکڑوں میں ملبوس بڑی سی بلیک چادر میں چلی آئی تھی۔

”امی آپ بھی زیادہ دیر نہیں لگائے گا۔“ وہ سڑھیاں اترتے ہوئے ان سے بول رہی تھی۔

”ہاں ہاں مجھے کون سا بازار میں گھومنے کا شوق ہے۔ چند ضروری ہی چیزیں رہ گئی ہیں۔ وہ لینی ہیں۔“ وہ دونوں مین گیٹ تک آگئی تھیں۔ دیکھا تو جنین ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ رہا تھا جب کہ حرافرنٹ

سیٹ پر موجود تھی۔

آریکے نے اسے دیکھ کر چادر اور اچھی طرح اپنے گرد سمیٹ لی۔

”آئی کہیں جا رہی ہیں۔“ حرا نے پوچھا۔

”جنین کی نگاہ آریکے پر پڑی ضرور تھی مگر ناہید آئی کی موجودگی سے اس نے نگاہ دوسری سمت کر لی تھی۔

”ہم بازار جا رہے ہیں۔“

”آجائے آئی بیٹھ جائیں، حرا بھی بازار ہی جا رہی ہے۔“ جنین نے جھٹ کہا۔

”امی ہم خود چلے جائیں گے۔“ آریکے نے ناہید سے دبے دبے لہجے میں کہا وہ اس کے ساتھ اس کی

گاڑی میں بیٹھنا نہیں چاہتی تھی۔

”آریکہ باجی آپ کون سے بازار جارہی ہیں ہم ڈراپ کر دیں گے۔“ حرا نے سن لیا تھا۔

”بیٹھے آئی۔“ حنین نے آگے سے ان کی بندہ آریکہ کی سنی پیچھے کا ڈور کھول دیا اور انہیں بیٹھنے کو کہا وہ

آریکہ کو دیکھنے لگیں جو اشارے سے منع کر رہی تھی۔

”بیٹھ جائیے ہمیشہ ہی آپ کو بھائی جان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھنا ہوگا یہ ہچکچاہٹ بے معنی ہے۔“ حرا نے مسکرا کر شرارتی لہجے میں کہا۔ وہ جھینپ گئی۔

ناہید بھی حنین کے زبردستی کرنے پر بیٹھ گئی تھیں اور آریکہ منہ ہی منہ میں بددعا کے رہ گئی۔ حنین نے اس کے تاثرات بغور دیکھے تھے۔

انہی کی تو طبیعت ٹھیک نہیں تھی آریکہ کے شادی ویسے کے ڈریس رہ گئے تھے جو انہوں نے حنین اور حرا سے ہی کہا لے آئے۔ حنین بھی راضی ہو گیا تھا۔

”آئی آریکہ باجی ہماری مدد کر دیں تو اچھا ہے۔ امی کی طبیعت خراب ہے۔ انہوں نے مجھے اور بھائی جان سے کہا وہ لے آئیں۔“ حرا رک رک کے قدرے توقف کے بعد گویا ہوئی۔

حنین گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا اور وہ ان کے جواب کا بھی منتظر تھا۔

”آپ دونوں اپنی پسند سے لے لیتے۔“ ناہید، آریکہ کے ٹھوکے سے چونک گئی تھیں۔

”آئی مجھے تو آئیڈیا نہیں ہے میں نے خواتین کی کبھی شاپنگ کی بھی نہیں کی ہے آپ یہ فرائض انجام

دے دیں تو بہت مہربانی ہوگی امی کی طبیعت ٹھیک ہوتی تو وہی جاتیں بھی۔“ وہ خاصے مودب انداز میں ان سے مخاطب تھا۔

”کیوں نہیں۔“ انہوں نے کہا۔

”اگر آریکہ اپنی پسند سے لے تو اور بھی اچھا ہے کیونکہ امی یہی چاہتی ہیں۔“

”اونہ سارا امی ہی کی خواہش پر کر رہے ہیں خود کی تو جیسے کوئی مرضی نہیں۔“ وہ زہر خند سوچ لیے بیٹھی تھی۔

”اتنے میں شاپنگ سینٹر آگیا۔ حنین نے مہنگے ترین شاپنگ سینٹر کے پارکنگ ایریا میں گاڑی پارک کی تھی۔ آریکہ تو چونک ہی گئی تھی کیونکہ وہ تو طارق روڈ یا پھر حیدری تک ہی جاتی تھی۔

”جلدی آئیے۔“ اس نے ڈور کھولا۔

حرا نے آریکہ کے حیران پریشان چہرے کے ساتھ اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

بڑی بڑی شاپ.....! حنین آگے آگے چل رہا تھا۔ پورا فلور برائیڈل ڈریس کی شاپس کا تھا۔

”آریکہ باجی پسند تو کیجیے۔“

”بیٹیا یہ تو بہت مہنگے ہوں گے۔“ ناہید بھی ہچکچا رہی تھیں۔

”آپ پسند تو کریں۔“ حرا مسکرائی۔

حنین کی نگاہ بار بار آریکہ پر بھی اٹھ رہی تھی۔

ریڈ اسٹاکس مل کام تھا حرا نے حنین سے بھی رائے لی کیونکہ آریکہ کو سمجھ نہیں آ رہا تھا وہ کیا کرے۔

کافی دیر گزرنے کے بعد جنین نے ہی دونوں ڈریس پسند کیے تھے حرا نے اپنے لیے بھی چند ڈریس لیے تھے۔ آریکہ اور ناہید کی شاپنگ تو رہی ہی گئی تھی۔ مغرب کے وقت وہ لوگ واپسی کے لیے نکل چکے تھے۔

اچھی خاصی مہنگے دونوں ڈریس تھے۔ آریکہ تو حیرت و انبساط میں مبتلا سوچوں کے سمندر میں غوطہ زن تھی۔ جنین نے ڈریس پسند کیے تھے۔

واپسی میں اس نے ان لوگوں کو آکس کریم بھی کھلائی۔

”آئی ہمارے وجہ سے آپ کی شاپنگ رہ گئی۔“ گھر آ گیا تھا۔ وہ شاپرز نکال رہی تھی۔

جب کہ جنین دو تین شاپرز اندر رکھ کے آ گیا تھا آریکہ اس تیزی سے اندر جا رہی تھی کہ باہر نکلتے جنین سے زوردار مکر ہوئی تھی۔ گرتے گرتے جی تھی۔

”کیا وحشت ہے۔“ وہ ناگواری سے گویا ہوا تھا۔

”سوری۔“ وہ خود کو سنبھالتی ہوئی ہوا کے جھونکے کی طرح گزر گئی تھی۔

”آریکہ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔“ وہ بول ہی رہا تھا۔ حرا اور ناہید بھی اندر آ گئی تھیں۔

آریکہ نے جنین کی آواز سنی تھی۔ ایک لمبے کو رکی مگر پھر تیزی سے میڑھیاں چڑھ گئی تھی۔ جنین بھی ہتھیلی پر مکامار کے رہ گیا تھا۔

”میں باجی کے پاس رات کو آؤں گی۔“ ناہید نے کہا۔

حرا کے ہاتھ سے شاپرز لیے اور وہ اندر چلا گیا تھا۔

”آئی شکر یہ آپ کا۔“

”بیٹا فیروں کی طرح نہیں بولو۔ یہ بھی کام تھا سمجھو ہو گیا۔“ وہ حرا کے سر پر ہاتھ پھیر کے میڑھیاں عبور کرنے لگی تھیں۔ اور جنین کا ڈی لاک کر کے باہر چلا گیا تھا۔ وہ حسرت ہی لے کے رہ گیا آریکہ کے دل کی بدگمانی دور کرنے کی۔

☆.....☆

جب سے شہیر اور اس کی امی آئی تھیں، رمضان کی سوچوں کو دوسرے رخ پر کر گئی تھیں۔ انہوں نے رمضان سے اتنے سوال کیے تھے وہ چونک گئی تھی۔ شہیر کی امی بھی ہوئی خاتون تھیں۔ وہ سب سے ہی اچھے انداز میں ملی تھیں۔ نگہت سے تو وہ ایسے ملی تھیں جیسے برسوں کی جان پہچان ہو۔

”مس رمضان نوید کہیں گئی ہوئی ہیں۔“ شہیر نے کاؤنٹر پر دستک دی تھی۔

رمضان تو اچھل گئی کہتے ہیں جسے سوچو وہ سامنے آ جاتا ہے اور یہ بیج ہوا تھا۔

”جی سر۔“

”ارے اتنا بوکھلا کیوں رہی ہیں۔“ وہ مسکرانے لگا۔

رمضان نے جھینپ کے ایک نظر اسے دیکھا۔

”آپ کو یہاں کا کام سمجھ آ گیا۔“ وہ آئی سی یو کے مریضوں کا چیک اپ کرنے کے بعد اس کی طرف

چلا آیا تھا۔

”جی سر۔“

”اس کے علاوہ بھی کچھ بولا کریں جی سر جی سر کرتی رہتی ہیں۔“ وہ ہنسا۔

اس وقت ریسپشن پر کوئی نہیں تھا اس لیے بھی وہ کھل کے بات کر رہا تھا۔ ورنہ اسٹاف کی موجودگی میں ذرا ریز ہووے کے بولتا تھا۔

”آپ کے والد صاحب کیسے ہیں؟“

”اللہ کا شکر ہے کافی ٹھیک ہیں۔“ اس نے بتایا۔

”انشاء اللہ تعالیٰ وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں گے۔“

”سر بیڈ نمبر دو کے مریض کی آکسیجن کھل گئی ہے۔“ نرس نے آ کے کہا۔

”اوہ.....! اچھا، میں پہلے چیک کر لوں۔“ وہ فوراً ہی الرٹ ہوا اور اسے دیکھنے چلا گیا۔

رمضہ کی اٹھل پھٹھل ہوئی دھڑکنوں کو کچھ قرار ہوا اس نے رکا ہوا سانس بحال کیا۔ جتنی دیر شہیر اس

قریب رہتا ایسا لگتا چہرے پر سارا خون جمع ہو گیا ہو۔

شہیر پھر اس کے پاس آ گیا۔

”کوئی یہاں پر اب تم تو نہیں ہو رہی؟“

”سب کچھ بہت اچھا ہے۔“ اس نے بتایا۔

واقعی اسے یہاں رہ کے کوئی بھی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

”گڈ۔“ اس کے کاسی کپڑوں کے دوپٹے کے ہالے میں اس کا نرم و نازک چہرہ بہت پیارا لگ

تھا۔ رمضہ کی اتنی بھی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ وہ آگے سے مزید شہیر سے کوئی اور گفتگو کرے۔

”میری امی آپ سب کی بہت تعریف کر رہی تھیں۔“

”پہلی ملاقات میں کب کوئی کسی کی تعریف کر سکتا ہے۔“ اس نے بے ساختہ ہی کہا۔

شہیر کے لب مبہم سے مسکرا دیئے۔

”کہتے ہیں کچھ لوگ پہلی ملاقات میں ہی سب جان لیتے ہیں۔“ لہجہ معنی خیز اور شرارتی بھی لگا۔

اس کے غازوں پر سرخی دوڑ گئی۔ اس نے ادھر ادھر نگاہوں کو کیا کیونکہ گہری نگاہیں خود پر جو محسوس

ہو رہی تھیں۔

”رمضہ آپ ڈیوٹی آف ہونے کے بعد میری کچھ لمحے کی بات سن سکتی ہیں۔“ لہجے میں التجا بھی تھی۔

”وہ سر مجھے جلدی جانا ہوتا ہے۔“ وہ ہچکچائی۔

”میں زیادہ نام نہیں لوں گا۔“ وہ اس کا ٹھہرانا بھی سمجھ رہا تھا۔

”آپ نیچے کینٹین میں پانچ بجے مجھ سے مل رہی ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ رکنا نہیں کیونکہ وہ پھر انکار کر کے

تھی۔

رمضہ نے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ آئی سی یو کے خاموشی والے ماحول میں وہ اسے دیکھتی رہ

تھی۔

جتنا وقت وہ ڈیوٹی پر رہی اس کا ذہن الجھا ہی رہا۔ شہیر سے ملنے کی ٹینشن سوار ہو گئی تھی جانے وہ ک

قسم کی گفتگو کرنا چاہتا ہے۔

بانیجے اس کی ڈیوٹی آف ہوگئی وہ اپنا اسکارف اور بیگ سنبھال کے کھڑی ہوگئی ڈیوٹی پر دوسری لڑکی آگئی تھی جو صبح تک ہوتی تھی۔ کینٹین میں آگئی تھی۔ اسپتال کا کینٹین بہت بڑا تھا۔ وہ کونے کی میز پر بیٹھ گئی کچھ ہی دیر میں شہیر بھی بلک پیٹ اور اسکائی بلیو شرٹ میں اپنے لمبے توانا قد کے ساتھ چلا آیا۔

”کولڈ ڈرنک لیتے ہیں پہلے۔“ وہ ساتھ ہی آرڈر بھی دے آیا تھا۔
کولڈ ڈرنک آگئی تھی مگر رمضان کو گھبراہٹ ہو رہی تھی۔

”آپ پی تولیں۔“

”سر میں جلدی میں ہوں۔“ اس نے غلت دکھائی۔

”مجھے خبر ہے۔“ وہ پھر ہنسا۔

”اچھا میں لمبی چوڑی تمہید نہیں باندھوں گا۔ آپ کا میرے بارے میں کیا خیال ہے۔“

”جی۔“ وہ چونک گئی۔

”ارے بھئی جواب دیں۔“

”سر اس بات کا مطلب کیا ہے۔“ وہ تاسمجھی کی کیفیت میں مخاطب ہوئی۔

”اگر زندگی بھر کے لیے میں آپ کا ساتھ مانگوں تو آپ میرا ہاتھ تھامیں گی۔“

اچانک سے بولنے پر وہ تو حواس باختہ ہی ہوگئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا جواب دے۔

”رمضان میں نے اتنی مشکل بات تو نہیں پوچھی۔“ اس نے اس کی گرتی پڑتی ہلکوں کی جھال کو دیکھا۔

”سر میں اپنی اوقات سے زیادہ خواب نہیں دیکھتی۔ سوری مجھے دیر ہو رہی ہے گھر میں سب انتظار

کر رہے ہوں گے۔“ وہ اس سے نگاہ چرائی ہوئی چیز سے کھڑی ہوگئی۔

”یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“ وہ حیران رہ گیا۔

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں حقیقت پسند لڑکی ہوں اپنے قد اور اوقات سے زیادہ کی کبھی خواہش بھی نہیں

کی۔“ لمبے میں اس کے حسرت بھی پنہاں تھی۔

”یہ بھی کفر ہے جب آپ کے آگے بہتر مستقبل ہو اور آپ اس سے نگاہ چرا رہی ہیں۔“

”سر میں اور میرے گھروالے فوراً نہیں کر سکتے۔“ وہ رکی نہیں اور تیزی سے چلتی چلی گئی۔

شہیر کو وہ اپنے دل سے اور قریب لگی۔

کتنی سادہ سوچ تھی ذرا بھی دوسری لڑکیوں کی طرح غرہ نہیں تھا۔

”رمضان تم نے میرے دل کو چھو لیا ہے۔ تم چاہے کتنا انکار کرو میں تمہیں اپنی زندگی میں ضرور شامل

کروں گا۔“ وہ بھی کھڑا ہو گیا۔

صنوبر کی شادی میں ایک مہینہ ہی رہ گیا تھا۔ اس کی یہی کوشش تھی رمضان سے اس کے سب گھروالے

مل لیں۔ امی کو بھی وہ پسند آگئی تھی۔ اس کی پسند سے کسی کو اختلاف نہیں تھا۔ ایک دادی جان تھیں انہیں ہی

اختلاف ہو سکتا تھا۔ شہیر نے سوچ لیا تھا انہیں بھی کیسے منانا اور راضی کرنا ہے۔

☆.....☆

یونیورسٹی سے آ کے وہ سو گئی تھی۔ صبح سے لے کے دوپہر تک کی تھکن اسے اٹھنے نہیں دیتی تھی۔ بڑا مشکل سے وہ ابھی تھی۔ منہ ہاتھ دھو کے واش روم سے نکلی تھی جائے کی طلب ہو رہی تھی بلیک ٹراؤزر پر عنڈو شرت اور اس پر لمبا سا اسکارف گلے میں ڈالے وہ نیچے آگئی تھی۔ کچن میں دیکھا شام کے چائے بن رہی تھی۔

”امی چائے دے دیں۔“ وہ تھکی تھکی سی ان سے مخاطب تھی۔
 ”تم نے دوپہر میں کھانا بھی نہیں کھایا۔“ انہوں نے اس کا ست چہرہ دیکھا۔
 ”یونیورسٹی میں رول سمو سے کھائے تھے اس لیے دل نہیں کر رہا تھا کھانے کو۔“
 ”چائے کے ساتھ کچھ کھانا ہے؟“

”بسکٹ کھالوں گی۔“ وہ کینٹ کھول کے بسکٹ کے پیکٹ نکالنے لگی تھی۔
 صنوبر بھی کچن میں آگئی تھی۔ بشری کی ہیلپ کے لیے۔
 ”ماہم تو یونیورسٹی میں بڑی ہو کے رہ گئی ہو۔“

”بے فکر ہو تمہاری شادی میں بھرپور شرکت کروں گی۔“ اس نے ہنس کے کہا۔
 بشری نے ٹرائل ترتیب دے دی تھی۔ ماسی باقی کا کام کرنے لگی تھی۔
 ”لگتا تو نہیں ہے کیونکہ جیسے تم مصروف ہو۔“

”ماہم ٹرائل لاؤنچ میں لے کے جاؤ۔“ بشری نے کہا۔
 ”امی مجھے سستی ہو رہی ہے۔ آپ نذیراں سے کہیں وہ لے جائے گی۔“ وہ ڈانٹنگ ٹیبل کی چیئر کھڑکے بیٹھ گئی تھی۔

”بیٹا تمہارے بابا پوچھ رہے تھے۔“
 ”میں آ جاؤں گی۔“ وہ بولی۔

بشری نے نذیراں سے کہا لے جانے کو اور خود بھی چلی گئی تھیں۔
 صنوبر، شیراز کے لیے فرنیچ فرازنے آئی تھی اور آلو کاٹنے بیٹھ گئی تھی۔
 ”تمہارے جانے سے تو گھر ہی خالی ہو جائے گا۔“

”پھر کیا خیال ہے شہزیل بھائی سے کہیں تمہیں بھی لے جائیں۔“ صنوبر نے معنی خیزی سے چھیڑا۔
 ”شہزیل پتا نہیں لے بھی جائے گا کہ نہیں۔“ لہجے میں حسرت و اداسی تھی۔
 ”شہزیل بھائی حقیقت پسند ہیں۔“

”ہاں میں تو خوابوں کی دنیا میں رہتی ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے شہزیل میرے ساتھ ہر وقت رومانس کرے، رومانٹک ہو۔“ وہ بھی چڑ گئی۔

”تم سے تو کوئی جیت نہیں سکتا۔“ صنوبر نے برز پر فرائی بین رکھا۔
 ”آپی کب تک نہیں گے۔“ شیراز اندر آیا۔

”کر رہی ہوں تم سر پر سوار ہونے نہیں آؤ۔“ جاؤ۔“ اس نے شیراز کو ذرا ڈپٹ کے کہا جو اندر آ گیا تھا۔
 ”وہ نود بھائی بھی کھا نہیں گے۔“

”ہاں سب کو بتادو۔“ اس نے کہا۔
 ”تم بازار سے جا کے لے آؤ۔“ ماہانے شیراز کو ایڈوانس دی۔
 ”اپنے بھائی کو جا کے کہیں جو انتظار میں بیٹھے ہیں۔“
 ”دیکھتی ہوں جا کے۔“ وہ اٹھ گئی۔
 صنوبر فریج فرارز تلے میں لگی رہی تھی۔
 لاؤنج میں سارے ہی موجود تھے۔ جس کی توقع نہیں تھی۔ وہ بھی موجود تھا مگر شہیر سے کسی مسئلے پر
 ڈسکس میں لگا ہوا تھا۔

”اتر گئی سستی۔“ منیب احمد نے پوچھا۔
 ”جی۔“ وہ بیٹھی شہریل کی نگاہ اٹھی ضرور مگر جھٹ گھما بھی لی۔
 ”لیپ ٹاپ کیسا چل رہا ہے۔“
 ”بابا کچھ مسئلہ کر رہا ہے۔“ اس نے بتایا۔
 ”شہریل کو بتایا نہیں؟“
 ”یہ نظر ہی نہیں آئے جو بتاتی۔“ جھٹ شہریل پر ڈال دیا۔
 ”شہریل۔“ انہوں نے اسے پکارا۔ جو مودب انداز میں چونکا۔
 ”جی انکل۔“

”بینا اس کالیپ ٹاپ تم نے چیک نہیں کیا۔“
 شہریل نے ماہا کو دیکھا جو منیب احمد کے ساتھ ہی بڑے صوفے پر بیٹھی تھی۔
 ”انکل میں نے ان سے کہا تھا انہوں نے نہیں بتایا۔“ وہ گھبرا بھی گئی۔
 ”جاؤ لے کے آؤ۔“ منیب احمد نے کہا۔
 ماہانی تورگ ظرافت پھڑک رہی تھی وہ شہریل کو تنگ کرنا چاہ رہی تھی کسی طرح بھی کئی دن سے دونوں
 کا سامنا بھی تو نہیں ہوا تھا۔

”بابا یہاں کیسے لے کے آؤں۔“ وہ بولی۔
 ”میں خود لے آتا ہوں۔“ وہ اٹھنے لگا مگر فوراً ہی رک بھی گیا بشری کی تنقیدی نظریں ماہا پر اٹھ گئیں۔
 وہ جیسے ماہا کی شرارت بھی سمجھ گئی ہوں۔
 اس نے جزبہ ہو کے پہلو بدلا تھا۔

ماہا خود ہی اٹھ گئی۔ بشری اس کی اچھی طرح خبر لے سکتی تھیں۔ وہ سیڑھیاں چڑھ گئی تھی۔ شہریل نے
 حیرانگی سے دیکھا تھا وہ سب جانے بی رہے تھے۔

ماہا شہریل کے روم میں چلی گئی تھی اسے قوی امید تھی وہ ضرور آئے گا۔
 شہریل کے روم میں ہر چیز ہی سلیقے اور ترتیب سے رکھی ہوئی تھی۔ بک شیلف بھی تھا جس میں مختلف
 قسم کی بکس تھیں اس نے پھر وارڈروب کھولی ترتیب سے پیگنگ کیے ہوئے کپڑے لٹکے تھے۔
 ”چل ماہا تجھے تو ذرا بھی یہ شخص بے ترتیبی کرنے نہیں دے گا۔“ اس نے پھر وارڈروب بند کی، آہٹ

ہوئی اس نے چونک کے وحشت زدہ نگاہ اٹھائی شہزیل اندر تھا۔
 ”آپ اُدھر کیا کر رہی ہیں۔“ لہجہ سخت اور ناگواریت لیے ہوئے تھا۔
 ”کیوں میں نہیں آ سکتی۔“ اس نے اپنا اسے کارف شانوں پر سمیٹا۔
 ”کیوں آپ میری عزت کی دشمن ہو گئی ہیں۔“ وہ برہم ہو رہا تھا۔ جو اتنی پراعتماد اور غرور بنی اس
 مقابل تھی۔

”میں کیا تمہاری عزت لوٹنے آ گئی ہوں۔“ خود ہی ترکی بہ ترکی بول کے تسخراڑایا۔
 وہ جھینپ کے دانت پیسنے لگا کیوں کہ اندر کا غصہ اسی طرح دبا سکتا تھا مگر جب سے دونوں کی نسب
 طے ہوئی تھی وہ ماہر سے ڈرتا تو نہیں تھا بلکہ اسے ڈانٹنے بھی لگا تھا۔
 ”پلیز آپ جائیے یہاں سے۔“

”میں اندر ہوں روم کے کسی کو خبر نہیں ہے پھر کیوں اتنا گھبراہے ہو۔“ وہ اس کے بیڈ پر بیٹھ گئی۔
 ”کیوں آپ مجھے ذہنی اذیت دیتی ہیں۔“

”ایسی کیا ذہنی اذیت دے دی۔ صرف یہاں آئی ہوں۔“
 ”آپ میرے روم میں اس طرح نہیں آیا کریں۔“
 ”پھر کس طرح آؤں۔“ وہ پھر انجان بن کے بولی۔

”ماہا آپ بچی نہیں ہیں۔ جانتی ہیں میں کیوں کہہ رہا ہوں۔“ آنکھوں میں غضب ناک غصہ نظر آ
 تھا۔

”تم بھی بچہ نہیں ہو جانتے ہو میں کیا چاہتی ہوں۔“ وہ بھی تیز لہجے میں بولی تھی۔
 ”دیکھیے ماہا ہر بات کا ایک وقت اور موقع ہوتا ہے اور اسے اسی وقت کیا جائے تو اچھا ہے۔“ وہ اسے
 سمجھ بچی سمجھ کے سمجھانے لگا۔

”تم تو وقت اور موقع بھی ہوگا پھر بھی یہی کرو گے مجھے انور کرو گے۔“ اس کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔
 شہزیل لب بھینچ کے رہ گیا جس وقت سے وہ اس کے سامنے آئی تھی وہ کڑے امتحان سے ہی گزر رہا
 رشتے سے منسلک ہونے کے بعد جانے کیوں نہ چاہتے ہوئے بھی وہ دل کے ایوانوں میں آ گئی تھی۔ وہ
 مرد تھا جذبات اور احساسات پر پھرے بٹھائے ہوئے تھا۔

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں ایسا نہیں ہوگا۔“ وہ پھر سے گویا ہوا۔
 ”تم کوئی تو احساس کرو، کوئی تو ایسا خوب صورت لمحہ میرے ہاتھ میں دو جس کے سہارے وقت گز
 لوں۔“ وہ حسرت سے بول رہی تھی۔

”میں سہارے پر وقت نہیں گزارتا۔“
 ”مجھے تو سمجھ نہیں آتا تم آخر کس سوچ کے مالک ہو۔“ وہ زچ ہو گئی۔

”آپ میری سوچ کو جانتی اور جھٹکتی ہیں۔“
 ”ٹھیک ہے مجھے اسی طرح اوقات میں رکھو میں یہ رشتہ ہی ختم کر دوں گی مجھے نہیں گوارہ تم میری
 عزتی کرو۔“ وہ روہانے لہجے میں بولتی ہوئی بیڈ سے تن پھن کرتی ہوئی اٹھی اور جانے لگی۔

شہزیل تو گڑبڑا ہی گیا اور اس کا بازو پکڑ لیا جو گیٹ کھول کے نکل ہی رہی تھی۔
”ادھر رکیے۔“

”چھوڑو میرا بازو۔“ وہ اپنا بازو چھڑانے لگی۔ آنکھوں میں آنسو جھلما رہے تھے۔
”آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ میری بات سنئے۔“ وہ بھی سٹپٹا گیا۔ گھبراہٹا ہوا ہو گیا تھا۔ کیونکہ ماہانے رونا شروع کر دیا تھا۔

”میں تمہیں سمجھ گئی ہوں مجھے جانے دو۔“ وہ اس کی صورت تک دیکھنا نہیں چاہ رہی تھی۔
”میں بابا سے کہوں گی مجھے تم سے کوئی شادی نہیں کرنی۔“

”ماہا پلیز بات سنئے میری۔“ وہ تیز لہجے میں بولا۔ وہ بھی جانتا تھا ماہا ہر قسم کا ہنگامہ کر سکتی تھی۔ اپنی نسیں کاٹ سکتی تھی اس کے آگے بھی کچھ کر سکتی تھی۔
”نہیں سنی، جانے دو مجھے۔“ وہ چیخی تھی۔

شہزیل نے گھبرا کے اسے چھوڑ دیا تھا اور وہ آندھی طوفان کی طرح بھاگی تھی۔
وہ بے چین بے قرار ہو گیا تھا کیونکہ وہ رشتہ ختم کرنے کا کہہ رہی تھی۔ ایک دم سے کھلبلی مچ گئی تھی۔
”کیا کروں۔“ وہ روم سے نکلنے لگا مگر پھر رک گیا۔

ماہا یقیناً اپنے روم میں مکی ہوگی۔ وہ شش و پنج میں مبتلا ہو گیا۔ ماہا کے روم میں جائے یا نہیں، رشتہ تو وہ ختم کرنا نہیں چاہتا تھا مگر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کے وہ باہر نکلا۔ نیچے جھانک کے دیکھا ہال کمرے میں بھی کوئی نہیں تھا۔ نوادنی وی لاؤنج میں بیٹھا تھا۔

اس کے روم سے آگے والا ماہا کا روم تھا۔ اطراف میں نگاہ دوڑائی کوئی دیکھ تو نہیں رہا تھا۔ وہ تیزی سے ہینڈل گھما کے اندر جھانکنے لگا واقعی وہ ہنسی ہوئی رو رہی تھی۔ وہ اندر داخل ہو گیا۔

ماہانے چونک کے حیرانگی سے اسے دیکھا۔ شہزیل اور اس کے روم میں۔

”تم..... تم.....“ رونا بھول کے وہ بیڈ سے کھڑی ہو گئی۔

”جی میں۔“ وہ چہرے پر سنجیدگی لیے بولا۔

”کیوں آئے ہو؟“ وہ چیخی۔

”آہستہ آرام سے۔“ وہ چلتا ہوا اس کے بیڈ تک آ گیا۔

”آپ میری سستی تو ہیں نہیں۔“

”کیا سنوں۔“ وہ پھر بولی۔

”چلے جاؤ یہاں سے۔“

”ماہا پلیز صفائی کا موقع تو دیں۔“ التجائے انداز میں اس سے مخاطب ہوا۔

”صفائی کا موقع دوں تمہارے رویے واضح کرتے ہیں میں صرف پتھر سے سر پھوڑ رہی ہوں۔“

”میں نے صرف وقت کی بات کی تھی مجھے وقت لگے گا آپ دیکھیں ابھی سے ہی اکتا گئیں۔“

اس کی نگاہ ماہا پر تھی جو رو رہی تھی۔ اس کی جانب دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔

”میں کیا کروں پھر۔“ اس نے سراٹھایا۔

”آپ انتظار تو کر سکتی ہیں۔“

”انتظار کس بنیاد پر تمہاری سردہری رکھائی دیکھتے ہوئے بھی کیسے کروں۔“

”میں نے فیصلہ کر لیا ہے یہ رشتہ غلط ہو گیا ہے۔“

”ماہا۔“ بشری کی آواز آئی۔

دونوں ہی شپٹا گئے۔ وہ ابھی اور سرعت کی تیزی سے دروازہ لاک کر دیا اگر امی نے اسے دیکھ لیا تو یہ اچھا نہیں ہوگا۔

”اف مارے گئے۔“ شہزیل نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔

”ماہا..... ماہا دروازہ کھولو۔“ ان کی فکر مندی پریشان آواز آرہی تھی۔

”کیا کروں۔“

”رکومیں دیکھتی ہوں۔“

شہزیل دونوں ہاتھ پشت پر جمائے کھڑا تھا اور بے بس بھی نظر آ رہا تھا۔

”میں باہر جا رہی ہوں تم دھچک کر چلے جانا۔“ وہ اپنے آنسو صاف کر کے بولی تھی۔

شہزیل کو اس پر ترس بھی آنے لگا جو اسے شدت سے چاہتی ہے۔ اس کے ساتھ کچھ اچھا نہیں کروں گا۔ اسے تو اپنے گھر والوں کی جستجو سے وہ مل جائیں تو ہی وہ آگے کچھ سوچے گا۔

وہ چلی گی اور شہزیل نے اپنا رکاوٹ ہوا سانس بحال کیا۔ اسے نئی فکر دے گئی تھی اس کی شخصیت سو بر تھی وہ کوئی بھی ایسی حرکت نہیں کرنا چاہتا تھا جو اس کی شخصیت خراب کرے۔

”ماہا میں تمہیں وقت آنے پر بہت محبت دوں گا اور محبت کا اظہار بھی کروں گا مگر اتنی جلدی نہیں جب تک میرے گھر والے نہیں مل جاتے۔“ اس نے لاک گھمایا اور اطراف میں نگاہ دوڑائی کوئی نہیں تھا وہ نیچے بیڑھیاں اتر گیا تھا۔ شہیر کے ساتھ کسی ضروری کام سے بھی جانا تھا۔

☆.....☆

فہر یکسوئی سے اپنے کام میں مصروف تھا۔ کنول آئی بھی تو انہوں نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ بھی ان سے ناراضی اور خفگی رکھے ہوئے تھا۔

”اپنے اوپر توجہ دے لو کیسے ہوتے جا رہے ہو۔“ زہرہ نے اس کی صورت دیکھی جو اتاری ہوئی تھی۔

”کیسی توجہ۔“ وہ جیسے انجان بنا تھا۔

”بننا بھائی بھی ضیاء کی شادی کرنا چاہ رہی ہیں اور میں بھی چاہتی ہوں تمہاری بھی ہو جائے۔“ زہرہ نے اس کی سنجیدہ صورت دیکھ کے کہا۔

”امی میں تو شادی کروں گا ہی نہیں۔“ وہ جیسے بہت دلبرداشتہ ہو گیا تھا۔ نیل فر کے رویے کے بعد اور پھر کنول بھی تو اس سے ہنوز ناراضی رکھے ہوئے تھیں۔ کتنی ہی دفعہ اس نے ان کو کال بھی کی مگر وہ اس سے بول ہی نہیں رہی تھیں۔ اس کا دل کتنا کٹتا تھا۔ وہ بہت افسردہ رہنے لگا تھا۔

”کیوں تم کیوں نہیں کرو گے۔“ وہ حیرانگی سے اس کے سامنے آ کے بیٹھیں وہ فہر کے بچھے بچھے انداز پر فکر مندی ہو گئیں۔

”کیا کرنا ہے شادی کر کے جی کا جنجال ہی ہے سوائے جج جج کے کچھ نہیں ہے۔“
 ”فہر ادھر دیکھو میری طرف۔ کیا ہوا ہے؟“
 ”کچھ نہیں ہوا۔“ وہ اٹھا۔
 ”بیٹھو ادھر، بتاؤ۔“

”پلیز امی میں بہت تھکا ہوا ہوں آرام کروں گا۔“ وہ بے زاری اور اکتائے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔

زہرہ ماں تھیں۔ بیٹے کی اداسی انہیں پریشان کر گئی تھی۔

”تم مجھے ٹال رہے ہو یا بات نہیں کرنا چاہتے۔“

”آپ ضیاء کی فکر کریں مجھے چھوڑ دیں۔“

”فہر تم کسی کو پسند کرتے ہو؟“ انداز نقشہ نشی تھا۔

”پسند کروں یا نہ کروں وہ تو مجھے نہیں کرتی۔“ لہجے میں حسرت پنہاں تھی۔ کسی لمحے بھی وہ نیل فر کی یاد سے غافل نہیں تھا۔

”کون ہے مجھے بتاؤ۔“

”کوئی فائدہ نہیں کیونکہ میں بھی زبردستی کرنے لگا ہوا تھا۔“

”بیٹا مجھے تو بتاؤ ایسا کیا ہوا ہے جو اتنے بد دل اور بے زار لگ رہے ہو۔“ انہوں نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیا۔

”کیا کریں گی جان کے وہ میری قسمت میں ہی نہیں ہے۔“ دل اتنا ٹوٹا ہوا ہور ہا تھا۔

زہرہ نے اپنے دل پر ہاتھ ہی رکھ لیا اتنی بے چینی اور بے تاب ہوئے لگی کہ کسی طرح بھی وہ چاہتی تھیں

اپنے بیٹے کی اداسی دور کر دیں۔

”امی جانے دیں۔“ وہ اٹھا۔

زہرہ نے پھر اسے کچھ نہیں کہا وہ اپنے روم کی سمت بڑھ گیا مگر ان کے ذہن میں کئی سوال دے گیا۔
 کنول سے وہ خود کہہ رہی تھیں۔ ضیاء کے ساتھ ساتھ فہر کے لیے بھی کوئی لڑکی دیکھے مگر فہر نے تو انہیں فگر میں مبتلا کر دیا۔

”امی..... امی۔“ مہاد نے ان کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرایا۔

”آں ہاں۔“ انہوں نے ایک لمبی سانس خارج کی۔

”آپ اتنی گہری سوچ میں.....! خیریت تو ہے۔“ اس نے ان کے ہاتھوں کو تھاما۔

”کچھ نہیں۔“ وہ سنبھل کے بیٹھ گئیں۔

”ضرور کوئی بات ہے۔“ وہ جیسے ماننے کو تیار ہی نہیں تھا۔ فہر چائے کا کہتا اپنے روم سے نکلا تھا۔ امی

اور مہاد کو کوٹنگلوڈ دیکھا تو واپس اپنے روم میں آ گیا۔

امی کو بھی اس نے فکر میں مبتلا کر دیا تھا اور وہ اتنا مایوس اور افسردہ تو کبھی ہوا ہی نہیں تھا ارادوں کا پکا تھا

اور پراعتماد تھا۔ اتنی جلدی اپنی محبت سے ہار گیا تھا۔

وہ اتنی جلدی تو ہمارے ماننے والوں میں سے نہیں تھا مگر اپنی بہن کی ناراضی نے اس کے ارادوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ نیل فرسے جانے کیوں ضد ہو گئی تھی اس کی خاطر بہن نے اس سے بولنا چھوڑ دیا تھا۔
 ”نیل فرتمہیں میں کبھی بھی نہیں بخشوں گا پہلے محبت تھی مگر اب ضد ہو گئی ہو۔“
 ”کاش کاش تم میری زندگی میں نہ آئی ہو تیں۔“ وہ آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔
 مگر پھر سیل اٹھایا۔ نیل فر تو کال ریسیو ہی نہیں کرتی تھی اور کنول انہوں نے بھی جیسے اس کی طرف سے کان بند کر لیے

”فہر سور ہے ہو۔“ زہرہ پھر چلی آئی تھیں۔

”جی امی۔“ وہ سیدھا ہو گیا۔

”تمہارے ابو بلا رہے ہیں۔“

”آپ نے ابو سے بھی کہہ دیا۔“ وہ تو پریشان ہو گیا۔

”تمہاری ایسی معنی خیز باتوں نے میرا دل پریشان کر دیا ہے۔“ انہوں نے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرا
 رحمان علی اس کے منتظر بیٹھے تھے۔

”ایسا کیا ہوا ہے جو تمہاری ماں پریشان ہیں۔“ وہ انجان بنے۔

”ابو امی خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہیں۔“ اس نے چہرے پر بناشت ظاہر کی۔

”زیادہ بنانے کی ضرورت نہیں بتاؤ کون لڑکی ہے؟“ وہ خاصے سنجیدہ انداز میں پوچھ رہے تھے۔

”وہ کوئی نہیں تھی۔ میں بھول گیا ہوں۔“

اس نے پھر ٹالا۔

زہرہ نے رحمان علی کو پہلو بدل کے دیکھا اور اشاروں سے کہا پھر پوچھیں۔

”فہر مجھے نالو نہیں۔“

”میں کسی کو نہیں نال رہا کوئی نہیں ہے پلیز مجھ سے نہیں پوچھیں۔“ وہ چڑ کے اٹھا اور چلا گیا۔ راستے

میں مہاد سے اس کا کندھا ٹکرایا تھا۔

”ابو، آپ ایسے تو بھائی کو نہیں چھوڑیں ضرور ان کا کسی لڑکی نے دل توڑا ہے۔“

”تم چپ کرو۔ رحمان علی نے اسے ڈانٹ دیا۔“

مہاد لب بلب کر رہ گیا، زہرہ الگ گم صمی ہو گئیں۔

”تم پریشان نہیں ہو میں ایک دودن میں خود دوبارہ بات کروں گا۔“ انہوں نے انہیں تسلی اور اطمینان دلایا۔

”آپ کنول سے کہیں اس کے لیے بھی لڑکی دیکھیں کیونکہ اسے ایسے نہیں چھوڑا جاسکتا۔“ ان کا انداز

بھی خاصا پرسوج تھا۔

”اچانک سے بھائی کو ہوا کیا ہے۔ امی میں نے کہا تھا نا آپ سے بھائی اس دن کسی لڑکی سے بات

کر رہے تھے۔“ مہاد کو گزشتہ کی بات یاد آئی۔ زہرہ نے سر ہلایا فہر جو اتنا پر شوخ اور ہنسنے ہنسانے والا تھا

ایک دم سے ایسا اداس ہو گیا تھا دل کو بے گلی ہو گئی تھی۔

(جاری ہے)

روحانی ڈائری

شہلا گل سحر صالح کی ڈائری سے

ایک خوب صورت نظم

میری اداسیوں اور مایوسیوں کی تاریکی

بس ایک آس ہے

اس کی سانسوں کی

خوشبو میرے

آس پاس ہے

کانوں میں امرت

گھولے

اتنی اس کے لہجے میں

اتنی مٹھاس ہے

میں اُسے کیوں

بتاؤں

کہ وہ میرے لیے

کتنا خاص ہے

میں اُسے یاد کر کے

روتی ہوں

کیا؟ اُسے اس

بات کا احساس ہے

سعدیہ عابدی کی ڈائری سے

گلزار کی نظم

کیلی رات کے اک ہاتھ پر

رکھ دی میں نے

چاند کی مصری

وہ دن روٹھا ہوا تھا

دھول میں لپٹا ہوا تھا

اک مدت سے

تیرے آنچل سے چہرہ پوچھ کر

بہلا لیا اس کو

خفا تھا میں خود اپنے سے

اب اپنے ہی گلے سے لگ کے بہلا ہوں

ترے غم کا نمک چکھ کر

بڑا میٹھا لگا ہے

زندگی کا ذائقہ مجھ کو

رابعہ افضل کی ڈائری سے

ایک خوب صورت غزل

جو اتر کے زینہ چشم سے تیری چشم خوش میں سما گئے

وہی جلتے بجھتے چراغ سے میرے بام و در کو سجا گئے

یہ عجیب کھیل ہے پیار کا میں نے آپ دیکھا یہ معجزہ

وہ جو لفظ میرے گمان میں تھے وہ تیری زباں پر آ گئے

وہ جو گیت تم نے سنا نہیں میری عمر بھر کا ریاض تھا

میرے درد کی کمی وہ داستان جسے تم ہنسی میں اڑا گئے

تیری بے رخی کے دیار میں، میں ہوا کے ساتھ ہوا ہوا

تیرے آئینے کی تلاش میں میرے خواب چہرہ گنوا گئے

تیرے دوسروں کے فشار میں تیرا شہر رنگ اجڑ گیا

میری خواہشوں کے غبار میں میرے ماہ و سال بکھر گئے

چارہ گر میں تمہیں کس طرح سے کہوں
میں نہیں مانتا میں نہیں جانتا
دیپ جس کا محلات ہی میں چلے
چند لوگوں کی خوشیوں کو لے کر چلے
جو سائے میں ہر مصلحت کے پلے
ایسے دستور کو صبح بے نور کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں جانتا

دھنک ناز کی ڈائری سے

ایک خوب صورت غزل

جانے کہاں سے روز آتی ہے بلبل
پھولوں کو ادا نہیں دکھاتی ہے بلبل
دکھوں میں دیتے ہیں دل کو تسلی
سکھوں میں جو گیت گاتی ہے بلبل
چرا کر گلوں سے وفاؤں کی خوشبو!
پھر اپنے ہی اشکوں نہاتی ہے بلبل
مستوتوں کے پھول سبھی لٹا کر
تنہائی میں آنسو بہاتی ہے بلبل
اڑانوں میں توانائی اپنی بڑھا کر
دلوں میں الفت جگاتی ہے بلبل
پت جھڑ کے بے رنگ موسموں کو
غم ہجراں کے نغمے سناتی ہے بلبل
تصور میں دیکھا ہے قص بہاراں
خیالوں میں جب مسکراتی ہے بلبل
چاہتوں کے پھول دل میں سجا کر
دلوں کے غنچے کھلاتی ہے بلبل
پیار کی خوشیاں پوچھو حسین سے
میرے من کو کیسے بہلاتی ہے بلبل

☆.....

وہ عیب پھول سے لفظ تھے تیرے ہونٹ جن سے مہک اٹھے
میرے دشت خواب میں دور تک کوئی باغ جیسے لگا گئے
میری عمر سے نہ سٹ کے میرے دل میں اتنے سوال تھے
تیرے پاس جتنے جواب تھے تیری اک نگاہ میں آگئے

آنسو احسان کی ڈائری سے

نوشتہ گیلانی کی نظم

بہت تاخیر سے لیکن
کھلایہ بھید خود پر بھی
کہ میں اب تک
محبت جان کر جس

جذبہ دیرینہ کو اپنے لہو سے سینجی آئی
وہ جس کی سماعت صد مہر باں ہی زندگی کی
شرط ٹھہری تھی
فقط اک شائبہ ہی تھا محبت کا
یونہی عادت تھی
ہر رستے پر اس کے ساتھ چلنے کی
وگر نہ ترک خواہش پر
یہ دل تھوڑا سا تو ڈکھتا
ذرا سی آنکھ نم ہوتی

ایم جے قریشی کی ڈائری سے

حبیب جالب کا کلام

میں بھی خائف نہیں تختہ دار سے
میں بھی منصور کہہ دو اغیار سے
کیوں ڈراتے ہو زنداں کی دیوار سے
ظلم کی بات کو جہل کی رات کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں جانتا
تم نے لوٹا ہے صدیوں ہمارا سکون
اب نہ ہم پر چلے گا تمہارا فسوں

الشعار

آنسہ احسان _____ کھاریاں
غور جو کیا میں نے زندگی کے فلسفوں پر
بات مٹی سے شروع ہو کر خاک میں جا ملی
نا نکلے جبین _____ کھاریاں
بزم عشق میں چلتا رہا قافلہ گلی گلی
نہ لیلیٰ اونٹ سے اتری نہ پیچھا بجنوں نے چھوڑا
مہوش ہمایوں _____ کھاریاں
میں اس کی کھوج میں دیوانہ وار پھرتی رہی
اسی لگن سے کبھی مجھ کو ڈھونڈتا وہ بھی
عائشہ نسیم _____ کھاریاں

میں ان باتوں سے ڈرتا ہوں

جو باتوں کے بعد ہوتی ہیں

رابعہ منیر _____ سرگودھا
وہ خود کو سنگ کہتا ہے چلو ہم ایسا کرتے ہیں
یہ دنیا چھوڑ کر اس کو ذرا دلگیر کرتے ہیں
وہ مجھ کو چھوڑ جائے گا میرا وجدان کہتا ہے
سو اپنا آپ اس کی راہ کی زنجیر کرتے ہیں
عاصمہ رشید _____ فیصل آباد

جانے اس شخص کو کیسا یہ ہنر آتا ہے
رات ہوتی ہے تو آنکھوں میں اتر آتا ہے
میں اُسے اپنی دعاؤں سے نکالوں کیسے
وہ میری سوچ کے ہر سے پر نظر آتا ہے

سائرہ مشال _____ کراچی
گویا اندازِ شہانہ امیروں جیسا
میرے اندر کا ہے انسان فقیروں جیسا
ہم نے چہرے پر سجا رکھی ہے دنیا کی رونق
مگر دل کا عالم ہے دیران جزیروں جیسا
شہلا گل سحر صالح _____ کوہاٹ
تیری یادوں سے دل و جان کو نہال رکھا ہے
جنم کا نہ سہی روح کا رشتہ بحال رکھا ہے
پچھڑے لمحے تیری پلکوں کی دہلیز سے جو اتر آ
سحر وہ اشک میں نے آنچل میں سنبھال رکھا ہے
عروج فاطمہ _____ ملتان

ایسا کرو بھول جاؤ مجھے

یا پھر نہ یاد آؤ مجھے

ستم ڈھائی ہے تیری بے رخی جاناں

اس طرح سے نہ آزمائے مجھے

فرزانہ شوکت _____ کراچی
خاموش کیوں ہو بھا کیوں نہیں دیتے
بسل ہو تو قاتل کو دعا کیوں نہیں دیتے
منصف ہوا اگر تم تو کب انصاف کرو گے
مجرم ہیں اگر ہم تو سزا کیوں نہیں دیتے
مہرین کنول _____ کھاریاں
فقط باتیں اندھیروں کی محض قصے اُجالوں کے
چراغ آرزو لے کر نہ تم نکلے نہ ہم نکلے

امبرین حیدر ————— اسلام آباد
لب پہ اک حرف طلب تھا نہ رہا تیرے بعد
دل میں تاثیر کی خواہش نہ دعا تیرے بعد
ایک قیامت کی خراشیں میرے چہرے پہ بھیں
ایک محشر میرے اندر سے اٹھا تیرے بعد
نگہت توقیر ————— چیچہ وطنی

بھول جانے کا تو بس اک بہانہ ہو گا
کہ بہر طور اسے یاد تو آنا ہو گا
بند مٹھی سے جواڑ جاتی ہے قسمت کی پری
اس ہیلی میں کوئی چھید پرانا ہو گا
سعدیہ منیر ————— گجرات

بھول بھی جاؤ بیتی باتیں
ان باتوں میں کیا رکھا ہے
چپ چاپ کیوں رہتے ہیں ناصر
یہ کیا روگ لگا رکھا ہے
ریمل علی ————— اوکاڑہ

میرا اس شہر عداوت میں بسیرا ہے فراز
جہاں لوگ سجدوں میں بھی لوگوں کا براچاہتے ہیں
تبسم بانو ————— کوئٹہ

تو نے نفرت سے جو دیکھا تو مجھے یاد آیا
کیسے رشتے تیری خاطر یونہی توڑ آیا
کتنے دھندلے ہیں یہ چہرے جنہیں اپنایا
کتنی اجلی تھیں وہ آنکھیں جنہیں چھوڑ آیا

صباحر ————— ہارون آباد
اس لیے کوئی زیادہ نہیں رکتا ہے یہاں
لوگ کہتے ہیں میرے دل پہ تیرا سایہ ہے
نور بانو ————— کوئٹہ

اس بار وہ ملا تو عجیب اس کا رنگ تھا
الفاظ میں ترنگ نہ لہجہ دبنگ تھا

اک سوچ تھی کہ بکھری ہوئی خال و خد میں تھی
اک درد تھا کہ جس کا شہید انگ انگ تھا
دھنک ناز ————— کراچی
جو کبھی تو پڑھنے بیٹھے مجھے حرف حرف دیکھے
تیری آنکھیں بھگ جائیں تو کتاب بھول جائے
تیری سوچ پر ہو حادی میری یاد اس طرح سے
کہ تو اپنی زندگی کا حساب بھول جائے
حتنا علی ————— ملتان

اب کے برس کچھ ایسی تدبیریں کرتے ہیں
مل کے اک شہر محبت تعمیر کرتے ہیں
کچھ خواب یقین کی سرحد پر آ پہنچے
آنکھ کھلنے سے پہلے ان کی تعمیر کرتے ہیں
راؤ تہذیب، حسین تہذیب — رحیم یار خان
عیب آتے ہیں نظر تو دوسرے انسان میں
ہر کوئی اک دوسرے پر طعنہ زن ہے آج کل
یہ بھی سچا وہ بھی سچا میں بھی سچا ہوں اگر
کون سچا ہے یہاں اس عالم امکان میں
عبد الغفار عابد ————— چیچہ وطنی
سب کچھ حاصل نہیں ہوتا زندگی میں
کسی کی کاش اور کسی کا اگر رہ ہی جاتا ہے
سعادت علی خان ————— لیہ

میں نے آنکھوں میں جھانکنا چاہا
اس نے دل میں اتار دیں آنکھیں
شاہین اشفاق ————— حجرہ شاہ مقیم
ہمیں اس سرد موسم میں تری یادیں ستانی ہیں
تمہیں احساس ہونے تک یہ موسم بیت جائے گا
انور طالب ————— اسلام آباد

دوسرے عشق سے بچنے کے لیے
اس کی تصویر کا تعویذ بنا لیتا ہوں

☆.....

اس ماہ میں

ردا کو کامیابی کے اٹھارہ سال بہت مبارک ہوں۔ صالحہ آپ، نورین آپ، ردا کی پوری ٹیم کو ردا کی سالگرہ مبارک ہو۔ خدا کرے کہ ردا کی کامیابیوں کا سلسلہ یونہی چلتا رہے اور ڈیز فرینڈ! اب تمہیں اسماٹ کارڈ کے حصول کے لیے درخواست دے دینی چاہیے کیونکہ اب تم اٹھارہ سال کے ہو گئے ہو۔

اور پھر ایک عدد جیون ساتھی کی تلاش میں ہم تمہاری ضرورت درم کر رہے ہیں!!

”اک اور سالگرہ مبارک ہو ردا!!!“

سحر مبین۔ فیصل آباد

اس ماہ کا قطعہ ”لوڈ شیڈنگ“

اگرچہ حکومت کے جانے کے دن ہیں مگر ساتھ تو نے ہمیشہ نبھایا رہے حکمران تجھ سے خوش لوڈ شیڈنگ ہمیں تو نے آٹھ، آٹھ آنسو رلایا راؤ تہذیب حسین تہذیب۔ رحیم یار خان

اس ماہ باتوں سے خوشبو

☆ کسی سے اتنی نفرت نہیں کرو کہ وہ جینا ہی بھول جائے۔

☆ علم حاصل کرو اس کے لیے خواہ تمہیں چین ہی نہ کیوں جانا پڑے۔

☆ محبت ایسا درد ہے جو انسان کو اندر سے مار

اس ماہ میں ردا کی سالگرہ

ردا! میرا دوست میرا ساتھی جس نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی۔ میں نے کم لکھا لیکن جب بھی لکھا ہمیشہ حوصلہ افزائی کی گئی۔

صالحہ آپ! میری عزیز ہستی۔ ایک عظیم ہستی۔ محنتی انسان مجھے ہمیشہ اثریٹ کرتے ہیں اور جس قدر محنت سے انہوں نے ردا کو کامیاب بنایا

یہ مثال ہے۔ صالحہ آپ سے کی گئی پہلی بات مجھے آج بھی یاد ہے۔ ”آپ تو بہت چھوٹی ہیں۔

نورین مان کیسے گئی آپ کا ناول لگانے پر۔ آپ مختصر لکھیں۔“ اور اس کے بعد متعدد افسانے،

ناولٹ ردا کا حصہ بنے۔ صالحہ آپ کی حوصلہ افزائی ہمیشہ ساتھ رہی۔

نورین آپ! جن سے میں نے پہلی بار بات

کی۔ تب میں نائنٹھ کلاس میں تھی اور ان کے پیار سے بات کرنے نے میری حوصلہ افزائی کی اور

میں نے اپنی کہانی ارسال کر دی۔

آج ردا کے لیے لفظ لکھتے ہوئے قلم خود بخود

روانی دکھ رہا ہے۔ یہ وہ پہلا رسالہ ہے جس میں

میری کہانی کی اشاعت ہوئی۔ اس سے قبل میں

نے صرف کہانیاں لکھی تھیں یا پھر بچوں کے رسائل

میں شائع ہوتی تھیں۔ میں نے پہلی ڈائجسٹ

لیول کی تحریر ردا میں بھیجی اور وہ شائع ہوئی۔

☆ دیتا ہے۔
☆ والدین کی عزت کرو، اف تک نہ کرو۔
☆ سیراگل ناز یوسف۔ کراچی

☆ جھوٹ کے پاؤں تو ہوتے نہیں لیکن اس کی تیز رفتاری میں کوئی کلام نہیں۔
☆ ہر شخص سچا دوست تلاش ہے مگر خود کسی کا سچا دوست بھی نہیں بن سکتا۔
☆ فرزانہ شوکت۔ کراچی

☆ اس ماہ تشدد پسند خواتین!
☆ پاکستانی خواتین، اپنے شوہر نامدار کو جوتے، چمچے، بیلن یا پھر جھاڑو وغیرہ سے مارتی ہیں۔

☆ اٹالین خواتین اپنے مردوں پر اپنی ہاتھ سے حکومت کرتی ہیں اور بہت حد تک مار پیٹ بھی کرتی ہیں۔

☆ جاپانی اور چینی خواتین مارشل آرٹس و کرائے جیسے فنون کو استعمال کر کے اپنے مردوں کو پیٹنا پسند کرتی ہیں۔
☆ عرب خواتین بچوں کو ساتھ ملا کر شوہر کو مارنا پسند کرتی ہیں۔

☆ ایرانی و عراقی خواتین اپنے خاوندوں کو دوسروں سے چھپا کر اکیلے کمرے میں اپنے ہاتھ سے ان کی طبیعت صاف کرتی ہیں۔

☆ ناروے کی خواتین سخت مزاجی کے باعث اپنے شوہروں کو بہت مار پیٹ کرتی ہیں اور انہیں بے ہوش یا پھر باندھ دیتی ہیں۔

☆ روسی خواتین اپنے مردوں کی پشت پر ڈنڈے مارتی ہیں۔

☆ برطانوی خواتین جس جگہ چاہیں شوہر کی ٹھکانی شروع کر دیتی ہیں۔

☆ امریکی خواتین سیلف ڈیفنس کو مد نظر رکھ کر اپنے مردوں پر چڑھائی کرتی ہیں۔

اس ماہ کی مزاحیہ نظم

اور دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی وہاں بچکی جاتی ہے
اور ساری رات جگاتی ہے
کیا اب بھی کلمہ پڑھتے ہیں
جب لوگ گھروں سے نکلتے ہیں
کیا اب بھی مسجد جاتے ہیں
تو ننگے پاؤں واپس آتے ہیں
کیا اب بھی دام نہیں ہوتے
تو ہرگز لوگوں کے کام نہیں ہوتے
کیا اب بھی جب پولیس میں پرچہ ہوتا ہے
تو کورٹ یکجہری میں کافی خرچہ ہوتا ہے
عوام نے کیا کھویا کیا پایا ہے
اتنی لاشیں اٹھانے کے بعد
کیا قوم کا ہر فرد اب بھی سویا ہے
اور دیس سے آنے والے بتا
کس حال میں ہیں یارانِ وطن
ایم عامر نواز۔ کھاریاں

اس ماہ کی کرینیں

☆ زندگی کا حاصل ایک بہترین دوست۔
☆ دل اگر سونے چاندی کے ہوتے تو ہر پہلو میں سینکڑوں دل ہوتے۔
☆ غموں کی راہ پر بڑے سکون سے چل کہ یہ راہ خدا کی طرف جاتی ہے۔
☆ دنیا میں سب سے مشکل کام اپنی زبان کی حفاظت ہے۔

☆ بنگالی خواتین زندگی کے ہر شعبے میں مردوں پر حاوی رہتی ہیں اور شوہروں کی اصلاح کے لیے انہیں مارتی بھی ہیں۔
ایس امتیاز احمد۔ کراچی

مجھے جینا ہے مگر تڑپ تڑپ کر نہیں..... مگر برداشت ہی کرنا ہے تمہیں اے ”مگرمی“ کیا کریں مجبوری ہے۔
عظلیٰ شکور۔ اسلام آباد

اس ماہ کی معلومات

انسان بچ سکتا ہے!
تکبر سے سلام کے ذریعے۔
مصیبت سے صدقے کے ذریعے۔
بیماری سے دعا کے ذریعے۔
قرض سے شکر کے ذریعے۔
حرص سے صبر کے ذریعے۔
دوزخ سے عبادت کے ذریعے۔
جاہل سے خاموشی کے ذریعے۔
شیطان سے علم کے ذریعے۔
گناہ سے اللہ کے خوف کے ذریعے۔
روشنی فاطمہ فیصل۔ کراچی

اس ماہ کا افسانچہ

آگئی ہو جلائے کو..... تڑپانے کو..... بہت جلدی تھی کیا..... حد کرتی ہوا بھی چند ماہ ہی سکون کے گزرے تھے کہ تم پھر آج موجود ہوئیں۔ جان فنا ہونے لگتی ہے تمہارا خیال آتے ہی۔ ہائے مر گئے..... اب آہی گئی ہو تو جلد یوریا بستر باندھ لیتا، جینا دشوار نہ کر دیتا۔ عذاب ہو پوری قسم سے۔

مگر ایک بات ہے جب رات میں چھت پر تاروں کو گھور گھور کر سویا کرتا ہوں تو کچھ کچھ اچھی لگتی ہو مگر جیسے ہی لائٹ جاتی ہے تو تمہارا وجود زہر سے برا لگتا ہے۔

معاف کر دو خدا را! جان چھوڑ دو جینے دو نہ مارو مجھے اب سکون لینے دو۔

اس ماہ کی مصنوعی محبت

یہاں ہر چیز مصنوعی سی تھی، پر اب محبت اور دل بھی مصنوعی ہونے لگا ہے۔ بہت سے لوگ آپ کو اپنی پریشانی میں پکارتے ہیں مگر ان کی پکار میں آپ کے لیے محبت اور خلوص کی مصنوعی لہر ہوتی ہے۔ درحقیقت اس مصنوعی محبت کے پیچھے ان کا مفاد اور غرض چھپا ہوتا ہے، جوان کو آپ سے ہوتی ہے۔ ان کی محبت اور خلوص کے اظہار کرتی فراٹے بھرتی جھوٹی زبان پر ایمان لے آتے ہیں مگر حقیقت کھلنے پر دکھی نہ ہوں۔ آپ اس ہی طرح سے بے غرض ہو کر ان کے ساتھ پیش آئیں۔ کیونکہ باظرف لوگوں کا شیوہ کم ظفری نہیں ہوتی۔ وہ اپنے اصل سے کبھی نہیں پھرتے کیونکہ بروں کے ساتھ برا نہیں ہوا جاتا۔ ان کو اپنے اچھے رویے سے مارا جاتا ہے۔

فرح انیس۔ کراچی

اس ماہ کی اچھی بات

رشتے اور موسم دونوں ایک جیسے ہوتے ہیں۔ کبھی حد سے زیادہ اچھے اور کبھی برداشت سے باہر۔ فرق صرف اتنا ہے کہ موسم جسم کو تکلیف دیتا ہے اور رشتے روح کو۔

(حضرت علیؓ)

شازیہ گل۔ بھیرکھنڈ

☆.....



خودکشی کرنا

اللہ تبارک و تعالیٰ کا فرمان ہے: ”اپنے آپ کو قتل نہ کرو، یقین مانو اللہ تمہارے اور مہربان ہے۔ جو شخص ظلم و زیادتی کے ساتھ ایسا کرے گا اس کو ہم ضرور آگ میں جھونکیں گے۔ یہ اللہ کے لیے کوئی مشکل کام نہیں۔“ (النساء: 29-30)

یتیم کا مال کھانا

اللہ تبارک و تعالیٰ کا فرمان ہے: ”جو لوگ ظلم کے ساتھ یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ درحقیقت اپنے پیٹ آگ سے بھر رہے ہیں اور وہ عنقریب جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونکے جا میں گے۔“ (النساء: 1)

حضور اکرمؐ نے فرمایا

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا: ”ایک آدمی کسی دوسری بستی میں اپنے بھائی کی زیارت کے لیے گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے راستے میں ایک فرشتہ بٹھادیا جو اس کا انتظار کر رہا تھا جب وہ شخص اس کے پاس سے گزرا تو فرشتے نے پوچھا۔

”تم کہاں جا رہے ہو؟“

اس نے کہا۔ ”اس بستی میں میرا بھائی رہتا ہے اس کے پاس جا رہا ہوں۔“

فرشتے نے پوچھا۔ ”کیا اس کا تم پر کوئی احسان ہے جس کی وجہ سے تم یہ تکلیف اٹھا رہے

ہو اور اس کا بدلا اتارنے جا رہے ہو؟“

اس نے کہا۔ ”نہیں صرف اس لیے جا رہا ہوں کہ میں اس سے اللہ کے لیے محبت کرتا ہوں۔“ فرشتے نے کہا۔ ”میں تیری طرف اللہ کا فرشتہ ہوں (اور یہ بتانے کے لیے آیا ہوں کہ) اللہ تعالیٰ بھی تجھ سے محبت کرتا ہے جیسے تو اس سے صرف اللہ کے لیے محبت کرتا ہے۔“ (مسلم)

سیدہ نورین۔ کراچی

لحہ فکریہ

خوش رہو اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھو کہ ماضی را کھ کا ڈھیر ہے۔ اپنے پاؤں مضبوط رکھو کہ حال سمندر کی ریت کی طرح لحہ سرک رہا ہے۔ آنکھیں کھول کر دیکھو مستقبل تاریک خلا ہے۔

فرزانہ شوکت۔ کراچی

اہم معلومات

☆ قائد اعظم نے 24 مارچ 1948ء کو اردو کو پاکستان کی سرکاری زبان قرار دے دیا۔

☆ پاکستان کا سب سے بڑا شہر کراچی اور سب سے چھوٹا شہر جہلم ہے۔

☆ مینار پاکستان کا نقشہ مولا خان نے تیار کیا تھا۔

☆ پاکستان میں سب سے زیادہ بارش مری میں ہوتی ہے۔

☆ گنے کارس پاکستان کا قومی مشروب ہے۔

☆ سوات کو پاکستان کا سونے لینڈ کہا جاتا ہے۔

☆ درہ گول پڑیہ اسماعیل خان شہر آباد ہے۔
☆ پاکستان میں کونسل کی سب سے بڑی
کان کوئٹہ میں ہے۔
☆ پاکستان کی سب سے لمبی شاہراہ، شاہراہ
پاکستان ہے۔
☆ شاہراہ ریشم پاکستان کی سب سے اونچی
شاہراہ ہے۔

ایم جے قریشی - ڈی آئی خان

تنہائی.....!

محفل اور تنہائی انسان کے اپنے اندر ہوتی
ہے۔ کبھی کبھی دوستوں کے جھوم میں بہتہوں کے
بچ میں روشنیوں کے دیس میں بھی کوئی تنہا ہو سکتا
ہے اور کوئی دور دراز اپنے گاؤں میں تنہا بیٹھا
اپنے آنگن میں جامن کے پیڑ تلے بھی بیٹھا تنہا
نہیں ہوتا۔
کبھی لوگوں کے رویے اور کبھی قسمت تنہا
کر دیتی ہے۔ تنہائی کسی کے لیے ایک جان لیوا
عذاب ہے اور کسی کے لیے راحت جاں کہ
سب سے چپ کر گوشہ نشین ہونے میں ایک
پناہ کا احساس ہوتا ہے۔ تنہائی کی سب سے
زیادہ اذیت ناک صورت تب ہوتی ہے جب
تنہا کر دینے والے پوچھتے ہیں کہ تم تنہا کیوں
ہو؟ آپ اکیلے ہو جائیں مگر کبھی تنہا مت
ہوئے گا اور اگر آپ کے اختیار میں ہو تو کسی
اور کو تو بھول کر بھی تنہا مت بھیجیے گا، ورنہ کہنا
پڑے گا۔

لگا جاگلے اسے تنہائی

مجھ کو محبت راس نہ آئی

ایس امتیاز احمد - کراچی

مجھ پر رحم کرو!

میں ہوں پاکستان مجھ پر رحم کرو۔
ذرا سوچو!

✎ چائنا کی آبادی ایک ارب 35 کروڑ۔
14 وزیر۔

✎ انڈیا آبادی ایک ارب 27 کروڑ۔ 32 وزیر۔
✎ امریکہ (یو ایس اے) 32 کروڑ۔ 14 وزیر۔
✎ برطانیہ (یو کے) 13 کروڑ۔ 12 وزیر۔
✎ پاکستان 19 کروڑ۔ 96 وزیر، مشیر اس
کے علاوہ ہیں۔

ایک وزیر کے سال کا خرچہ 16 کروڑ۔
سب وزیروں کا سالانہ خرچہ (16x96) 15
ارب 36 کروڑ۔ ہر وزیر کو ماہوار 5000 پونٹ
بجلی مفت، 45 وی آئی پی ہوائی ٹکٹ مفت۔
ماہانہ ایک لاکھ روپے کا موبائل بیلنس مفت۔
جب کہ غریب عوام کے لیے نہ بجلی، نہ پانی، نہ
گیس۔

آپ کا اپنا پیارا پاکستان۔

مہرین کنول - ڈی آئی خان

حقیقت

☆ انسان کی آنکھیں ہمیشہ وہی لوگ کھولتے
ہیں جن پر وہ آنکھیں بند کر کے بھر وسا کرتا ہے۔
☆ اعتماد ایک چھوٹا سا لفظ ہے۔ جسے پڑھنے
میں سیکنڈ، سوچنے میں منٹ، سمجھنے میں دن لیکن
ثابت کرنے میں ساری زندگی گزر جاتی ہے۔

☆ اصلاح نفس کے چار اصول ہیں۔ (i)

اپنے نفس کے ساتھ شرط لگانا کہ گناہ نہیں کروں

گا۔ (ii) مراقبہ: کہ آیا گناہ تو نہیں کیا۔ (iii)

محاسبہ: اپنا حساب کرے کہ کتنے گناہ کیے اور کتنی

نیکیاں کیں۔ (iv) مواخذہ: کہ نفس نے دن میں جو نافرمانیاں کیں اس کو ان کی سزا دینا۔ وہ سزایہ ہے کہ اس پر عبادت کا بوجھ ڈالے۔
آنسہ احسان اللہ۔ گوجرانوالہ

انتظار

انتظار کرنا
کہ زندگی کے سب دکھوں کو سہہ کر
سمیٹ کر
گر کر
پھر سنبھل کر
سب خوابوں کو بے کفن دفن کر
مجھے آنا ہے
تمہارے ہی پاس آنا ہے

اور
مٹی میں مل جانا ہے
کہ
دنیا بہت ستاتی ہے
جلانی ہے رلائی ہے

عظمیٰ احمد۔ اسلام آباد

ہنسنا منع ہے

دولہا اپنی دلہن سے۔ ”میں شادی سے پہلے
20 لڑکیوں کے ساتھ چکر چلا چکا ہوں۔“
دلہن۔ ”مجھے پتا تھا کہ جب ہمارے ستارے
ملتے ہیں تو کروت بھی ملتے ہوں گے۔“

☆
بیوی شوہر سے۔ ”جب تمہیں مجھ پر غصہ آتا
ہے تو تم اپنا غصہ کہاں نکالتے ہو۔“
ڈرپوک شوہر۔ ”ٹوائٹ صاف کر کے۔“
بیوی ہنستے ہوئے۔ ”کیسے صاف کرتے ہو۔“
شوہر۔ ”تمہارے ٹوتھ برش سے۔“

☆
بیوی نے اپنے شوہر سے کہا۔ ”تم تو کہتے تھے
کہ شادی کے بعد تجھی مجھ سے پیار کرتے رہو گے۔“
”مجھے کیا پتا تھا کہ تمہاری شادی میرے
ساتھ ہی ہو جائے گی۔“ شوہر نے سادگی سے
جواب دیا۔

☆
کسی نے شادی شدہ آدمی سے پوچھا۔
”آپ شادی سے پہلے کیا کرتے تھے؟“
اس شخص کی آنکھوں میں آنسو آ گئے وہ بولا۔
”جو میرا دل کرتا تھا۔“

نظر علی برمانی۔ دادو

ابو!

ابو آپ کی بہت یاد آتی ہے
ہر محفل میں اب تنہائی ہے
ابو مجھے آپ کے بغیر بہت ڈر لگتا ہے
ابو مجھے دیوار پر آپ کا سایہ نظر آتا ہے
پر آپ نظر نہیں آتے

ابو میرے پاس آؤ نا
جب میں آنکھیں بند کرتا ہوں تو
آپ کا چہرہ نظر آتا ہے
جب آنکھیں کھولتا ہوں تو
آپ غائب ہو جاتے ہو
ابو آپ ایسا کیوں کرتے ہو؟
ابو اب میں آپ کی تصویر کے ساتھ
باتیں کرتا ہوں
ابو میں اب بہت ڈرتا ہوں

شاعر: ثناء اللہ ساگی

انتخاب: ظہیر الدین۔ کراچی

تم کیا جانو کہ زندگی کیا ہے؟

زندگی بھی ایک دائرے کی مانند ہے جس کے ہر صفحے پر دن، تاریخ، ماہ و سال زندگی چسپاں ہیں۔ صفحہ ایک ہے لے کر آخر تک زندگی اس پر لے شمار تاریخیں لکھتی ہے ہر تاریخ کی نوعیت زندگی کے مزاج پر منحصر ہے۔ جب یہ خوش ہوتی ہے تو دھنک کے ساتوں رنگ ڈائری پر سجانی ہے اور جب ناخوش ہوتی ہے تو پانی سیاہ رنگ سے صفحوں کو کالا کر دیتی ہے۔ ہم اگر شروع سے آخر تک اسے پڑھتے جائیں تو پتہ چلے گا کہ تاریخ کے ساتھ ساتھ تحریروں میں چٹنگی سوچ اور تجربہ دکھائی دیتا ہے۔ لیکن افسوس کہ جوں ہی ہم ان تجربوں سے فیض یاب ہونے لگتے ہیں۔ ڈائری کے صفحات ختم ہو جاتے ہیں۔

ثناء کنول اللہ دتہ۔ لودھراں

محبت

محبت اپنے عروج کے بعد زوال ضرور دیکھتی ہے۔ جس طرح خاموشی سے کوئی دل میں گھر کر جاتا ہے۔ اسی طرح بہت خاموشی سے کوئی اپنے سے پرانا بھی بن جاتا ہے۔ چند واقعات کے لیے محض کچھ لمحے ہی درکار ہوتے ہیں۔ کسی کے دل سے اترنے میں اور پھر دل کی زمین بھر ہو جاتی ہے۔ وہاں محبت پھر بھی پروان نہیں چڑھتی بس یادوں کی کھر در زین رہ جاتی ہے۔

دانیہ آفرین۔ کراچی

مرد اور عورت

مرد فطرتاً ایک بچہ ہے۔ جب کسی کی چاہت میں مبتلا ہوتا ہے تو پھر اسے پانے کے لیے اس کی کیفیت ایک ایسے ضدی بچے کی سی ہو جاتی ہے جسے

اپنا من پسند کھلونا ہر حال میں چاہیے ہوتا ہے اور اس کے حصول کے لیے وہ خود کو سربازِ نینام تک کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔

جب کہ ہمارے معاشرے کی عورت اکثر ایک ایسی خاموش جھیل کی مانند ہوتی ہے جس میں پتھر پھینکنے سے وقتی تلاطم ضرور پیدا ہوتا ہے مگر پھر شانت ہو جاتی ہے وہ جس سے محبت کرتی ہے اسے پانا بھی چاہتی ہے مگر جب کوئی راہ دکھائی نہ دے تو حالات کے آگے تھیار بھی ڈال دیتی ہے۔ دعاؤں کی چھاؤں میں وہ اپنی چاہت کو نم آنکھوں سے اپنے ہی ہاتھوں کی اور کو سوچ دیتی ہے اور ادا تک نہیں کرتی۔

زارا قمر۔ کراچی

ذرا سوچیے

☆ اندھیرا آپ کو اندھیرے سے باہر نہیں نکال سکتا صرف روشنی ہی ایسا کر سکتی ہے۔ نفرت آپ کو نفرت سے باہر نہیں نکال سکتی صرف محبت ہی آپ کو نفرت سے باہر نکال سکتی ہے۔

☆ جب تمہاری مخالفت حد سے بڑھنے لگے تو سمجھ لو اللہ تمہیں کوئی مقام دے دے والا ہے۔

☆ عزت کے موتی پر اگر ایک بار میل آجائے تو سینکڑوں دریا بھی اسے دھو نہیں سکتے۔

☆ خوشامدیوں سے بچو وہ تمہیں کسی بھی جگہ ذلیل کر دیا سکتے ہیں۔ (حکیم اقلیوس)

☆ اگر تم سخت محنت کے عادی ہو تو مفلسی تمہارے نزدیک نہیں آئے گی۔ (زرتشت)

☆ اپنے سے اچھے کو تلاش کر، اپنے جیسے کے ساتھ تو عمر ضائع کر دے گا۔ (حضرت شیخ سعدی)

صدف قمر۔ کراچی



فردا پھر کتنا

اک اور لیے جائے

ہوا

خوابوں کی جھانجرو

پنکھ لگائے

اُف!

تیری سوچ، تیرا خیال

زردہ و صمان

روشنی

یہ کیوں سمجھ لیتے ہیں ہم

کہ زندگی

صرف اندھیروں کا خدشوں کا

انجانے خوف

اور ان دیکھی مصیبتوں کا نام ہے

یہ کیوں سمجھ لیتے ہیں ہم

کہ خوشیاں

صرف دور دیں کے باسیوں کی

خوف زدہ لوگوں کی

انسانی ہاتھوں سے

تخلیق کردہ جنتوں کی

میراث ہیں

خود کو سمجھنے کی ضرورت ہے

رہنمائی کی اک ایسی سچائی کی

ضرورت ہے کہ جس کی روشنی میں

برکھارت

ایسے موسم میں ہی تو جینے کا مزا آتا ہے

مشکل ہے تو بس اتنی کوئی یاد بہت آتا ہے

غنیہ دھل کر جو مسکراتا ہے

دل کا ہر زخم ہر اہو چاٹتا ہے

سلگ اٹھتی ہیں پرانی یادیں

پھر تنہا کس سے رہا جاتا ہے

برقی بارش اچھی تو بہت لگتی ہے

پر خود کو بہلانے میں دیر بہت لگتی ہے

فریدہ عالم فاضل

ہائیکو

یہ محبت بھی عجیب ہے

آنکھوں سے دور سہی

دل کے بہت قریب ہے

انگوٹھی میں نگینہ ہے

تم سے پچھڑنا محال سہی

پھر بھی مجھے جینا ہے

شہلاگل سحر صالح

نظم

کر رہی ہوں چوری چوری

دل کی چوری!

چھو رہی ہے دل کی خوشبو

میری ہر سانس

ہم اپنی اپنی خواہشوں کو
 بہت پیچھے چھوڑ کر
 محبتوں کے بندھنوں میں دلوں کو باندھ کر
 متحد ہو جائیں اور
 سب سے بڑی ان دیکھی مگر
 پہچان ہوتی اس بستی کے آگے
 اپنے سر کو جھکا دیں

فرزانہ شوکت

نظم

یہ جو چائے ہے ناں
 ہو بہو مہارے ٹھیس ہے
 پہلے کرتی ہے عادی اپنا
 پھر جینا محال کرتی ہے
 گراس کو چھوڑنا چاہو
 تو ہنس کر سوال کرتی ہے
 کیا مجھ کو چھوڑ سکتی ہو؟
 در دسر کو کیوں تم
 اپنے نام کرتی ہو
 تسلیم کیوں نہیں کرتی؟
 میں ہو بہو اس جیسی ہوں
 میں اب اکثر سوچتی ہوں یہ
 مجھے نفرت تھی چائے سے
 مگر نہ جانے کیوں
 تمہاری پسند کو میں
 اپنی عادت بنا بیٹھی
 جتنی اتنی ہے بھری مجھ میں
 جتنی کڑوی ہے یہ چائے
 زہر لگتی تھی یہ مجھ کو
 مگر اب اس کے بنا اک پل
 میں رہ نہیں سکتی

سب ہی حیران ہیں اب تک
 یہ انہونی ہو گئی کیسے
 جسے نفرت تھی چائے سے
 اب محبت ہو گئی کیسے
 میں سب کو کیسے سمجھاؤں
 جس کو دل سے چاہا جائے
 اس کی ہر عادت سے
 محبت ہو ہی جاتی ہے
 میں اب چائے پیتی ہوں
 یوں روگ بھر کا سہتی ہوں

سیدہ عروج فاطمہ

غزل

یہ تو بتا میرے دل کو سکون کب ہو گا
 دیوانے ہیں جو دن رات پھرتے ہیں ہم
 شام کے گھرے سائے اب تو ڈھلنے لگے ہیں
 لوٹ کے اب شہر وفا میں آتے ہیں ہم
 تپش تیرے بچر میں سورج سے بھی زیادہ
 ٹوٹے ہوئے دل سے اکثر فریاد کرتے ہیں ہم
 ہر پل زمانہ نگاہیں بدلتا ہی رہا ہے
 قدم قدم زندگی میں یوں دھوکا کھاتے ہیں ہم
 دل سمندر دیکھا نہیں کسی کا ہم نے جاوید
 شہر ظلمت میں جی کو لگاتے ہیں ہم
 محمد اسلم جاوید

درد کا صحرا

اک درد کا صحرا ہے
 اور اس کے اس پار
 منزل ہے
 حاصل یا لا حاصل کا تعین ہے
 شاید زندگی کی نوید ہے

پروردنا آشنا ٹھہرا ہے
 منزل کی اور جانے والا
 ہر رستہ بے ایمان ٹھہرا ہے
 ٹھوکروں، رسوائیوں کی دہلیز ہے
 پرول کم بخت ایسی چیز ہے
 جو بے جا ضد کرنی ہے
 ہر چٹکتی شے کو سونا سمجھتی ہے
 محبت کے دو بول بولنے والے کو
 اپنا جیون تک دان دیتی ہے
 جیت کی بجائے مات دیتی ہے
 ایسا کیوں ہوتا ہے؟
 ہر دفعہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟
 یہ ضدی دل صنف نازک
 کو ہی چھتا ہے
 اپنی ہر ہار کا تمغہ اس کے گلے میں
 سماتا ہے
 روگ ہی روگ اُس کی
 نس نس میں ابھارتا ہے
 ایسا کیوں ہوتا ہے؟
 ہر دفعہ صنف نازک ہی
 اس نام نہاد ”محبت“ شے میں آتی ہے
 اپنی عزت مٹی میں ملائی ہے
 یہ محبت مرد کی طرف داری کیوں کرتی ہے
 ہر دفعہ محبت کھیل میں اسے ہی
 جیناتی ہے
 اور صنف نازک کو
 دنیا کی نظروں میں گراتی ہے
 ایسے سوال صرف من میں ہی
 اُودھم مچاتے ہیں
 نوک زبان کہنے سے

بچکپاتے ہیں
 صرف خیالوں میں ہی
 آتے ہیں
 اور زرد موسم ہمارے
 نام کر جاتے ہیں

آسیہ مظہر چویدری

نظم

کیا تمہیں یاد ہے
 وہ بھگسا دون
 جب چلتے چلتے تم نے
 ہاتھ میرا چھوڑا تھا
 ہمارے سب دعوؤں کو
 پل بھر میں توڑا تھا
 کیا تمہیں یاد ہیں
 وہ گلابی آنکھیں
 بہکے بہکے لمحوں میں
 جو طواف تمہارا کرتی تھیں
 ان میں سب خوابوں کو
 کیسے بے دردی سے تم نے نوچا تھا
 کیا تمہیں یاد ہے
 وہ چوڑیوں کی کھٹک
 جو تیرے لمس سے مہکا کرتی تھیں
 تیرے ہجر کے بے حس لمحوں میں
 اپنی ہنسی وہ بھولی ہیں
 کیا تمہیں یاد ہیں
 وہ چاندنی راتیں
 نام لکھے سب پیاموں کو
 جو مسکراتے ہوئے نکلتی تھیں
 سسکتے لبوں کو دیکھ کر
 اب آنکھیں وہ چراتی ہیں

اس کو سنوار سکتے نہیں آٹھ پہر میں
مضبوط کشتیوں کو بھی الٹا کر رکھ دیا
یہ زور کیسے آگیا دریا کی لہر میں
اچھا ہے اب بھی کھینچ لو ظلم و ستم سے ہاتھ
ذات خدائے پاک نہ آجائے قہر میں
سب دیکھتے تھے کوئی بھی پہچانتا نہ تھا
جو لاش تیری ہوئی دیکھی تھی نہر میں
دنیا کے ساتھ عاقبت کو ہے سنوارنا
روتا ہے آٹھ کے رات کے جو پچھلے پہر میں
مقدار خاص کھا کے بھی زندہ رہا قمر
اتنی ملاوٹ ہو گئی ہے اب کے زہر میں
ریاض حسین قمر

نظم

مجھے لگا تھا بہت ہی آساں ساعل ہے
محبت کے سمندر کی لہروں کو
موجیں کرتا عمر اکٹھیلیاں کرتے دیکھنا
سر ساحل محبت کے سمندر بیٹھنا
چاہتوں کی لہروں کو ابھرتے دیکھنا
موجوں کا ابھرتا، اچھل کر ساحل کو ٹکراتا
بہت ہی دلربا، دلفریب سا ہے منظر
قدم پڑے جو اس سمندر میں تو جانا
بہت ہی مشکل اور ٹھن سا یہ سفر ہے
نہیں ہے آساں

ان شوریدہ لہروں سے بیر رکھنا
ان کے سنگ بھریں تو اور بھی ٹکھن ہے منزل
ان کی من مانی کہ چاہے سنگ اپنے ڈبو میں
یا پھر مستی ہی مستی میں نیست و نابود کر دیں
مریم ماہ منیر

☆.....

کیا تمہیں یاد نے
وہ بے بس خاموشی
جواک قیامت کا پیش خیمہ تھی
پھر پل پل اس قیامت کو
وجود میرے نے جھیلایا ہے
کیا تمہیں یاد ہے
وہ اختتام!

اپنے قدموں کو تم نے
واپسی کے لیے موڑا تھا
مجبوریوں کی آڑ میں تم نے
جب دل میرا توڑا تھا
کیا تمہیں یاد ہے؟

سحر مبین

نظم

ہم نے اسے محبت میں چاہنے کی انتہا کر دی
اپنی ہر خوشی اُس پر فدا کر دی
پچھ اس انداز سے اُس نے لوٹا مجھ کو
میری ہی زندگی میرے لیے سزا کر دی
بیٹھ کر نمازیں مانگی تھی جس کی قربت
خدائے اُس ہی کی جدائی عطا کر دی
رات بھر روتے ہیں اب اُسے یاد کر کے
اب سوچتے ہیں کہ محبت کی تھی
یا کوئی خطا کر دی
تنگ آکر جو خدا سے مانگی موت نازش
تو اُس نے ہماری لمبی عمر کی دعا کر دی
نبیلہ نازش راؤ

غزل

کچھ حادثات ہوتے ہیں ایسے بھی دہر میں
لگتے ہیں لوگ اجنبی سے اپنے شہر میں
جس کو بگاڑنے میں لگائے ہیں ماہ وسال

سفرِ حبیب

سانرہ مشال — کراچی

تمام ریڈرز اینڈ رائٹرز کو میری جانب سے سلام۔ کیسے ہیں آپ سب امید ہے ٹھیک ٹھاک اینڈنٹ فاٹ ہوں گے۔ عید کیسی گزری آپ لوگوں کی شیر ضرور کیجیے گا۔ ردا کے توسط سے۔ اب بات ہو جائے جولائی کے ردا کی تو اس کے لیے بے حد معذرت کیوں کہ یہ سندیسہ میں عید کے تیسرے دن دھواں دھار بارش میں لکھ رہی ہوں اور اب تک جولائی کا ردا آیا نہیں۔ اب آپ لوگ سوچ رہے ہوں گے کہ بھلا اتنی محنت کی کیا ضرورت تھی۔ تو آپ کے ذہن میں آئی سوچ کا جواب یہ ہے کہ پچھلے آٹھ ماہ سے (جب میری پہلی تحریر شائع ہوئی تھی) میں سندیسہ کی محفل میں شرکت کا سوچ رہی تھی مگر عمل درآمد کرنے میں ازلی سستی آڑے آرہی تھی۔ سو آج تہیہ کر لیا کہ لکھ کر ہی دم لوں گی۔ اب بات ہو جائے قسط وار ناول کی تو قردوش شہک کیا بات ہے آپ کی الفاظ کا عمدہ چناؤ تحریر کی روانی میں بندہ بہتا ہی چلا جاتا ہے۔ ریجانہ آفتاب بھی بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ رضوانہ بھی سسرال میں پہلی عید بہت بہت مبارک ہو۔ شازیہ جی آپ کا ناول بھی بہت اچھا ہے لیکن آپ سے ایک بات کہنی تھی۔ امید ہے آپ مائنڈ چھپیں کریں گی۔ آپ ایک مہنگی ہوئی لکھاری ہیں آپ کی

تخریروں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کسی بھی اصلاحی و معاشرتی موضوع پر لکھنے کی اہلیت رکھتی ہیں پھر آپ ایک جیسے موضوع پر ہی کیوں لکھتی ہیں۔ یہ بات میں ایک بہن اور مخلص فین کے حوالے سے کہہ رہی ہوں آپ پلیز ناراض مت ہوئیے گا۔ لیکن اس طرح آپ کی کہانیوں میں یکسانیت پائی جاتی ہے تو پلیز میرے لیے (کیوں کہ میں آپ کی فین ہوں) کسی اور موضوع پر لکھیں اگر میری باتوں سے آپ ہرٹ ہوئی ہوں تو میں بے حد معذرت خواہ ہوں اور صالحہ آپ کی آپ کا تو کیا ہی کہنا آپ کے ”تم میرے ہو کہ رہو“ کے طفیل ہی تو ردا سے میرا رشتہ استوار ہوا ہے۔ افشاں علی اگر آپ (میں بھولی میرا آشیاں) کی رائٹر ہیں تو ضرور بتائیے گا کیونکہ وہ تحریر پڑھ کر یوں لگا کسی نے میرے خیالات کو زبان دے دی ہو۔ آخر میں ان سب بہنوں کا بے حد شکریہ جن سب نے مجھ ناچیز کی تحریروں کو پڑھا اور ٹائم نکال کر اپنی آراء سے بھی نوازا۔ اب چلتے قلم کو بریک لگا لوں آئندہ بھی اپنی قیمتی آراء سے نوازتے رہیں میں آپ کے فیڈز بیک کی منتظر ہوں گی لیکن تعریف کے ساتھ تنقید برائے اصلاح بھی ہونی چاہیے۔ اب خدا حافظ اگر زندگی نے وفا کی تو پھر انٹری ماروں گی، فی امان اللہ۔

شہلا گل ————— کوھاٹ

ڈیئر صالحہ! اپنا السلام علیکم! خیریت کی طالبہ خیریت سے ہے۔ آپ کی سالگرہ پر دل کی گہرائیوں سے دعائیں اور نیک تمنا میں رب العزت آپ کو خوشیوں اور مسرتوں سے بھر پور زندگی سے نوازے اور لمحے، گھڑیاں اور پل ہر دکھ ہر تکلیف ہر آنسو اور ہر محرومی سے مبرا ہوں۔ (آمین ثمہ آمین)۔ جس طرح آپ نو آموز رائٹرز کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں اور خوشیوں سے نوازی ہیں۔ اس طرح ہر مشکل گھڑی میں اللہ تعالیٰ آپ کا کراسز ہوا اور آپ کی زندگی خوشیوں کے گلابوں سے لہلہا بھر دیں۔ آپ سے رشتہ نہیں جانتی کیا ہے مگر میں سوچتی ہوں بارش سے میرا کیا ناطہ جو میرا دل خوشی سے بھر دیتی ہے۔ ٹھنڈی ہوا چہرے کو چھو کے تازگی بخشتی ہے۔ یادیں لمحوں میں ہنسائی اور رلائی ہیں۔ اسی طرح آپ سے دیکھے بنا، بولے بنا ایک اندرونی ناطہ ہے۔ بہت گہرا اور بہت اپنائیت بھرا۔ بہت مبارک ہے۔ وہ دن جس دن آپ پیدا ہوئیں۔ میرا رب آپ کو درازی عمر، صحت، خوشیاں، سکون اور اچھے اور وفادار لوگوں کی محبت عطا فرمائیں اور سدا سلامت رہیں اور مسکرائیں، آمین ثمہ آمین۔

سیدہ عروج فاطمہ ————— ملتان

السلام علیکم! صالحہ! آپ کی ردا ڈائجسٹ کی پوری ٹیم امید ہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے ٹھیک ہوگی۔ اس بار تو میں نے ڈائجسٹ ملنے سے پہلے ہی قلم ہاتھ میں لے لیا ہے۔ کیا کریں جی انتظار ہی نہیں ہوتا ہے۔ خط کے ذریعے سے یہ نصف ملاقات مجھے سرشار کر دیتی ہے۔ کراچی میں اگر میرا گھر ہوتا تو صبح آفس میں آکر اپنی حاضری

لگواتی۔ میں تو شاید ادارے کی ورکر بن جاتی۔ خیر کوئی بات نہیں ہم چاہے دور ہیں بہت لیکن اتنے مجبور تو نہیں ناں کہ قلم کے ذریعے رابطہ بحال نہ رکھ سکیں۔ اللہ پاک آپ سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ ادارہ ردا ڈائجسٹ پر اللہ کی رحمت کی بارش ہمیشہ برسی رہے۔ (آمین)۔

سحر مبین ————— فیصل آباد

آداب! امید ہے سب خیریت سے ہوں گے اور ردا کی سالگرہ کا کیک اکیلے اکیلے کھایا جا رہا ہوگا۔ جولائی کا ردا ہمیشہ کی طرح زبردست رہا۔ کیوٹ سی ایقان کی تحریر ”ستارے“ اسی کی طرح کیوٹ تھی۔ جہانہ آفتاب کی ”دو دلوں کی عید“ اچھی تحریر تھی۔ ”عشق کی داستان جدا ہے میری“ ریحانہ آفتاب گڈ ورک ڈیئر! سب اس گل کی تحریر بھی اچھی تھی۔ تمام سلسلہ وار ناول اور مستقل سلسلے اچھے تھے۔ مریم شیراز کا مکمل ناول بھی اچھا تھا۔ مصباح میکان کی تحریر ”برف ہے“ ہمیشہ کی طرح زبردست تھی۔ دل کے کھلے گلاب، کرچیاں غرض یہ کہ سب رائٹرز نے اچھا لکھا۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ ہو۔ اللہ کرے سب خوش باش رہیں۔

گیتی آراء ————— کراچی

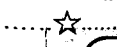
پیاری آپ! السلام علیکم! امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ سب سے پہلے تو آپ کو ہماری طرف سے عید کی آپ کی ردا کی اور یوم آزادی کی دلی مبارکباد۔ اللہ آپ کو ایسی ہزاروں نہیں بلکہ اربوں خوشیاں دیکھنا نصیب کرے، آمین۔ ایک ساتھ یہ تینوں خوشیاں ہم یونہی مناتے رہیں ہمیشہ، آمین۔ اور اب بات ہو جائے ماہ جولائی کے ردا کی یعنی عید نمبر 2 کی۔ سب سے

رہو۔ بچن کے سبھی پکوان عید کے حوالے سے
 لا جواب تھے، خاص کر کرپسی چکن، کباب
 بریانی، رنگین سویوں کے ساتھ شاہی ٹکڑے،
 سنگھار میں ہلدی اور لیموں سے جلد کی حفاظت
 سے لے کر جھانیاں ختم کرنے کا گھریلو نسخہ بے حد
 مفید اور کارآمد نہیں تھیں۔ ابھی باقی روزا پر مطالعہ
 ہے۔ وقت کی کمی سندیہ لیٹ ہونے کے ڈر
 سے جتنا مطالعہ کیا اس پر تبصرہ حاضر خدمت
 ہے۔ افسانوں میں ابھی تک جو نظر سے گزرا ان
 میں آسیہ مظہر اور خاص کر سباس گل کا افسانہ اچھی
 تحریر تھی۔ امید ہے کہ باقی تحریریں بھی زبردست
 ہوں گی اور ناولز ناولٹ زبردست چل ہی رہے
 ہیں۔ زور قلم اور زیادہ اب اجازت۔

انیتا اختر۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ

سب سے پہلے صالحہ آبی اور نورین آبی کا
 شکریہ جنہوں نے مجھے ردا میں جگہ دی اس کے بعد
 تمام لکھنے والی برنسز کو السلام علیکم کچھ مجھ میں نہیں
 آ رہا کیا لکھوں لکھنا میرا شوق ہی نہیں میرا خواب
 تھا لیکن ہمیشہ میرا ڈر اڑے آ جاتا پھر میری فیملی
 نے مجھے بہت سپورٹ کیا تو میں نے اپنی پہلی
 اسٹوری لکھی۔ میں انہیں کبھی ٹھینکس کہنا چاہتی
 ہوں اس کے بعد حفصہ کنول نے میری بہت
 ہیلپ کی۔ ٹھینکس حفصہ میں آپ کو جانتی تو نہیں
 لیکن عائشہ سے آپ کا بہت سنا ہے۔ میری دعا
 ہے ردا دن دینی رات چوگی ترقی کرے اور ہمیشہ
 پیاری پیاری سی رائٹر اس میں رہتی رہیں۔ ثناء
 کنول میں نے آپ کو دیکھا تو نہیں لیکن آپ مجھے
 بہت کیوٹ لگتی ہو، اللہ سب کو خوش رکھے اور
 دعاؤں میں یاد رکھے گا۔

پہلے تو سرورق کی نازک اندام ماڈل اپنے ہاتھ کا
 ٹیکہ سنبھالتی اچھی لگی۔ آگے چل کر روز بیوٹی پارلر
 کے اشتہار نے ہماری توجہ اپنی طرف متوجہ
 کر دی۔ اوکسیجن گولڈ فیشل کی آفر نے ہمیں اپنی
 طرف متوجہ کر دیا۔ وجہ کزن کی شادی اور اوپر
 رنگ گورا اور اسکن ٹائٹ کرنے کی آفر کون کا فر
 ہے جو متوجہ نہ ہوگا۔ بہر حال آگے بڑھے تو گوشہ
 آگہی میں آبی کے سحر انگیز اور نڈر بے باک کالم
 نے دل خوش کر دیا۔ کیا ہماری بے حس حکومت کو
 آئینہ دکھایا ہے واہ۔ ردا نے جنت میں کلام پاک
 کی تلاوت کی اہمیت جان کر دل خوش ہو گیا اتنی
 سی تلاوت کا اتنا اجر! ردا کی ڈائری کے سبھی
 انتخاب اچھے تھے۔ خاص کر شہلا گل، شیر بانو کا
 انتخاب، اشعار کے انتخاب میں سعدیہ بٹ اور
 مسز نگہت غفار نمبر لے گئیں۔ اس ماہ میں، سبھی
 انتخاب اور کالم اپنی اپنی جگہ لا جواب اور بے
 مثال تھے خاص کر اس ماہ کا شاعر، اس ماہ کا
 یقین، اس ماہ کی شوخ سطریں، اس ماہ کے اقوال
 زریں۔ سبھی انتخاب لا جواب رہے اور
 ہمیشہ کی طرح پھر یہی کہوں گی کہ خوشبو بھی ہمیشہ
 کی طرح پورے ردا کی جان اور بے مثال ہوتا
 ہے۔ خاص کر قرآن کی باتیں، دوستوں کے نام
 پیغام۔ شازیہ مصطفیٰ کی والدہ کے انتقال کا جان کر
 بہت دکھ ہوا۔ ہماری دلی دعا ہے کہ اللہ مرحومہ کو
 جنت الفردوس میں جگہ دے اور اہل خانہ کو صبر
 جمیل عطا کرے، آمین۔ سیدہ عروج کی صحت
 یابی کے لیے ہم بھی دعا گو ہیں۔ اللہ انہیں صحت
 طبعی عطا فرمائے، آمین۔ عانیہ نیازی آپکا بہت
 بہت شکریہ اور پیار اور دیگر ساری دعائیں کہ آپ
 نے ہمیں یاد رکھا۔ صدا خوش رہو، ہنسی مسکرائی



فروش گاہِ نبوی

ردا کی صوفشاؤں کے نام

ڈیزسٹ صالحہ آبی، نورین جی ردا کے تمام اسٹاف، رائٹرز اور ردا کے پڑھنے والوں کو دل کی گہرائیوں سے سلام۔ صالحہ آبی کی انتھک محنت کو نہ سہانا زیادتی ہوگی۔ مردوں کے معاشرے میں سالوں سے ایک ادبی پرچے کو تنہا لے کر چلنا قابل تحسین ہے، خصوصاً میں ان کی اس کوالٹی پر انہیں بے حد سراہتی ہوں۔ اللہ مزید کامیاں عطا کرے، آمین۔ سندیسے کے ذریعے ہر ماہ ردا کے مخلص قاری سے بھی رابطہ رہتا ہے۔ میں بہت ذوق و شوق سے آپ سب کی آراء بڑھتی ہوں۔ ہر ماہ پیغام نہیں لکھ پائی لیکن پوری کوشش ہوتی ہے کہ آپ سب کو محبت بھرا جواب دے سکوں۔ یوں تو ردا کا ہر قاری قابل محترم ہے لیکن افشاں علی، لکیتی آراء، سفینہ خورشید، رابعہ افضل خان، عروج فاطمہ، فرح ناز محمد رفیق اور وہ تمام نام جو میں لکھ نہیں سکی آپ سب کا بے حد شکریہ۔ فرح ناز! جی ڈیز! ازون مرضی اور مہرین عثمان میرے لکھے ہوئے ہی کردار ہیں جو آج بھی آپ کو یاد ہیں۔ بہت شکریہ۔ بہت محبت کے ساتھ ادعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

ریحانہ آفتاب۔ کراچی

ردا ڈائجسٹ کے نام

زندگی کے یوں گزرتے دنوں میں

مصرف سے ہو گئے ہیں ہم
شاید اب بڑے ہو گئے ہم
کچھ دوستوں نے یاد بھی کیا مگر
وقت پر حاضر نہ ہو سکے ہم
شکریہ ادا کرتے ہیں مصباح مسکان رؤف
اور پیاری چچھالی ریمیا آبی کا
کرنوں کی روشن صالحہ پیا جی
اور امیدوں کی طرح خوب صورت
نورین ڈولی جی
ردا کے تمام نیو رائٹرز کو بہت سہاوتے ہیں ہم
پرانی رائٹرز کو یاد کرتے ہیں ہم
جگمگ کرتے رہو صدا
ردا تم رائٹرز سے تجھے رہو صدا!
روحوں کو جگا دے جو
احساس کو جو مہکا دے
میرے ردا
اے پیارے ردا
یونہی ہر سو بڑھتے رہو
کامیابی کی سیڑھی چڑھتے رہو
آئیں گے ملنے سے پھر ہم
کہ پھر ڈھیروں دعاؤں لائیں گے ہم
زارا صدف قمر۔ کراچی

کبھی پیپر پھاڑ دیتی ہے مگر دیکھیں میں پھر بھی ردا میں شرکت کرتی رہتی ہوں۔ یہ ردا سے محبت ہی تو ہے جو مجھے اس سے جڑے رہنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ میری تینوں سسٹرز بے حد عمدہ لکھ رہی ہیں۔ میری طرف سے ریحانہ آفتاب، جہانہ آفتاب اور رضوانہ آفتاب کو اچھا لکھنے پر بے حد مبارک باد۔ ہمارا ردا بے حد اچھا ہے۔ اللہ ہم تمام لکھنے والوں کو یونہی کامیاب کرتا رہے۔ آخر میں صالحہ آپلی اور نورین آپلی کو میرا بہت سارا پیار۔ آپ دونوں تو ردا کی جان ہیں۔

افسانہ آفتاب کاوش۔ کراچی

ریمانور رضوان کے نام

السلام علیکم قارئین! امید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ ردا ڈائجسٹ سے منسلک تمام قارئین ریمانور رضوان کو تو اچھے سے جانتے ہیں اس لیے تفصیلی تعارف کی ضرورت نہیں ہے۔ رائٹر کے تعارف کی ویسے بھی خاص ضرورت نہیں ہوتی ہے کیونکہ ادیب کی شناخت کے لیے اس کے الفاظ ہی کافی ہوتے ہیں۔ میری رائٹر دوست ریماکہ جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ مجھے ریمانے ہی کہا تھا کہ میں ردا ڈائجسٹ کے لیے لکھوں۔ میں نے کہا تھا میرے لیے تو ردا ڈائجسٹ نیا ہے۔ تب ریمانے مجھے کہا تھا کہ ردا ڈائجسٹ نیو رائٹرز کی بہت حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ وہ دن تھا اور ایک آج کا دن ہے مجھے ردا ڈائجسٹ سے وابستہ ہوئے ماشاء اللہ سے آٹھ ماہ کا عرصہ مکمل ہو گیا ہے۔ اس دوران مجھے یہاں سے جتنی محبت ملی وہ ناقابل بیان ہے۔ ریمانے نے مجھے ردا ڈائجسٹ کی جانب سے خلوص دل سے خوش آمدید کہا تھا۔ ریمانڈیٹر واقعی اس

اپنے بھتیجیوں، بھتیجیوں، بھتیجیوں کے نام میرے پیارے بھتیجیوں، بھتیجیوں کے نام یہ ہیں۔ ارحمہ، ملیحہ، فاطمہ نور، عبادہ، حذیفہ، حبان، حسین احمد، سان، خزمیم تم بہت معصوم اور نٹ کھٹ سے ہو۔ میرے دو بھانجے عثمان، عفتان بھی بہت کیوٹ ہیں۔ اللہ پاک سب کو صحت عطا کریں اور بڑے ہو کر ترقی کریں، آمین۔

سمیرا گل نازیوسف۔ کراچی

ہمسفر شوکت کے نام

میں تجھے دل سے پیار کرتا ہوں

تو مجھے زندگی سے پیارا ہے

چھوڑ دوں پکڑ کر ہاتھ تیرا

بھول کر بھی ایسی بھول نہ کروں

جس میں بکھرے نہ ہوں تیرے جلوے

ایسی جنت بھی میں قبول نہ کروں

تو آسمان محبت پر

میری تقدیر کا ستارا ہے

فرزانہ شوکت۔ کراچی

صالحہ آپلی اور نورین آپلی کے نام

پیاری صالحہ آپلی اور نورین آپلی کو میرا پیارا بھرا سلام قبول ہو اور میری دعا ہے کہ ردا سے جڑے ہر انسان کو اللہ اپنی زندگی میں ہمیشہ خوش باش رکھے اور ہمارا قلمی سفر یونہی قائم و دائم رہے۔ سب سے پہلے مارچ میں ”ابن آدم“ شائع کرنے کے لیے آپ دونوں کا بے حد شکریہ ادا کرنا چاہوں گی۔ آپلی میری روٹین بے حد ٹھنک ہے۔ بے حد مشکلوں سے لکھنے کے لیے ناظم نکالتی ہوں جب بھی لکھنے بیٹھتی ہوں ایشیل تنگ کرنا شروع کر دیتی ہے۔ کبھی پین پر ہاتھ مارتی ہے تو

راجماری ہے میری گڑیا
معصوم ساجس کا چہرہ ہے
چاندنی سی جس کی آنکھیں ہیں
ریشمی سی جس کی زلفیں ہیں
میٹھی سی جس کی بولی ہے
نرم پھولوں سی وہ مسکراہٹ
آنکھوں سے دل کو پہنچائے سکون
گر آنسو جو جھپٹتے میرے گڑیا کے
من کو بے چین سے کر جاتے
اس کی خوشی، ہنسی ہیں مجھے عزیز
وہ نازک موم سی میری گڑیا
سب سے پیاری ہے میری گڑیا
سب سے حسین ہے میری گڑیا
لاج دلاری ہے میری گڑیا
راجماری ہے میری گڑیا

شکیل وارثی۔ کراچی

حناناز کے نام

مائی ڈیئر حنا پی برتھ ڈے ٹو بوائینڈ مینی
پپی ریٹرن آف دا ڈے۔ سدا خوش رہو اور
پھولوں کی طرح مسکراتی رہو اور ہماری دوستی یونہی
قائم و دائم رہے، آمین۔ تمہیں حیرت ہو رہی ہوگی
ناں ردائیں میرا پیغام اپنے نام دیکھ کر تو دیکھ لو کیسا
سر پرانز دیا ناں۔ اب پورے کالج کو ردائیں کھول کر
دکھانا کہ تمہیں میں نے ردائیں دے دی ہیں۔ مانتی
ہو ناں۔ پھر میرے ذہن ترین دماغ کو (ہا ہا ہا)۔
قدر کرو میری کہ خدا نے اتنی ذہن دوست تمہیں
دی (ہا ہا ہا) چلو پھر اب کالج میں مل کر تمہاری برتھ
ڈے سیلیبریٹ کریں گے۔

ضبارشید۔ فیصل آباد



ادارے میں ایک ایسا سحر ہے جو ہمیں اس طرح
سے جکڑ لیتا ہے کہ جب تک ہم قلم نہ اٹھائیں دل
مضطرب سا رہتا ہے۔ ریما تمہاری آواز تو اتنی
خوب صورت ہے کہ اگر میں وضاحت کرنا
چاہوں تو میرے الفاظ کم پڑ جائیں گے۔ میری
بات مانو تو ایف ایم جو آن کر لو۔ یار تمہاری آواز
واقعی بہت سریلی ہے۔ اللہ تمہاری بیٹی کے نصیب
اچھے کرے۔ تمہاری زندگی کو خوشیوں سے بھر
دے۔ تمہاری اور میری دوستی ہمیشہ قائم و دائم رہے۔ تم
میری زیست کا حاصل ہو شاد و آباد رہو، (آمین)۔

سیدہ عروج قاطمہ۔ ملتان

صالحہ آپی، چھوٹے نوروز اور مومی پاپا کے نام

صالحہ آپی! 14 اگست کو آپ کی سالگرہ ہے۔

خدا آپ کو ایک صحت والی خوشگوار زندگی سے

نوازے، آمین۔ نوروز بیٹی! 2 اگست کو تمہاری

دوسری سالگرہ ہے۔ بہت بہت مبارک ہو۔

سوئیٹ ہارٹ اللہ کرے تم ہمیشہ ایسے ہی کھلکھلاتی

زندگی گزارو۔ ماما، پاپا 31 اگست کو آپ کی شادی

کی سالگرہ ہے۔ اللہ ہمیشہ آپ دونوں کا سایہ ہم

پر قائم رکھے، آمین۔ اور سب سے آخر میں

Happy birthday sehar! جی ہاں! 5

اگست کو میری سالگرہ ہے۔ اللہ کرے میں ہمیشہ

ایسی کیوٹ، سوئیٹ، انتہائی جنٹ اور..... (اف!)

اپنے لیے توفیق بھی یاد نہیں آ رہے ہا ہا ہا (رہوں۔

سحر بنیں۔ فیصل آباد

میری پیاری بیٹی اقصیٰ کے نام

سب سے پیاری ہے میری گڑیا

سب سے حسین ہے میری گڑیا

لاج دلاری ہے میری گڑیا



سیخ کباب

ضروری اجزاء

بیف ٹیمہ : ایک پاؤ

نمک : حسب ذائقہ

ہری مرچ پیسٹ : پانچ عدد

پیاز چوپ : ایک عدد

لہسن اور ک پیسٹ : ایک چائے کا چمچ

زہرہ پاؤڈر : ایک چائے کا چمچ

دھنیا کٹا : ایک چائے کا چمچ

ڈبل روٹی : سلاخیں پس لیں

تیل : تیلنے کے لیے

ترکیب: ٹیمہ کو چور میں پس لیں۔ اور نمک، ہری مرچ پیسٹ، پیاز چوکور، لہسن اور ک، زہرہ، ڈبل روٹی کو پس کر کے کس کر لیں اور تھوڑے تیل میں سیخ کباب کی شیب میں فرانی کریں۔ سلاد کے ساتھ سرو کریں۔

مسٹرڈ پیسٹ ملائی بوٹی تکہ

ضروری اجزاء

مرغی کا گوشت (بون لیس) : آدھا کلو

بوٹیاں بنائیں

لیموں کا رس : دو کھانے کے چمچے

لہسن پاؤڈر : پون چائے کا چمچ

نمک : حسب ذائقہ

دہی (چھنا ہوا) : آدھا کپ

کریم چیز : آدھا کپ

مسٹرڈ پیسٹ : ایک چائے کا چمچ

سفید مرچ پاؤڈر : ایک چائے کا چمچ

مکھن : ایک کھانے کا چمچ

اسٹیکس : حسب ضرورت

ترکیب: ایک پیالے میں گوشت کی بوٹیاں، لیموں کا رس، لہسن پاؤڈر، نمک، سفید مرچ پاؤڈر، دہی، کریم چیز اور مسٹرڈ پیسٹ شامل کر کے دو گھنٹے تک میرینیٹ ہونے کے لیے رکھ دیں۔ بوٹیوں کو اسٹیکس میں پرو لیں اس کے بعد مکھن گرم کر کے برش سے لگائیں۔ اوون پر دف ڈش میں اسٹیکس رکھ کر گرم اوون میں 180 سینٹی گریڈ پر دس منٹ تک پکائیں۔ تیار ہونے پر اسٹیکس کو پلیٹ میں سلاد اور چٹنی کے ساتھ سرو کریں۔

ادرک والی چانپیں

ضروری اجزاء

بکرے کی چانپیں : آدھا کلو

پسی ہوئی ادرک : دو کھانے کے چمچے

دہی (پھینٹی ہوئی) : ایک پیالی

لیموں : چار عدد

کٹی ہوئی کالی مرچ : ایک چائے کا چمچ

ثابت سفید زیرہ : ایک چائے کا چمچ

سوکھی گول لال مرچیں : چار عدد

نمک : حسب ذائقہ

تیل : تیلنے کے لیے

چیز نکلس

ضروری اجزاء
چیز (کس کی ہوئی) : ایک کپ
چکن (ابال کر پیش کیا ہوا) : ایک کپ
بریڈ کر مبر : ایک کپ
آلو (ابلا ہوا) : ایک عدد

انڈا (پھیٹ لیں) : دو عدد
کالی مرچ پاؤڈر : ایک چائے کا چمچ
چاٹ مصالحہ : ایک چائے کا چمچ
نمک : حسب ذائقہ
آئل : فراننگ کے لیے
ترکیب: چیز، آلو اور چکن میس کر لیں۔ اس میں
کالی مرچ پاؤڈر، چاٹ مصالحہ اور نمک کس کر لیں۔
اب اس کے تین چار انچ کے نکلس بنا کر آدھے گھنٹے
کے لیے رکھ دیں۔ پھر انڈے میں ڈپ کر کے بریڈ
کر مبر میں رول کر لیں۔ گرم گرم آئل میں ڈیپ فرائی
کرتے جائیں۔ مزیدار نکلس تیار ہیں۔

ہوئی گوشت

اجزاء
گائے کا گوشت : ڈیڑھ کلو (آدھے انچ کے
چوکور ٹکڑے کر لیں)
سرکہ : ڈیڑھ کپ
لہسن اور ک پیسٹ : ایک چائے کا چمچ
انڈے : ایک عدد
تیل : دو کھانے کے چمچ
پیاز : ایک عدد
نمٹا : تین عدد
ہری مرچیں : چھ سات عدد
سرخ مرچ : حسب ذائقہ
ترکیب: پیاز کاٹ کر سرکہ میں بھگو کر نکال لیں۔
انڈے ہاف ہوائ کر کے پھیل لیں اور ان کے گول

ہرا دھنیا : سجانے کے لیے
ترکیب: دیہی میں چائیں، دہی، اورک اور
نمک ملا کر پانی خشک ہونے تک پکائیں۔ فراننگ
پین میں تیل گرم کر لیں اور چائیں تل کر نکال لیں۔
چائیں کو دوبارہ دیہی میں ڈالیں اور باقی تمام اجزا
ڈال کر دم پر رکھ دیں۔ مزیدار چائیں ہرا دھنیا
چھڑک کر پیش کریں۔

مکھنی چکن کو فٹے

ضروری اجزاء
بٹر چکن سوس : آدھا کپ
چکن قیمہ : ایک کلو
انڈا (پھیٹ لیں) : ایک عدد
پیاز (گرانڈ کر لیں) : دو عدد
لہسن پیسٹ : ایک کھانے کا چمچ
اورک پیسٹ : ایک کھانے کا چمچ
پنیٹ آئل : ایک کھانے کا چمچ
چاول کا آٹا : دو کھانے کے چمچ
بادام (پیس لیں) : تین کھانے کے چمچ
زیرہ پاؤڈر : آدھا چائے کا چمچ
نمک : حسب ذائقہ
سرخ مرچ پاؤڈر : حسب ذائقہ
کٹی کالی مرچ : حسب ذائقہ
آئل : فراننگ کے لیے
سرورنگ کے لیے :

من پسند سلاڈ : حسب ضرورت
ترکیب: چکن میں دو کھانے کے چمچ بٹر چکن
سوس اور باقی تمام اجزا کس کر کے ایک گھنٹے کے
لیے رکھ دیں۔ اب اس کی بائر بنا لیں۔ پین میں
آئل گرم کر کے بائر فرائی کریں۔ سرورنگ باؤل میں
سلاڈ ڈال کر میٹ بائر رکھیں۔ بقیہ بٹر چکن سوس ڈال
کر سرورک کریں۔

ڈالیں۔ دو تین گلاس تیار کر لیں۔ چاکلیٹ چھڑک فریش سرو کریں۔

کھجور کا مشروب

اجزاء :
دودھ : آدھا کلو
کھجور : ایک پاؤ
چینی : سو گرام
سبز الائچی : تین عدد
برف کا چورا : ضرورت کے مطابق

ترکیب: دودھ میں تھوڑا پانی ڈال کر ایک اُبال دے کر اتار لیں پھر کھجور کی گھٹلیاں نکال کر تھوڑے سے دودھ میں نرم ہونے کے لیے بھگو دیں پھر بھیگے ہوئے کھجوروں کو کچر میں ڈال کر خوب باریک پس لیں اب اس مرکب کو اور چینی دودھ کو کچر میں ڈال کر دوبارہ سے باریک کر لیں پھر اس کو برابر برابر گلاس میں ڈال لیں اور اوپر سے برف کا چورا اور سبز الائچی پاؤ ڈر ڈال کر پیش کریں۔

دودھ سویاں

اجزاء :
سویا : ایک کلو کا پیکٹ
دودھ : دو کلو
چینی : حسب ذائقہ
گھی : آدھا پاؤ
سبز الائچی کے دانے : چائے کا ایک چمچ
بادام : دس بارہ عدد
کھویا : ایک پاؤ

ترکیب: دودھ کو ابالیں، کھویا بھون لیں، چینی کا قوام تیار کر لیں۔ گھی میں الائچی ڈال کر کڑکرائیں اور اس میں سویاں ڈال کر سرخ کر لیں، پھر اس میں چینی کا قوام ڈالیں، ساتھ ساتھ دودھ اور کھویا بھی ڈال دیں۔ دودھ خشک ہو جائے تو بادام کاٹ کر ڈال دیں۔ گرم گرم نوش فرمائیں۔☆☆

مکڑے کاٹ لیں۔ گوشت دھو کر سر کے میں بھگو دیں اور اس میں پسلی ہوئی سرخ مرچ، نمک، لہسن اور ادراک بھی ملا لیں اور دو گھنٹے کے لیے چھوڑ دیں۔ اب فریج میں تیل ڈال کر گرم کر دیں اور گوشت کے مکڑے سر کے سے نکال کر تیل میں تھکیں۔ اگر یہ گلے نہ ہوں تو پانی ڈال کر گلا لیں پھر فرانی کریں۔ جب یہ سنہری ہو جائیں تو انہیں ایک پلیٹ میں نکال لیں اب بوٹیوں کے چاروں طرف ابلے ہوئے انڈوں کے قتلے سجائیں پھر مٹاثر اور پیاز کے کچھے اور آخر میں ہری مرچ۔ اس مزے دار بوٹی گوشت کو رائے اور کچپ کے ساتھ نوش فرمائیں۔ مہمانوں کی تواضع کے لیے بھی یہ ایک اچھی اور ذائقہ دار ڈش ہے۔

کیر میل ملک شیک

ضروری اجزاء :
کنڈینسڈ ملک : دو کھانے کے چمچ
براؤن شوگر : آدھا کپ
مکھن : چار کھانے کے چمچ
لیے : دودھ

وائٹ چاکلیٹ (پکھلی) : آدھا کپ
ہوئی)

دودھ : تین کپ
وینلا آئس کریم : تین اسکوپ

کیریم (بھینٹی ہوئی) : آدھا کپ
چاکلیٹ (کس کی ہوئی) : ایک کھانے کا چمچ

ترکیب: کنڈینسڈ ملک، براؤن شوگر اور مکھن کو بین میں سٹرفرائی کریں۔ سوس بننے تک پکائیں۔ کیلے، دودھ، وائٹ چاکلیٹ اور دو کھانے کے چمچ کیریمیل سوس کو پلینڈ کر لیں۔ سرنگ گلاسز میں ایک ایک کھانے کا چمچ کیریمیل سوس ڈال کر ہلائیں اور سائڈز پر بھی لگنے دیں۔ اب ان میں تیار ملک شیک ڈالیں۔ اوپر آئس کریم اسکوپ اور پھر کیریم کا ایک چمچ

سنگھار

سکری خشکی

سکری اور خشکی کا مسئلہ عموماً سردیوں میں ہوتا ہے لیکن کچھ لوگ گرمیوں میں بھی اس مسئلے کا شکار رہتے ہیں۔ اس کی وجہ لاپرواہی اور غلط پراڈکٹ کا استعمال ہے۔ اس کے حل کے لیے ہم خوراک پر دھیان دیں کیونکہ دودھ، دہی اور مکھن کا استعمال سکری خشکی میں کمی کرتا ہے اس کے علاوہ ناریل کا تیل آدھا پاؤ، روغن بادام ایک چھٹانک، لونگ کا تیل ایک چھٹانک (یہ سب تیل خالص ہونے چاہئیں) کو مس کر لیں اور ہر واشنگ سے پہلے نیم گرم کر کے بالوں کی جڑوں میں رات بھر لگا رہنے دیں۔ صبح اٹھ کر نہالیں۔ دوسے تین ہفتوں میں آپ کی سکری اور خشکی ختم ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ انڈے، دہی والا فارمولا بھی ہفتے میں ایک بار ضرور استعمال کریں۔ مزید بہتری ہوگی۔

بالوں کا گرنا

بالوں کا یہ مسئلہ تقریباً ہر گھر میں موجود ہے۔ لڑکے لڑکیاں سب اس مسئلے کا شکار ہیں۔ آپ جتنی اچھی اور متوازن غذائیں گے اس کے اتنے اچھے اثرات مرتب ہوں گے اور نہ صرف آپ کے بال بلکہ جلد بھی اچھی ہوگی اور روزمرہ زندگی کے تمام کام اچھے طریقے سے ہو پائیں گے۔ نو جوان لڑکے لڑکیوں کو فزیشن کے مشورے سے کوئی ملٹی وٹامن ضرور لینا چاہیے۔ کیمیشم کی کمی سے بھی پال گرتے ہیں اس لیے ایسی خوراک لیں جس میں کیمیشم موجود ہو۔ مہینے میں

دلکش اور اسٹائلش بال

اگر ہم اپنے بالوں کی ساخت اور ان کے مسائل کو جان لیں تو مسائل کا حل بہت آسان ہو جاتا ہے اور بال دلکش ریشمی اور چمکدار نظر آتے ہیں اس کے لیے کچھ گھریلو نسخے حاضر خدمت ہیں۔

خشک بال

جب بال خشک ہوتے ہیں تو ان میں نمی کا تناسب کم ہو جاتا ہے اس نمی کو بحال کرنے کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے آپ اپنی خوراک پر توجہ دیں۔ پانی کا زیادہ سے زیادہ استعمال کریں۔ دن میں ایک بار جوس، تازہ پھلوں کا رس ضرور لیں اور ناشتے میں مکھن گھی یا پنیر کا استعمال کریں تاکہ بالوں اور جلد کی نمی بحال ہو اور آپ خوب صورت نظر آئیں۔ روغن بادام سے بالوں کا مساج کریں مگر ہلکے ہاتھ سے۔ پھر اپنے بالوں کے حساب سے شیپو کنڈیشنر کا استعمال کریں۔ ہفتے میں ایک بار تیل لگے بالوں میں انڈے کی سفیدی، ایک کھانے کا چمچ دہی اور ایک اسپون تیل چند قطرے لیموں کے ساتھ ملا کر اچھی طرح ملا لیں اور پندرہ منٹ کے لیے لگا لیں۔ پھر بالوں کے حساب سے شیپو اور کنڈیشنر کریں۔ آپ بالوں میں ایک نئی زندگی محسوس کریں گی۔

ایک بار بال ترشوائیں چاہے ملکی سی ٹرمنگ ہی کیوں نہ ہو۔ وہی میں کیلا پس کر ڈالیں اور جفتے میں ایک بار اپنے بالوں میں لگائیں اس سے بالوں میں چمک آئے گی اور بال گرنا کم ہو جائیں گے۔

چکنے بال

بالوں میں چکنائی کی کئی وجوہات ہیں سب سے پہلے اپنا شیپو کنڈیشنر چمک کریں کہ وہ آٹلی بالوں کے لیے ہے یا نہیں، آٹلی بالوں میں کنڈیشنر استعمال نہ کریں۔ بال دھونے کے بعد کسی برتن میں پانی لے کر اسے میں آدھا لیٹھوں ڈال دیں۔ اور وہ پانی بالوں میں بہالیں۔ اس سے اس کا ایکسٹرا تیل نکل جائے گا۔

حساس بال

ایسے بال ہمیشہ زیادہ احتیاط مانگتے ہیں۔ ایسے بالوں کے لیے ہمیشہ میڈیکیشنل شیپو استعمال کریں۔ تویسے کا استعمال کر دیں۔ بال واش کرنے کے بعد تھوڑے سے پانی میں پسا ہوا پودینہ ڈال کر رکھیں اور اسے چھان کر بالوں پر بہالیں۔ یہ آپ کے سر کی جلد کو سکون مہیا کرے گا۔ گھنے سیاہ لمبے بال پانے کے لیے سیکا کافی اور آملہ برابر مقدار میں لے لیں اور اسے موٹا موٹ کوٹ لیں۔ رات کو پانی میں بھگو دیں اور جب پال دھونے ہوں تو اسے ابال لیں۔ بال دھونے کے بعد اس کا پانی اوپر سے بہالیں۔ یہ گھنے بالوں کے لیے بہت مفید ہے۔

آسان ٹوٹنے آزماتے

☆ بالوں کو چمکدار بنانے کے لیے لیموں کا رس نکال کر اس کی ماش کر کے تھوڑی دیر کے بعد دھولیں۔ اس کے علاوہ شیپو کرنے سے ایک یا دو گھنٹے پہلے سر پر تیل کی اچھی طرح ماش کرنے

سے بھی بالوں کی چمک بڑھ جاتی ہے۔
☆ ناخنوں کو مضبوط بنانے کے لیے ایک گہری پیالی یا پلیٹ میں زیتون کا تیل ڈال کر اس میں ناخنوں کو ڈبو دیں اس کے بعد نیم گرم تیل میں ڈال کر ناخنوں کو ٹشو پیپر سے صاف کر لیں کچھ دنوں کے بعد ناخن مضبوط ہو جائیں گے۔

☆ روزانہ دو سے تین چمچے شہد ملا کر پینے سے چہرے کی خوب صورتی میں اضافہ ہوتا ہے۔
☆ پودینے کی پتیاں ابال کر انہیں ٹھنڈا کر کے رکھ لیں۔ نہار منہ پودینے کا ایک کپ پانی پینے سے بھی رنگ صاف ہوتا ہے۔

☆ ہونٹوں پر خشکی کی وجہ سے جڑی آتی ہے۔ آپ رات کو باقاعدگی سے گلیسرین لگائیں۔ گائے کا کچا دودھ ہونٹوں پر لگانا بہت مفید ہے۔ بالائی لگانے سے بھی ہونٹوں کی خشکی دور ہو جاتی ہے۔

☆ ایک کھانے کا چمچ لین جوس، ایک کھانے کا چمچ چینی اور ایک کھانے کا چمچ پانی لے کر باہم ملائیں اور ہاتھوں پر مل لیں۔ اس وقت تک اس کا مساج کرتی رہیں جب تک کہ ہاتھ خشک نہ ہو جائیں۔ کھر درے ہاتھوں کو نرم کرنے کے لیے یہ بہترین نسخہ ہے۔

☆ دو آلے کر چھیلیں اور کچل لیں پھر دبا کر ان کا عرق نکال لیں۔ اس عرق کو ہاتھوں پر اچھی طرح ملیں۔ اس سے انگلیوں کے کالے پڑ جانے والے جوڑ صاف ہو جائیں گے۔ مسلسل استعمال سے ہاتھوں پر رہ جانے والے زخموں اور جلنے کے نشانات بھی بالکل صاف ہو جاتے ہیں۔

☆.....